منفرد خصوصیات کی حامل ایک بے مثال کتاب کا پہلی بار اردو ترجمہ اور تحقیق

فقہ حنفی
پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب

فقہ حنفی

قرآن و سنّت کی روشنی میں

(جلد سوم)

ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق

لجنة المصنفین

جناب مولانا خالد محمود صاحب

جناب مفتی عبدالعظیم ترمذی صاحب

جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارۂ اسلامیات
لاہور۔ کراچی
پاکستان

فہرست

عنوانات	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿کتاب ادب القاضی﴾

لوگوں کے ساتھ معاملات ومعاشرت میں اچھی عادات اپنانے اور بہتر اخلاق سے پیش آنے کو لغت میں ''ادب'' کہا جاتا ہے۔

عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنے، مظلوم کی مدد کرنے، حدود شرع کی محافظت اور سنت کی اتباع، قضاء کے آداب میں سے ہیں۔

قضاء کا لفظ لغت میں متعدد معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

کسی پر کوئی چیز لازم کرنا: ارشاد ربانی ہے''وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ'' [الاسراء:۲۳] ''اور حکم کیا پروردگار نے یہ کہ نہ عبادت کرو مگر اس کی یعنی اللہ کی۔''

خبر دینا: جیسے فرمان الٰہی ہے''وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'' [الاسراء:۴] ''اور حکم کیا ہم نے بنی اسرائیل کی طرف۔''

کسی کام سے فارغ ہونا: جیسا کہ اس آیت میں یہ معنی استعمال ہو رہے ہیں''فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ'' ''پس جب عام کی جائے نماز۔''

مقرر کرنا: جیسے کہا جاتا ہے''قضی الحاکم النفقة'' (حاکم نے نفقہ مقرر کیا)۔

ادا کرنا: جیسے اہل عرب کہتے ہیں:''فلان قضی دینه'' (اس نے اپنا قرض ادا کیا)۔ قضاء کا شرعی معنی ہے''قول ملزم عن ولایة عامة'' (حکومت کی طرف سے لازم کردہ حکم)۔ یہ تعریف قضاء کے پانچوں لغوی معانی کو مشتمل ہے۔

حق کے مطابق فیصلہ کرنا بہت بڑا فریضہ اور عظیم عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو قضاء کا حکم دیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کا نام ہی الخلیفہ رکھا۔ اور حضور اقدس ﷺ کو حکم فرمایا:''وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ'' [المائدہ:۴۹] ''ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں۔'' اور حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا:''فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ'' [ص:۲۶] ''لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیجئے۔''

قضاء کے عظیم عبادت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا ہوتا ہے۔ حق کا اظہار ہوتا ہے اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے۔ حق کو حق دار تک پہنچایا جاتا ہے۔ انہی امور کی انجام دہی کیلئے اللہ تعالیٰ نے شریعت کے احکام نازل فرمائے۔ انبیاء کرام مبعوث فرمائے۔ قضاء کا عہدہ بہت ہی دشوار اور مشکل ترین ہے کم ہی لوگ اسے صحیح طرح سے نبھا سکتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من ولی القضاء ذبح بغیر سکین"[1] "جس کو عہدہ قضاء پر مامور کیا گیا اس کو چھری کے بغیر ذبح کیا گیا۔"

قضاء کا حکم:

(۱) بعض اوقات عہدہ قضاء کی اہلیت رکھنے والے شخص پر عہدہ قضاء کو قبول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو قبول نہیں کرے گا تو گناہ گار ہو جائے گا۔ یہ اس وقت ہے جب اس کے علاوہ اس منصب کیلئے کوئی اور موزوں شخص موجود نہ ہو سب نااہل ہوں اور اس منصب کے قبول نہ کرنے سے احکام کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔

(۲) قضاء کی اہلیت کے حامل اور لوگ بھی موجود ہوں تو اسے قبول کرنا فرض تو نہیں ہوگا البتہ فرض علی الکفایہ ہوگا۔ اگر دوسرے لوگ بھی قاضی بننے کی اہلیت رکھنے والے موجود ہوں تو جس نے اس فریضہ کو نبھایا وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور دوسرے لوگ گناہ گار ہونے سے بچ جائیں گے۔ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے اس کو قبول نہ کیا تو وہ سب گناہ گار ہوں گے۔ لیکن اگر ان لوگوں کی ایک جماعت موجود ہو اور فیصلے امیر خود نمٹاتا ہو تو وہ گناہ گار نہیں ہوں گے۔ اور اگر امیر وقت ایسا نہ کر سکتا ہو تو قضاء کے عہدے کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے اس کی اہلیت رکھنے والے تمام لوگ گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح اگر ان کے انکار کی وجہ سے یہ کام جاہل کو سونپا گیا تب بھی وہ گناہ گار ہوں گے۔

(۳) عہدہ قضاء کو قبول کرنا کبھی مستحب بھی ہوتا ہے جبکہ قضاء کی اہلیت کے حامل دوسرے لوگ بھی موجود ہوں۔ لیکن ایک شخص کی اہلیت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہو تو اس شخص کیلئے اس عہدے پر فائز ہونا بہتر ہے۔

(۴) کبھی اس عہدہ کو قبول کرنا مکروہ بھی ہوتا ہے۔ یہ اس شخص کیلئے مکروہ ہے جو قضاء کی اہلیت تو

---

[1] (سنن دار قطنی ۴ ص ۲۰۶)

رکھتا ہو مگر اس شخص سے زیادہ بہتر جاننے والے لوگ (اس عہدہ کیلئے) موجود ہوں جو اس سے زیادہ بہتر طریقے سے قضاء کے امور انجام دے سکتے ہوں تو کراہت نہیں رہتی۔ صلحاء کی ایک جماعت نے عہدہ قضاء کو قبول بھی کیا ہے اور بہت سارے نیک لوگوں کا اس سے اجتناب بھی ثابت ہے۔ البتہ اس سے خود کو بچانا ہی دینی و دنیاوی لحاظ سے باعث سلامتی ہے۔ اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ خطرات سے محفوظ رہنا انتہائی دشوار عمل ہے۔

(۵) بعض دفعہ عہدہ قضاء کو قبول کرنا حرام بھی ہو جاتا ہے جب اس عہدے پر فائز ہونے والے کو معلوم ہو کہ وہ اس کا اہل نہیں ہے اور وہ انصاف سے کام نہیں لے سکتا اور اپنے باطن کی حالت سے باخبر ہو کہ وہ خواہش نفس کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تو اس کیلئے قضاء کے عہدے پر کام کرنا جائز نہیں ہوگا اور ایسے شخص کو قاضی بنانا بھی جائز نہیں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ومن استعمل رجلا من عصابة وفي تلک العصابة من هو ارضى لله منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المومنين'' [1] ''جو شخص کسی جماعت (یا قوم) میں کسی شخص کو سرکاری عہدے کیلئے منتخب کرے اور اس جماعت میں اس منتخب کردہ شخص سے زیادہ بہتر شخص موجود تھا (اسکو منتخب نہیں کیا) تو اس نے اللہ اس کے رسول اور مومنین کے ساتھ خیانت کی۔''

یزید بن ابی سفیان سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے شام کی طرف بھیجا اور مجھ سے فرمایا: یزید! وہاں تمہاری رشتہ داری ہے ممکن ہے سرکاری عہدے دینے میں تم قرابت داروں کو ترجیح دو۔ مجھے اس کا زیادہ اندیشہ ہے کہ تم ایسا کرو گے مگر سن لو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''من ولي من امر المسلمين شيئا فامر عليهم احدا محاباة فعليه لعنة الله' لا يقبل الله منه صرفا ولا عدلا حتى يدخله جهنم'' [2] ''جس شخص کو مسلمانوں کے امور میں سے کوئی امر سونپا گیا ہو اور وہ کسی سے محبت کی بناء پر اس کو کسی حکومتی عہدہ حوالہ کر دے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔ اس کی فرض عبادت قبول ہوگی نہ نفلی۔''

یہ حدیث ضعیف ہے اس کی سند میں ایک راوی بکر بن خنیس ہے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو متروک کہا ہے۔ البتہ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں کبھی فرماتے ہیں لیس بشئی اور کبھی

---

[1] [المستدرک ج۴ص۹۲] [2] [المستدرک ج۴ ص۹۳]

ضعیف کے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں اور بعض جگہ کہتے ہیں وہ صالح تو ہے مگر قوی نہیں ہے۔

طلب عہدہ پر وعید:

حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "یا عبدالرحمن بن سمرہ! لاتسال الامارۃ فانک ان اعطیتھا عن مسئلۃ وکلت الیھا وان اعطیتھا من غیر مسئلۃ اعنت علیھا"[1] "اے عبدالرحمن بن سمرہ! تم طلب امارت مت کرو کیونکہ اگر وہ تیرے طلب کی وجہ سے تجھے مل گئی تو تیری کوئی مدد نہیں ہوگی، اگر طلب کے بغیر تجھے مل گئی تو (اللہ تعالیٰ) کی مدد تیرے ساتھ شامل حال ہوگی۔"

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں اپنے دو چچازاد بھائیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان میں سے ایک نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی حکومتی عہدہ دے دیجئے، دوسرے نے بھی اس طرح کی درخواست کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "انا واللہ لانولی علی ھذا العمل احدا سالہ ولا احدا حرص علیہ"[2] "واللہ ہم مانگ کر عہدہ حاصل کرنے والے کو کوئی کام سپرد نہیں کرتے اور نہ ہی عہدے کے خواہشمند کو کوئی عہدہ دیتے ہیں۔"

حضرت بریدہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔ "القضاۃ ثلاثۃ واحد فی الجنۃ واثنان فی النار فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضی بہ ورجل عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار" "قاضیوں کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم جنتی اور دو جہنمی ہیں پس جو حق کو جان کر اس کے مطابق فیصلہ دے وہ جنتی ہے اور جو حق کو سمجھ کر اور جان کر اس کے خلاف فیصلہ دے وہ جہنمی ہے اور جو بلاتحقیق فیصلہ جاری کرے وہ بھی دوزخی ہے۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ﷺ مجھے کسی علاقے کا عامل (افسر) نہیں بنا ئیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر ارشاد فرمایا: "یا اباذر انک ضعیف وانھا امانۃ وانھا یوم القیامۃ خزی وندامۃ الامن اخذھا بحقھا وادی الذی علیہ فیھا"[3] "اے ابوذر! تم کمزور ہو، عہدہ بڑی امانت ہے اور روز قیامت یہ باعث ندامت وشرمندگی ہوگا۔ الا یہ کہ کوئی

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۱۲۴۳ [2] سنن ابی داؤد ج ۳ ص ۲۹۹ [3] مسلم ج ۲ ص ۱۴۵۸

اس کے حقوق ادا کرے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:"من طلب قضاء المسلمين حتى ينالها ثم غلب عدله جوره فله الجنة' ومن غلب جوره عدله فله النار" [۱] "جس نے مسلمانوں کے امور نمٹانے کیلئے عہدہ قضا طلب کر کے اسے حاصل کر لیا اور اس کا عدل اس کے ظلم پر غالب رہا تو اس کیلئے جنت ہے۔ اور جس کا ظلم عدل پر غالب رہا اس کیلئے جہنم ہے"۔

اور اگر اس عہدے کو صحیح طور پر نبھانے کی بھرپور صلاحیت اپنے اندر پاتا ہو اور اپنے نفس پر قابو پانے کی قدرت موجود ہو تو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قضاء کے عہدے پر فائز فرمایا تھا۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو اپنے لیے بار سمجھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف مبعوث فرمایا تو میں نے عرض کیا! میں نو عمر ہوں آپ مجھے بڑی عمر والوں کی طرف مبعوث فرما رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اذا جلس اليك الخصمان فلا تقض لاحدهما حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الاول" [۲] "جب تیری عدالت میں دو مدمقابل بیٹھ جائیں تو ایک کی بات سن کر فیصلہ نہ دینا یہاں تک دوسرے سے بھی سنو جس طرح پہلے کی گفتگو سنی"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اس پر عمل پیرا رہا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران' واذا حكم فاجتهد فاخطأفله اجر" [۳] "اگر فیصلہ کرنے والے نے خود تحقیق اور مشقت برداشت کر کے درست فیصلہ دیا تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہے۔ اور اگر کوشش اور تحقیق کے باوجود صحیح فیصلہ نہیں دے سکا تب بھی اس کو ایک اجر ملے گا"۔

حجاج بن یوسف نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بصرہ کے قاضی بننے کا مطالبہ کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔"من طلب القضاء واستعان عليه وكل اليه' ومن لم يطلبه ولم يستعن عليه وكل به ملك يسدده" [۴] "جو شخص عہدہ قضاء کو طلب کرتا ہے اور اس کیلئے تعاون چاہتا ہے تو اسے اس کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور جو عہدہ کو طلب نہیں کرتا اور اس پر تعاون نہیں لیتا تو اس کیلئے ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو

---

[۱] ابوداود: ۲؍ص ۴۹۹ [۲] المستدرک ۴؍ص ۹۳

[۳] نصب الرایہ ۴؍ص ۶۹ [۴] المستدرک ۴؍ص ۹۲

اُسے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

ظالم حکمران کی طرف سے عہدہ قضاء قبول کرنے کا حکم:

جابر حکمران کے عہد حکومت میں عہدہ قضاء پر کام کرنا جائز ہے کیونکہ حضرات تابعین حجاج بن یوسف کے عہد حکومت میں اس کے ظلم وجور کے باوجود عہدہ قضاء کو قبول کر کے عدالتی فرائض منصبی انجام دیتے رہے ہیں۔ کیونکہ اس میں اقامت حق ہے۔ ظالم کے ظلم کو دفع کرنا ہے۔ ہاں اگر حق کے قائم کرنے اور ظالم کے ظلم کو روکنے کی قدرت نہ ہو تو پھر ان کے عہدہ قضاء کو قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

قضاء کے منصب کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی رونق بخشی ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ مرتے دم تک شام کے قاضی رہے ہیں۔ وفات کے وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہی کی رائے کے مطابق حضرت فضالہ بن عبید انصاری کو شام کا قاضی بنایا تھا۔ اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے عہدہ قضاء پر بعض حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کام کیا ہے حالانکہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق پر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر سے فرمایا تھا ''تقتلک الفئة الباغية'' ''باغی گروہ کے ہاتھوں تم قتل کیے جاؤ گے''۔

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمار حضرت علی کے ساتھ تھے اور ان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور حکومت میں حق پر تھے ان کے ساتھ لڑنے والے اپنے عمل کے لحاظ سے ان سے بغاوت کر رہے تھے اور اپنے ارادے و نیت کے اعتبار سے وہ معذور تھے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ ماخوذ نہیں ہوں گے کیونکہ یہ ان کی اجتہادی خطاء تھی۔ اہل اسلام کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ اہل جمل (حضرت طلحہ، زبیر، حضرت عائشہ وغیرہم) کے ساتھ قتال میں بھی حضرت علی حق پر تھے اور صفین والوں (حضرت امیر معاویہ اور ان کی فوج) کے ساتھ لڑنے میں بھی آپ ہی حق پر تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں ندامت کا اظہار بھی کیا تھا۔ ابن عبدالبر نے ''کتاب الاستیعاب'' میں نقل کیا ہے، عبداللہ بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا: تم نے مجھے کیوں نہیں روکا؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ ایک شخص کی رائے آپ پر غالب آگئی تھی (یعنی ابن الزبیر) فرمانے لگی: واللہ! اگر تم مجھے منع کرتے تو میں نہ نکلتی۔

حجاج بن یوسف کے حکم سے قاضی بننے والے حضرات تابعین میں سے حضرت ابو بردہ بن ابو موسیٰ الاشعری بھی ہیں جو کوفہ کے قاضی تھے اور حضرت عبداللہ بن ابی مریم بھی ہیں جو اصبھان کے قاضی تھے اور یزید بن معاویہ کی طرف سے مدینہ کے عہدہ قضاء پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ (عبدالرحمٰن بن عوف کے بھتیجے) فائز رہے ہیں۔[1]

کیا عورت قاضی بن سکتی ہے؟

عورت کیلئے قاضی بننا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے کیوں کہ اس میں مردوں کے ساتھ بات چیت ہوگی جبکہ عورت کیلئے پردہ میں رہنا بہتر ہے۔ ہاں اگر صرف عورتوں کے جھگڑے نمٹائے تو مکروہ نہیں ہوگا۔ عورت کیلئے جب گواہی دینا جائز ہے تو قاضی بننا بھی جائز ہوگا۔ ہاں! مگر یہ کہ حدود وقصاص کے معاملات میں اس کے فیصلے معتبر نہیں ہوں گے۔ احناف کے علاوہ دوسرے آئمہ کے نزدیک عورت کا قاضی بننا بالکل جائز نہیں ہے۔ وہ (آئمہ) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔ ایک بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نفع سے نوازا۔ قریب تھا کہ میں جنگ جمل میں جمل والوں کا ساتھ دے کر لڑتا لیکن اس کلام کی برکت سے بچ گیا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنایا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لن یفلح قوم ولوا امر ھم امراۃ**''[2] ''وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے امارت کسی عورت کے حوالے کر دی''۔

حدود وقصاص میں عورت کی شہادت کو قبول نہ کرنا حدیث زہری سے ثابت ہے وہ فرماتے ہیں۔ دور نبوت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ سنت جاری تھی کہ حدود وقصاص میں عورت کی گواہی قبول نہیں کی جاتی تھی۔

قاضی کی تنخواہ کا حکم:

قاضی کی تمام ضروریات اس کے اپنے اخراجات گھر والوں اور مددگاروں کے خرچ بیت المال میں سے دیئے جائیں گے۔ اس لیے کہ اس نے لوگوں کی ضروریات کیلئے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ اگر اس کی تمام ضروریات کی کفایت نہیں کی جائے گی تو لوگوں کے مال پر اس کی نظر جائے گی اور دل میں لالچ پیدا ہوگا جس کی وجہ سے فیصلے میں خلل پیدا ہونے کا خدشہ ہوگا۔ اس لیے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ امام وقت کیلئے مستحب ہے کہ وہ صاحب ثروت شخص کو قاضی بنائے تاکہ اس

---

[1] (نصب الرایہ: ج۴ ص ۶۹) [2] (سنن بیہقی: ج۱۰ ص ۱۱۷)

کے دل میں لوگوں کے مال کا لالچ نہ ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفہ بنایا گیا تو وہ حصول معاش کیلئے بازار کی طرف نکل گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو واپس لائے پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کر کے یومیہ دو درہم ان کیلئے مقرر کیے۔ ان کے پاس ایک جبہ تھا جس کو انہوں نے اپنی تنخواہ سے خریدا تھا جب وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا: اس جبے کو عمر کے حوالے کر دینا کہ وہ اس کو بیت المال میں جمع کرا دے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ قاضی کیلئے اپنی ضروریات سے زیادہ وصول کرنا بہتر نہیں ہے۔ حضرت قاضی شریح تنخواہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: وصی اپنے کام کے بقدر رکھ سکتا ہے' حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اپنی ضرورت کے بقدر بیت المال سے وصول کرتے تھے۔ قاضی اپنی تنخواہ کو اپنی ضرورت میں خرچ کرے' ضرورت نہ ہو تو صدقہ کر سکتا ہے کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مال عطاء فرماتے تو میں عرض کرتا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے زیادہ کسی محتاج کو دے دیجئے! حتیٰ کہ ایک مرتبہ مجھے مال عطاء فرمایا میں نے عرض کیا اس شخص کو عطاء کیجئے جو مجھ سے زیادہ نادار ہو' فرمایا: ''خذہ فتمولہ فتصدق بہ فما جاءک من ھذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہ والا فلا تتبعہ نفسک''[1]

''لے لو! اس کو اور صاحب مال بنو اور صدقہ کرو' اس قسم کا مال مانگے بغیر اور دل میں اس کی تمنا کیے بغیر ہاتھ آ جائے تو اس کو حاصل کیا کرو! ورنہ نفس کی تابعداری مت کیا کرو''۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: قاضی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک عہدہ قضاء پر برقرار نہ رکھا جائے۔ اس لیے کہ اگر وہ قضاء کے امور میں مسلسل مصروف رہے گا تو علم کو بھول جائے گا۔ اس لیے حاکم وقت کو چاہیے کہ ایک سال کے بعد اس کو معزول کر کے کسی دوسرے کو مقرر کر دے تاکہ وہ فارغ ہو کر علم میں مشغول ہو جائے۔

قاضی کی صفات:

بہتر یہ ہے کہ قاضی میں اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو۔ اس لیے کہ جب کوئی واقعہ پیش آئے گا تو پہلے اس کا حل قرآن میں تلاش کیا جائے گا۔ اس میں نہ ملے تو حدیث میں۔ اس میں نہ ملے تو اجماع میں اس کا حل تلاش کرے گا۔ اس سے بھی حل نہ ہو تو اپنی رائے اور اجتہاد کو کام میں لائے گا۔ اس کی دلیل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا گورنر مقرر کیا تو فرمایا: ''کیف تقضی اذا عرض لک قضاء'' ''اگر تمہیں فیصلہ کرنا پڑا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟'' عرض کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا' فرمایا: ''فان لم تجد

[1] [صحیح بخاری: ۱۵۴/۲]

فی کتاب اللہ" "اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟" عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا' فرمایا: "ان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ ولا فی کتاب اللہ؟" "کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس کا حل اگر تجھے نہ ملے تو؟" عرض کیا! میں اجتہاد کر کے اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کروں گا اور اس میں خوب غور وخوض کروں گا۔ سستی سے کام نہیں لوں گا۔ حضور ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ لگا کر فرمایا: "الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضی به رسول الله"۔! "تمام تعریفیں اس ذات کیلئے ہیں جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو اللہ کے رسول کی رضامندی کے مطابق فیصلے کرنے کی توفیق بخشی"۔ حضور ﷺ نے اجماع کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اجماع کا تصور نہیں ہو سکتا۔ قاضی کا مجتہد ہونا ترجیحی شرط ہے یعنی اجتہاد کی صفت کی حامل شخصیت کی موجودگی میں وہی قضاء کے عہدہ کیلئے موزوں ہے۔ قاضی اگر اہل اجتہاد میں سے نہ ہو تو کم از کم اسے اہل شہادت میں سے ہونا چاہیے یعنی وہ ایسی شخصیت ہو جس کی شہادت قبول کی جا سکے۔ دینی اعتبار سے قابل اعتماد ہوا مانتدار ہو عقل وفہم والا ہو فقہ اور سنت کا عالم ہو اور مفتی کیلئے بھی یہی شرائط ہیں۔ جو بھی اہل شہادت ہو گا قاضی بننے کا اہل ہو گا اور اگر اہل شہادت میں سے نہ ہو تو اس کو قاضی بنانا جائز نہیں ہو گا چنانچہ نابینا اہل شہادت میں سے نہیں ہے۔ لہذا اس کو قاضی بنانا بھی درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ آواز کی مدد سے کما حقہ دوسرے کو نہیں پہچان سکتا کیونکہ آوازیں ایک جیسی ہو سکتی ہیں۔

محدود فی القذف (تہمت زدہ شخص) کو قضاء کے عہدے پر فائز کرنا درست نہیں ہے اگرچہ وہ اس سے توبہ تائب بھی ہو گیا ہو۔ اسی طرح مخنث بھی قاضی نہیں بن سکتا' گانا گانے والے کو بھی قضاء کا کام نہیں سونپا جا سکتا۔ اور عادی شراب خور بھی قاضی بننے کا اہل نہیں ہے۔ پرندوں کو لڑانے والا بھی عہدہ قضاء کا اہل نہیں ہے۔ ایسے ہی گناہ کبیرہ کا مرتکب بھی قاضی نہیں بن سکتا جس پر حد لگ سکتی ہو مثلاً زانی' سود خور' جوا باز وغیرہ۔ اسی طرح مروت اور شرافت کیخلاف کام کرنے والے کو بھی قاضی نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً راستے میں پیشاب کرنے والا یا راستے میں چلتے پھرتے کھانے والا' اسی طرح اسلاف کو برا بھلا کہنے والا بھی قضاء کی اہلیت سے عاری شمار ہوتا ہے۔

غیر عالم کو عہدہ قضاء پر فائز کرنا:

حضرات علماء احناف کے نزدیک غیر عالم کو قاضی بنانا جائز ہے کیونکہ وہ مفتی سے مسئلہ

۱۔ [ابوداؤد: ۳/۳۵۹۲]

پوچھ کر فیصلہ دے سکتا ہے اس سے قضاء کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ مقصد حق کو حقدار تک پہنچانا ہے۔ مگر بہتر یہی ہے کہ علم اور اہلیت کے حامل شخص کو قاضی بنایا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "من استعمل رجلا من عصابة وفي تلك العصابة من هو ارضى الى الله منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المومنين"[1]

قضاء کی مجلس:

قاضی فیصلہ کرنے کیلئے دار القضاء (عدالت گاہ) میں بیٹھے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھ کر فیصلہ فرمایا کرتے تھے اور حضرات خلفاء راشدین کا بھی یہی معمول رہا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حدرد پر ان کا قرض تھا۔ ایک دن انہوں نے مسجد نبوی میں ان سے اس کا مطالبہ کیا تو بحث ومباحثہ میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر مبارک تک آوازیں پہنچ گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آوازیں سن کر باہر تشریف لائے اور گھر کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا کر آواز دی' کعب بن مالک! کعب نے کہا: لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا آدھا قرض چھوڑ دے' کعب نے کہا: میں نے ایسا کر دیا رسول اللہ! پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قم فاقضه"۔ "اٹھو اور اس کا قرض ادا کرو"۔[2]

مستحب ہے کہ اس کے قریب علماء اور دیانتدار لوگ بھی بیٹھ جائیں اگر قاضی خود قضاء کا عالم ہو تو اکیلا بھی بیٹھنا درست ہے۔ اور ایک عادل دینی سمجھ بوجھ رکھنے والا منشی بھی رکھ لے کیونکہ اگر وہ عادل و متقی نہ ہوگا تو اس سے خیانت کا خدشہ ہو سکتا ہے۔ کاتب (منشی) کا مسلمان ہونا شرط ہے کیونکہ غیر مسلم سے خطرہ ہے کہ خلاف شریعت بات لکھ دے' اور فقہ کا علم رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں ہوگا تو قاضی کے منشاء کے مطابق نہیں لکھ سکے گا۔ قاضی کیلئے ضروری ہے کہ وہ متقاضمین سے دور بیٹھے تاکہ وہ اس کو رشوت کے ذریعے دھوکہ نہ دے سکیں۔

عدالت میں پیش ہونیوالوں کیساتھ قاضی کا رویہ:

قاضی پر لازم ہے کہ وہ عدالت میں پیش ہونے والے فریقوں کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے یعنی ان کو بٹھانے' ان کے ساتھ طرز تخاطب اور انہیں پیش کرنے اور دیکھنے اور اشارہ کرنے

---

[1] المستدرک ج۴ ص۹۲ [2] البخاری ۱/ ۲۳۵

میں یکساں رویہ رکھے۔ ارشاد خداوندی ہے: "یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ"[۱] "اے ایمان والو! تم انصاف کو قائم کرنے والے ہو جاؤ"۔

حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فریقین کو سامنے بٹھا کر فیصلہ فرمایا۔[۱] حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من ابتلی بالقضاء بین المسلمین فلیعدل بینهم فی لحظة و اشارة و مقعده مجلسه"[۲] "جو شخص مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی ذمہ داری میں مبتلا کیا گیا اسے چاہیے کہ ان کے درمیان دیکھنے، اشارہ کرنے اور بیٹھنے کے معاملے میں برابری کرے"۔ دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے: "من ابتلی بالقضاء بین الناس لایرفعن صوته علی احد الخصمین مالا یرفع علی الاخر"[۳] "جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی ذمہ داری میں مبتلا ہوا اس کو چاہیے کہ اگر ایک فریق پر آواز بلند نہ کرے تو دوسرے پر بھی آواز کو بلند نہ کرے"۔ عبداللہ بن قیس کے نام خط میں حضرت عمر بن الخطابؓ لکھتے ہیں: "اپنی عدالت میں لوگوں کے ساتھ غمخواری کرنا تا کہ ضعیف اور کمزور تیرے عدل سے ناامید نہ ہوں اور کوئی شریف تیری طرف سے خصوصی رعایت کی طمع نہ کرے"۔

گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم کھانا مدعی علیہ پر لازم ہے۔ قاضی ایک حریف کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے گا ایک کو دائیں اور دوسرے کو اپنے بائیں طرف نہیں بٹھائے گا۔ جب فریقین اس کے سامنے آئیں تو چاہے تو ایک وقت دونوں کو خطاب کر کے پوچھے تمہارا کیا معاملہ ہے؟ اور چاہے تو خاموش رہے اور فریقین خود بولیں۔ جب ایک شخص بات شروع کرے تو اس کی بات پوری ہونے سے پہلے دوسرے کو بات کرنے سے روک دے تا کہ ان کے دعوے کو خوب سمجھ سکے۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سرگوشی نہ کرے نیز دلیل کی وضاحت میں اس کی مدد نہ کرے کیوں ایسا کرنے کی صورت میں دوسرا دلبرداشتہ ہو جائے گا۔ قاضی کسی کے دعوی کی تشریح بھی نہیں کرے گا تا کہ ایک کی مدد کرنے کی تہمت اس پر نہ لگے نیز وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہنس کر بات نہیں کرے گا کیونکہ اس سے فریق ثانی اس پر جری ہو گا۔ اور ان کے ساتھ مزاح بھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ مزاح سے قاضی کی ہیبت و رعب میں کمی آئے گی۔ اور کسی فریق کی میزبانی بھی نہ کرے اور نہ ہی ان میں سے کسی کا ہدیہ قبول کرے نہ فیصلہ سے پہلے نہ فیصلے کے بعد کیونکہ یہ صورت رشوت کے مشابہ ہے۔ اگر فیصلے کے دوران قاضی کو کوئی غم لاحق ہو جائے یا کسی وجہ سے غضبناک ہو جائے تو فیصلے

---

[۱] ابوداؤد ۳/ص ۳۰۲ [۲] مجمع الطبرانی ۲۳/۲۸۵ [۳] دارقطنی ۴/ص ۲۰۵

کو روک لے۔ اسی طرح بھوک پیاس اور رفع حاجت کی ضرورت کے وقت بھی فیصلہ نہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "من ابتلی بالقضاء بین المسلمین فلا یقضین بین اثنین وھو غضبان" "جس کو دو مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے تو وہ غصہ کی حالت میں ہرگز فیصلہ نہ کرے"۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فیصلے کے وقت غور وفکر اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور مذکورہ حالات فکر وتدبر کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ فریقین میں رضامندی کی امید ہو تو ان کو ایک یا دو بار واپس بھیج دے تاکہ وہ صلح کرلیں۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "فریقین کو واپس بھیج دو تاکہ وہ آپس میں صلح کرلیں" اور اگر آپس میں صلح کرنے کی امید نہ ہو تو فیصلہ نافذ کردے کیونکہ فیصلے کو موخر کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

لوگوں کے ساتھ نشست وبرخاست:

قاضی خصوصی دعوتوں میں شامل نہ ہو۔ ہاں اگر دعوت عقیقہ اور شادی وغیرہ ہو تو شامل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ شادی، عقیقہ اور اسی طرح کی دوسری دعوتوں میں شامل ہونے پر تہمت کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور مسلمان کی دعوت کو قبول کرنا سنت بھی ہے۔ البتہ تہمت کے شبہ کی وجہ سے خصوصی دعوتوں میں شامل نہ ہو۔ اگر کوئی قریبی رشتہ دار ہو یا قاضی بننے سے قبل اس کے ہاں دعوت میں شامل ہونے کا معمول ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ قاضی مریضوں کی عیادت کرسکتا ہے لوگوں کے جنازوں میں جاسکتا ہے کیونکہ یہ حقوق مسلم میں شامل ہے۔ البتہ ان مجالس میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرے اور نہ ہی ان مجالس میں مقدمات کے متعلق کسی کو گفتگو کرنے دے۔

قاضی کسی کو فیصلہ کیلئے اپنا نائب نہیں بنائے گا کیوں وہ وکیل کی طرح ہے اور وکیل موکل کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنا نائب نہیں بنا سکتا۔ نیز وہ ایک حریف کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: "اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض لاحدھما حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الاول"[1] "جب دو حریف تیرے سامنے بیٹھ جائیں تو ایک کے حق میں فیصلہ نہ دو جب تک کہ تم پہلے کی طرح دوسرے کی بات کو مکمل نہ سن لو"۔ لیکن اگر عدالت میں غیر حاضر شخص کا وکیل یا اس کا کوئی حمایتی موجود ہو یا ایسا کوئی شخص موجود ہو جو شرعی طور پر اس کا نائب ہو سکتا ہے مثلاً وصی وغیرہ تو اس

---

[1] المستدرک ۴/۳۰ ص ۹۳

کی غیر موجودگی کے باوجود اس کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔ یا غائب پر دعویٰ حاضر پر دعویٰ کا سبب بن سکتا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ فلاں شخص کے قبضے میں جو گھر ہے وہ میرا ہے جبکہ خصم (مخالف) نے اس کا انکار کیا۔ مدعی نے گواہوں کے ذریعے ثابت کیا کہ اس نے اس مکان کو فلاں غائب شخص سے خریدا ہے۔ تو قاضی اس حاضر اور اس غائب کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک قطعہ اراضی یا کسی مکان پر شفعہ کا دعویٰ کیا اور قابض آدمی اس دعوے کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور مدعی نے گواہوں کے ذریعے ثبوت پیش کیا کہ اس نے یہ قطعہ اراضی فلاں غائب شخص سے خرید ہے تو اس صورت میں قاضی اس حاضر اور غائب دونوں کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔

کیا ایک قاضی دوسرے قاضی کے فیصلہ کو کالعدم قرار دے سکتا ہے؟:

اگر قاضی نے کسی ایسے کیس کا فیصلہ کیا جس میں اپنی رائے اور اجتہاد کی گنجائش موجود تھی اور اس نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ سنا دیا تو کسی قاضی کیلئے اس فیصلے کو منسوخ کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ بعد والے قاضی کا فیصلہ بھی اجتہادی سے ہوگا لہذا پہلے فیصلہ کو ہی ترجیح دی جائے گی۔

ابوحسان سے روایت ہے کہ عباس بن خرشہ الکلابی کو ان کے بچپازاد بھائیوں یا ان کی بیوی کے خاندان کے کچھ لوگوں نے کہا کہ تیری بیوی تجھے پسند نہیں کرتی اگر شک ہے تو اس کو طلاق کا اختیار دے کر دیکھو۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا: اے حرکی بیٹی! تجھے اختیار ہے' بیوی نے فوراً کہا میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا (یعنی تجھ سے جدائی کو اختیار کیا) ان الفاظ کو اس نے تین بار دہرایا کہنے والوں نے عباس بن خرشہ سے کہا: تیری بیوی تجھ پر حرام ہوگئی۔ اس نے کہا نہیں ہوئی تم جھوٹ بول رہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا' سارا واقعہ عرض کیا' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم اس کے قریب نہیں جاسکتے کسی دوسرے سے نکاح کرنے سے پہلے۔ اگر تم اس کے قریب گئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا۔

ابوحسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور حکومت آیا تو عباس بن خرشہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ابوتراب (حضرت علی کی کنیت) نے میری بیوی سے اس طرح جدائی کرائی ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو تبدیل نہیں کرسکتا' اسی کو برقرار رکھتا ہوں۔[1]

حضرت مالک سے روایت ہے کہ عبدالملک بن مروان کے دور امارت میں ابان بن

---

[1] السنن الکبریٰ ۱۰/۱۴۰

عثمان کو جب مدینہ منورہ کا گورنر بنایا گیا تو اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو منسوخ کرنے کا ارادہ کیا اور عبدالملک بن مروان کو خط کے ذریعے اپنے ارادے کی اطلاع دی۔ عبدالملک بن مروان نے جواب میں لکھا "ہم ابن الزبیر کے فیصلوں کو ناپسند نہیں کرتے ہم صرف ان کی حکمرانی کی خواہش کو ناگوار سمجھتے ہیں"۔ جب میرا یہ خط پہنچے تو اس پر عمل کرنا ابن الزبیر کے فیصلوں کو برقرار رکھنا ان کو کالعدم قرار نہ دینا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ہم بہت مشکل میں پڑ جائیں گے۔[1]

ایک قاضی کا فیصلہ دوسرے قاضی کے سامنے پیش ہو تو وہ اس کو نافذ کرے الا یہ کہ وہ قرآن اور حدیث مشہورہ اور اجماع کے خلاف ہو تو اس کے نفاذ کو روکے اور کالعدم قرار دے۔ کیونکہ قرآن، حدیث اور اجماع کی موجودگی میں اجتہاد اور اپنی رائے سے کام لینا درست نہیں ہے۔ اس سے پہلے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث گزری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: "اگر فیصلہ کرنا ہو تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا" فرمایا اگر کتاب اللہ میں اس کا حل نہ پاؤ تو؟ عرض کیا: سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں فیصلہ دوں گا" فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ عرض کیا اپنی رائے اور اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کروں گا اور اس میں سستی ہرگز نہیں کروں گا۔"[2]

اگر قاضی کے سامنے کسی حکمران کا حکم پیش کیا گیا اور وہ حکم کسی دلیل پر مبنی نہ ہو تو قاضی اس حکم کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس کے مطابق فیصلہ نہ دے مثلاً کوئی حاکم کسی کے قرض کو یہ کہہ کر ساقط کرنے کا حکم دے کہ سالہا سال گزرنے کے باوجود اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔

سنت مشہورہ کے مخالف فیصلے کی مثال یہ ہے مثلاً ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ اس نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا مگر ہمبستری سے قبل طلاق ہو گئی تو اس عورت کو پہلے شوہر کیلئے حلال قرار دینا سنت مشہورہ کیخلاف فیصلہ ہے کیوں کہ یہ مشہور حدیث عسیلہ کے خلاف ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں: رفاعہ القرظی نے اپنی بیوی کو طلاق مغلظہ (تین طلاقیں) دیں۔ اس نے عبدالرحمٰن بن الزبیر سے نکاح کر لیا (ایک دن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں رفاعہ کے نکاح میں تھی اس نے مجھے تین طلاقیں دیں اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن الزبیر سے نکاح کر لیا اس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر یہ اس کپڑے کی طرح اپنی چادر کا ایک کونا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا:

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۱۴۱ [2] سنن ابی داؤد ۳/۳۰۳

"لعلک تریدین ان ترجعی الی رفاعة؟ لا حتی یذوق عسیلتک وتذوقی عسیلته"
"شاید تم دوبارہ رفاعہ کے پاس جانا چاہتی ہو؟ نہیں جا سکتی یہاں تک کہ تم اس کا شہد چکھ لو اور تمہارا شہد وہ چکھ لے"۔ اس وقت حضور ﷺ کے پاس ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور خالد بن سعید بن العاص حجرہ شریف کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر خالد بن سعید نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آواز دی کہ تم اس عورت کو کیوں نہیں ڈانٹ رہے ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیسی باتیں کر رہی ہے۔[1]

اور کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ دینے کی مثال یہ ہے کہ کوئی قاضی کسی متروک التسمیہ عمداً ذبیحہ کے حلال ہونے کا فیصلہ دے تو دوسرا قاضی اس فیصلہ کو منسوخ کر دے اور اس کے مطابق فیصلہ نہ دے۔

کن لوگوں کی گواہی پر فیصلہ نہیں دیا جا سکتا؟:

اصول وفروع کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی یعنی باپ دادے اور پڑدادے کی گواہی بیٹے پوتے اور پڑپوتے کے حق میں اور بیٹے پوتے اور پڑپوتے وغیرہ کی باپ دادا اور پڑدادے کے حق میں قبول نہیں ہوگی۔ نیز بیوی کی گواہی اس کے شوہر کے حق میں اور شوہر کی گواہی بیوی کے حق میں قبول نہ ہوگی اور کسی اجیر کی گواہی اس کے مستاجر حق میں قبول نہ ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "لا تقبل شهادة الولد لوالده ولا شهادة الوالد لولده ولا المرأة لزوجها ولا الزوج لامرأته"[2] "بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہ ہوگی نہ والد کی گواہی اس کے بیٹے کے حق میں نہ بیوی کی گواہی اس کے شوہر کے حق میں اور نہ شوہر کی گواہی بیوی کے حق میں قبول ہوگی۔ اور نہ اجیر کی گواہی مستاجر کے حق میں قبول ہوگی"۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے منافع آپس میں مشترک ہیں لہٰذا ان لوگوں کی گواہی پر فیصلہ دینا درست نہیں ہوگا۔

کیا قاضی اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے؟:

قاضی اپنی عملداری کے علاقوں میں حقوق العباد کے متعلق اپنی معلومات اور مشاہدات کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا دیکھنا اور کسی معاملے میں ذاتی علم رکھنا دو گواہوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ معاملے کی حقیقت کو خود دیکھنے اور دوسروں سے سننے سے یقینی طور پر علم حاصل ہوتا ہے جبکہ گواہوں کے ذریعے فراہم شدہ معلومات سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ تمام فقہاء کا اس

---

[1] مسلم ۲/۱۱۵۲۔ [2] نصب الرایہ ۴/۸۳۔

بات پر اجماع ہے کہ اس کا ذاتی قول مقبول ہے۔ البتہ قاضی بننے سے پہلے حاصل شدہ معلومات یا اپنی عملداری کے علاقوں کے علاوہ دوسرے علاقوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کرنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ یہی قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح سے بھی منقول ہے۔ اور حضرات صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) اس کو بھی جائز اور درست قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ قاضی اپنے شہر (جہاں وہ قاضی ہے) کے علاوہ دیگر علاقوں میں ایک عام فرد کی حیثیت رکھتا ہے اور محض ایک گواہ ہے، حاکم نہیں ہے اور صرف ایک فرد کی گواہی مقبول نہیں ہے۔ یہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے بینہ عادلہ کے ذریعے معلومات حاصل کیں پھر قاضی بنا اور اس سابقہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ دیا تو یہ درست نہیں ہے۔ قاضی کا اپنے علم کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی دلیل حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہے وہ فرماتی ہیں: ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا! ابوسفیان بخیل آدمی ہے مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کیلئے کافی ہو الا یہ کہ اس کی اجازت کے بغیر میں لے لوں، کیا بغیر اجازت کے اس کے مال میں سے کچھ لینے میں مجھ پر کوئی گناہ ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خذی من ماله بالمعروف ما يكفيك ويكفي بنيك'' ''اس کے مال سے اپنے اور اپنے بچوں کی کفایت کے بقدر معروف طریقے سے لے سکتی ہو''۔

استثنائی صورت:

قاضی کیلئے حدود اللہ میں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں وہ ایک فریق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے نفاذ میں اس کا نائب ہے البتہ حد قذف میں اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ اس میں حق عبد بھی ایک گونہ موجود ہے۔

جھوٹی گواہی کی بنیاد پر فیصلے کا حکم:

اگر جھوٹی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ دیا گیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عقود اور فسوخ میں اس کا فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہوگا جیسے نکاح، طلاق، بیع، ہبہ اور وراثت وغیرہ۔ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ظاہراً تو نافذ ہوگا مگر باطناً نافذ نہیں ہوگا۔ اگر دو گواہوں نے کسی عورت کے کسی شخص کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں جھوٹی گواہی دی اور قاضی نے ان کی گواہی پر اعتماد کرتے ہوئے نکاح منعقد ہونے کا فیصلہ دیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نکاح نافذ ہوگا حتی کہ اس مرد کیلئے اس عورت کے ساتھ ہمبستری کرنا جائز ہوگا۔ مگر حضرات صاحبین (امام

یوسفؒ امام محمدؒ) کے نزدیک اس کے ساتھ ہم بستری کرنا اس کیلئے حلال نہیں ہوگا۔

اگر دو مردوں نے عدالت میں گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی ہے قاضی نے ان کی گواہی پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے درمیان جدائی کا فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد کسی دوسرے شخص نے اس عورت کے ساتھ نکاح کیا تو یہ نکاح امام صاحب کے نزدیک اس کیلئے جائز ہوگا اور حضرت صاحبین فرماتے ہیں اگر دوسرے شوہر کو اس کا علم نہ ہو تو اس کیلئے ہم بستری جائز ہوگی کیونکہ حقیقت حال سے وہ بے خبر ہے اور باطن کے علم کا وہ مکلف نہیں ہے اور اگر وہ ان کے متعلق جانتا ہو جیسے وہ خود دو گواہوں میں سے ایک ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنا اس کیلئے حلال نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زوج اول کیلئے وہ حرام ہوگی جماع کی صورت میں زانی قرار پائے گا۔ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک جماع حلال ہوگا اور وہ زانی نہیں ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زوج اول کیلئے ہم بستری حلال نہیں ہوگی کیونکہ امام صاحبؒ کے قول سے حرمت کا شبہ پڑ گیا لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ اس کو حرام قرار دیا جائے۔ وراثت اور ہبہ میں جھوٹی گواہی کی بنیاد پر کیا گیا فیصلہ نافذ ہوگا۔ حق کے مشہود لہ کیلئے ہبہ اور میراث کے مال کو کھانا حلال ہوگا اور امام صاحبؒ سے ایک روایت ہبہ میں عدم نفاذ کی بھی ہے چنانچہ امام صاحبؒ کے اس بارے میں دو قول ہوئے۔

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **"انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علی نحو مما اسمع منه فمن قطعت له من حق اخیه شیئاً فلا یاخذه فانما اقطع له به قطعة من النار"** [1]

"تم اپنی خصومت لے کر میرے سامنے آتے ہو ہو سکتا ہے تم میں سے کوئی ایک اپنی دلیل زیادہ بہتر طریقے سے بیان کرے اور میں اس کی دلیل کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ اور اگر دلیل کو دیکھ کر کسی کو کوئی چیز دے دوں تو وہ اس کو نہ لے کیونکہ یہ اس کے آگ کا ٹکڑا ہے"۔ یہ حدیث عام ہے تمام حقوق عقود اور فسوخ وغیرہ کو شامل ہے پس باطن پر بھی حکم اثر انداز ہونا چاہیے البتہ ظاہر پر اس کا نفاذ قاضی کے فیصلے سے ہوگا۔ حضرات صاحبین کی دلیل مال کے بارے میں تو صریح ہے اور ہم اس کے قائل ہیں کیونکہ اموال جیسے ہبہ اور وراثت وغیرہ میں جھوٹی گواہی کی بنیاد پر قاضی کا فیصلہ اس حدیث کی رو سے نافذ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس آیت کریمہ: "**وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ**" [2] "اپنے اموال کو آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ" سے بھی عدم نفاذ کا حکم ثابت ہوتا ہے اور عقود اور فسوخ میں جھوٹی گواہی پر قاضی کے فیصلے کے نافذ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قاضی کو

---

[1] مسلم ج۲ ص۱۳۳۷ [2] البقرہ: ۱۸۸

معاملہ کے منعقد کرنے اور اسے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن کسی کی ملک کو دوسرے کیلئے بلا سبب ثابت کرنے کا اختیار نہیں ہے چنانچہ قاضی کو کسی بچے یا بچی کے نکاح کے انعقاد کا اختیار حاصل ہے۔اسی طرح وہ عنین (نامرد) اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کا بھی اختیار رکھتا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ عقود کے متعلق فیصلہ دینا قاضی کے اختیار میں ہے۔عقود وفسوخ میں قاضی کے فیصلے کو ظاہراً وباطناً نافذ نہ ماننے کی صورت میں ایک خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ کسی کی جھوٹی گواہی پر قاضی نے میاں بیوی کے درمیان اگر وقوع طلاق کا حکم صادر کیا اور عورت نے دوسرے شوہر کے ساتھ جا کر نکاح کر لیا اب اگر باطناً اس کو نافذ نہ مانا جائے تو زوج اول کیلئے وہ حلال ہوگی اور ظاہر کے اعتبار سے وہ دوسرے شوہر کیلئے حلال ہوگی۔گویا ایک وقت میں وہ دونوں کیلئے حلال ہوگی اگر اس فیصلے کو ظاہراور باطناً نافذ مانیں گے تو یہ خرابی لازم نہیں آئے گی۔

قرض سے انکار پر قید کرنے کا حکم:

اگر کوئی شخص کسی کے قرض کا انکار کرے اور قرض اس پر ثابت ہو جائے تو ایسے مدیون کو قید کرنا واجب ہے۔اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:"للواجد یحل عرضہ وعقوبتہ"[1] "صاحب حیثیت ٹال مٹول کرنے والے کو سزا دینا درست ہے"۔اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے اور وہ مدیون کو محبوس کرنے کا مطالبہ کرے تو قاضی اس کی درخواست پر مدیون کو محبوس نہیں کرے گا بلکہ اس کو ادائیگی دین کیلئے کہے گا اور اس کو وقت دے گا۔ہاں اگر ادا کرنے سے انکار کرے تو اس کو قید کر سکتا ہے کیوں کہ اس کا ظلم واضح طور پر سامنے آگیا۔قید نہ کرنا اس وقت ہے جب دین اس کے اقرار سے ثابت ہو۔اگر دین کا ثبوت بذریعہ گواہ ہو تو قرض خواہ کی پہلی درخواست پر ہی اس کو جیل بھیجا جا سکتا ہے۔اس صورت میں تو وہ ظالم ہوگا قاضی اس کو فوراً دین کی ادائیگی کا حکم دے گا اور اس سے اس کی مالی حالت دریافت نہیں کرے گا ہاں اگر وہ اپنی تنگ دستی کو ثابت کرے تو اس کو آزاد کرے گا کیونکہ اس صورت میں وہ ازروئے نص مہلت دینے کا مستحق ہوا ہے لہٰذا اس کو وقت دیا جائے گا۔اگر مدعی کہے کہ مدیون مالدار ہے اور وہ اس کا انکار کرتا ہو اور کہے کہ میں نادار اور غریب ہوں اگر قاضی کو اس کی مالداری کا علم ہو یا اس نے مدعی سے نقد قرض لیا ہو یا اس کے ذمے دین کسی خریدی ہوئی چیز کی قیمت ہو یا بیوی کا مہر ہو یا کسی کی کفالت کی ذمہ داری لینے کی رقم ہو یا بدل خلع ہو تو قاضی اس کو قید کر سکتا ہے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ جو کچھ اس کے قبضے میں ہے وہ باقی ہے۔مذکورہ صورتوں کے علاوہ وہ اسے محبوس

---

[1] [بخاری:۲۳۲۷]

نہیں کرسکتا جبکہ مدیون اپنی فقیری وناداری کا دعویٰ کرے کیونکہ وہ اصل ہے۔

قید کرنے کے بعد کافی مدت گزرنے کے باوجود اگر اس کا مال ظاہر نہیں ہوا اور گمان غالب ہو کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو وہ ضرور ادا کرتا اور اس کے بارے میں قاضی کی خفیہ معلومات کے باوجود اس کے مالدار ہونے کا علم نہیں ہوا تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ اس کی تنگ دستی ظاہر ہوگئی پس وہ مہلت کا مستحق ہوگیا۔ اسی طرح اگر دو گواہوں نے اس کے تنگ دست ہونے پر گواہی دی تو اس کو آزاد کر کے مہلت دی جائے گی۔ تنگ دستی پر ثبوت اور گواہی قید کرنے کے بعد قبول کی جائے گی پہلے نہیں یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔ اگر اس کے مالدار ہونے پر گواہوں نے گواہی دے دی تو اس کی مدت حبس کو بڑھا دیا جائے گا کیونکہ اس کا ظلم ثابت ہوگیا۔

البتہ مدت قید کے متعلق حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس معاملہ کو قاضی کے صوابدید پر چھوڑا جائے گا کیونکہ قیدی زندگی کو برداشت کرنے اور برداشت نہ کرنے میں لوگ برابر نہیں ہوتے بلکہ بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے۔ بیوی کے نفقہ کیلئے شوہر کو قید کیا جائے گا کیونکہ یہ ثابت شدہ حق ہے اور وہ حق اس نے روک رکھا ہے اور کسی کے حق کو روکنا ظلم ہے اور ظلم کی سزا قید ہے۔ بیٹے کے قرض کی وجہ سے باپ کو قید نہیں کیا جائے گا۔ یہی حکم اجداد وجدات کا ہے یعنی پوتوں کے قرضوں کی وجہ سے ان کو قید میں نہیں رکھا جائے گا۔ البتہ ان پر خرچ کو روکنے کی وجہ سے ان کو محبوس کیا جائے گا کیونکہ خرچہ کو روکنا ان کو ہلاک کرنا ہے۔ مریض اگر بیمار ہو جائے اور جیل میں اس کی تیمارداری کرنے والے موجود ہوں تو قاضی اس کو آزاد نہیں کرے گا اور اگر اس کی خدمت کرنے والا موجود نہ ہو تو اس کو آزاد کرے گا تاکہ ہلاک نہ ہو جائے۔

قاضی کا دوسرے علاقے کے قاضی کو بذریعہ خط معلومات فراہم کرنا:

ہر ایسے حق کے متعلق جو شبہ سے ساقط نہیں ہوتا جس میں قاضی حریفوں اور گواہوں کو جمع کرنے سے عاجز ہو جائے اور وہ دوسرے علاقے کے قاضی کو خط کے ذریعے اپنی کارروائی سے مطلع کرے تو اس کو قبول کیا جائے گا۔ اور وہ معاملات وحقوق جو شبہ سے ساقط ہوتے ہیں مثلاً حدود، قصاص وغیرہ تو اس میں ایک قاضی کے دوسرے قاضی کے نام خط کو قبول نہیں کیا جائے گا پہلی صورت میں جواز کی دلیل یہ ہے کہ خط مکتوب عنہ (جس کی طرف سے خط لکھا گیا ہے) کے بالمشافہ خطاب اور زبانی تعبیر کے قائم مقام ہے دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی کتاب جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی وہ امر ونواہی وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے خطاب کے قائم مقام ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب

مبارک۔ جو روم وفارس کے بادشاہوں اور دوسرے شہروں کے امیروں کے نام لکھے گئے وہ خطوط آپ ﷺ کے خطاب اور زبانی حکم کے قائم مقام ہیں۔ ان کیلئے ان خطوں پر عمل کرنا واجب تھا جس طرح آپ کے خطاب مبارک سے حکم واجب ہوتا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہوئی تو ایک قاضی کا خط دوسرے قاضی کے نام اس کے زبانی خطاب کے حکم میں ہے۔ مثلاً اگر گواہوں نے ایک علاقے کے قاضی کے پاس گواہی دی کہ اس شہر کے فلاں غائب شخص کے ذمہ اتنے مال ادا کرنا واجب ہے تو یہ قاضی اس علاقے کے قاضی کے نام خط لکھے گا جس میں وہ مدیون شخص موجود ہے اور اپنی ابتدائی سماعت کے متعلق اس کو لکھے گا۔ یہ شہادت کی کارروائی کو اس تک پہنچاتا ہے اس وجہ سے قاضی مکتوب الیہ اس خط کو قبول کر کے اس کے متعلق فیصلہ کرے گا۔

اگر گواہی کسی حاضر شخص کے خلاف ہو تو قاضی گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دے گا اور اس کو باقاعدہ تحریر میں لائے گا اور وہ ایک دستاویز ہوگی۔ اسی طرح نکاح یا دین غصب اور وہ امانت جس کا انکار کیا گیا ہو اور مضاربت وغیرہ یہ سب فیصلے ضبط تحریر میں لائے جائیں گے کیونکہ یہ سب چیزیں ذمہ میں واجب ہوتی ہیں۔ ان کی ادائیگی ضروری ہے اور ان فیصلوں میں حریفین کے نام اور ان کے آباؤ اجداد کے نام بھی لکھے جائیں گے اس لیے کہ انسان کی پہچان اس کے آباؤ اجداد کے ماحول سے ہوتی ہے۔ اسی طرح زمین کے معاملے میں اور رجسٹری میں بھی ان کے نام اور ان کے باپ دادے کے نام درج کیے جائیں گے کیونکہ جائیداد کی پہچان اس کی حدود اربعہ کی معرفت سے ہوگی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام منقول جائیداد میں اصل کے ساتھ اس کے آباؤ اجداد کے نام بھی لکھے جائیں گے اور اس کے اوصاف بھی تحریر ہوں گے۔ مقدار کو بھی تحریر میں لایا جائے گا۔ امام اعظم کے نزدیک منقول جائیداد میں نام درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان میں صرف اشارہ کرکے گواہی دینے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے۔ دستاویز کی تحریری صورت اس طرح ہوگی، مدعی، مدعی علیہ کے نام، ان کے آباؤ اجداد اور ان کے قبیلوں اور علاقوں کے نام ان کے القاب وغیرہ تحریر کیے جائیں گے۔ دادے کے نام کے بغیر تحریر ناقص شمار ہوگی وہ تمام نام درج کرنا ضروری ہیں جن کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ التباس اور اشتباہ ختم ہو جائے۔ قاضی کیلئے لازم ہے کہ جس کے نام خط تحریر کرے اس کو متعین کرے مثلاً یوں لکھے فلاں بن فلاں کی جانب سے فلاں بن فلاں کے نام یہ مکتوب ہے۔ تاکہ مکتوب الیہ (جس کی طرف خط ارسال کر رہا ہے) متعین ہو جائے اور گواہوں کی موجودگی میں خط کو پڑھے اور خط کے مضمون کے متعلق ان کو آگاہ کرے تاکہ

جس کی وہ گواہی دیں گے اس کو وہ سمجھ بھی سکیں گے اور پھر گواہوں کی موجودگی میں ہی خط کو سربمہر کرے تاکہ دوسرے قاضی کے پاس جا کر وہ کہہ سکیں کے یہ واقعتہً فلاں قاضی کا خط ہے اور یہ اس کی مہر ہے اور اس خط کے اندر ان کے اباؤ اجداد کے ناموں کے ساتھ گواہوں کے نام بھی موجود ہوں تاکہ اشتباہ کا مکمل ازالہ ہو جائے۔

قاضی اگر اپنے حکم نامے میں کسی کو متعین کر کے نہ لکھے بلکہ یوں لکھ دے کہ از فلاں بن فلاں بنام قضاۃ المسلمین تو اس صورت میں جس قاضی کے پاس بھی یہ تحریر پہنچے اس پر اس کو قبول کرنا لازمی ہوگا کیونکہ غیر متعین لوگوں کو مخاطب کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اطراف واکناف کے لوگوں کی طرف مراسلے ارسال فرمائے اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی حالانکہ آپ ﷺ ان کو جانتے نہیں تھے۔ جب مکتوب الیہ قاضی کے پاس مکتوب عنہ قاضی کا خط پہنچے تو وہ مدعی علیہ کو حاضر کرے اور اس کی موجودگی میں خط کو پڑھے اور جو کچھ اس کے اندر لکھا ہوا ہے اس کے مطابق عمل کرنے کا اس کو پابند کرے کیونکہ اس کےخلاف حق ثابت ہو چکا ہے۔

اگر خط پہنچنے سے قبل مکتوب عنہ قاضی وفات پا جائے یا معزول کر دیا جائے یا اپنے کسی کردار کی وجہ سے عہدہ قضاء کی اہلیت کھو بیٹھے تو خط پر عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ خط پہنچنے کے وقت بمنزلہ خطاب کے ہوتا ہے لہٰذا مرنے کی وجہ سے وہ خطاب کا اہل نہ رہا اور وہ معزول ہونے یا اہلیت قضاء سے محروم ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی طرح ہو گیا اسی طرح مکتوب الیہ کے انتقال پر بھی خط پر عمل ختم ہو جائے گا۔ الا یہ کہ اس کے نام کے بعد لکھا ہو کہ یا اس کے علاوہ جس قاضی کو پہنچے۔ اگر حریف کا انتقال ہو جائے تو خط پر عملدرآمد ختم نہیں ہوگا کیونکہ اس کے ورثاء اس کے قائم مقام ہوں گے۔

فیصل مقرر کرنے کا حکم:

دو آدمیوں نے آپس کے جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے کسی تیسرے شخص کو حکم (فیصلہ کرنے والا) مقرر کر لیا تو یہ جائز ہے۔ اس کے فیصلے پر عمل کرنا دونوں پر لازمی ہوگا کیونکہ دونوں نے اس کو اختیار دیا ہے لیکن فیصلہ کرنے سے قبل دونوں میں سے ہر ایک کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے مگر فیصلہ کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ جب ایک کی رضامندی نہ رہی تو اس کی طرف سے دیا گیا اختیار بھی ختم ہو گیا لیکن حکم مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ حکم (فیصلہ کرنے والا) اہل قضاء میں سے ہو کیونکہ اس کا حکم قاضی کے حکم کی طرح دونوں پر لازمی طور پر لاگو ہو جائے گا۔ لہٰذا حکم کو

مقرر کرتے وقت اور فیصلہ کے وقت اس کے اندر قضاء کی اہلیت کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس حکم گواہوں کی گواہی اور اقرار وغیرہ کی مدد سے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس کے فیصلے کو اگر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا تو قاضی کو اختیار ہوگا اگر اس کے منشاء ومذہب کے مطابق ہو تو قبول کرے ورنہ رد کرنے کا بھی اختیار رہوگا۔ اس لیے کہ اس کا حکم قاضی پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہے لہذا ایسے فیصل کا حکم نافذ نہیں ہوگا جس میں گواہی کی اہلیت موجود نہ ہو۔ حدود وقصاص میں فیصل مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حدود شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حریفین کو اپنے خون پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ قصاص میں تو تحکیم (فیصل مقرر کرنا) جائز ہے لیکن حدود میں جائز نہیں ہے کیونکہ حدود حقوق اللہ میں سے ہیں لہذا ان میں تحکیم جائز نہیں ہوگی چونکہ قصاص کا اختیار رکھتے ہیں اس لیے اس میں فیصلہ کرنے کے اختیار کو دوسرے کے حوالے کرسکتے ہیں۔ چوری کی ضمان دلانے میں تو تحکیم جائز ہے لیکن ہاتھ کاٹنے میں جائز نہیں ہے۔

کتاب الشہادات

شہادت کا لغوی معنی "یقینی خبر" اور "حاضر ہونے" کے ہیں۔ اور اصطلاح شرع میں آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کو شہادت کہا جاتا ہے۔ کسی واقعہ کو دیکھے سنے اور سمجھے بغیر گواہی دینا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح بھولے ہوئے واقعہ کو بیان کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی گواہی دینے کا تذکرہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اما انت یا ابن عباس فلا تشهد الا علی امر یضئ لک کضیاء هذه الشمس"[1] "اے ابن عباس! تم گواہی نہ دینا جب تک کہ معاملہ اس سورج کی طرح تیرے سامنے روشن نہ ہو جائے"۔

ابو مجلز کہتا ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: کچھ لوگ مجھے گواہ بنانے کیلئے بلا رہے ہیں مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے فرمایا: "جو کچھ تم جانتے ہو اس کی گواہی دو"۔[2]

شہادت حجت ہے:

شہادت حق کو ظاہر کرنے والی ایک حجت ہے اللہ تعالیٰ نے ان آیات کریمہ میں اس کو مشروع فرمایا ہے: "وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ" (البقرہ: ۲۸۲) "اور شاہد کرلو دو شاہدوں کو مردوں میں سے" دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ" (الطلاق: ۲) "اور گواہ کرلو دو صاحب عدل کو آپس میں"۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد گرامی ہے: "البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه" "مدعی پر گواہ پیش کرنا لازم ہے اور مدعی علیہ پر حلف"۔ گواہی دینے میں لوگوں کے حقوق کا احیاء معاملات میں انکار کی راہوں کا انسداد اور لوگوں کے اموال کی حفاظت ہے۔

گواہی دینے کا حکم:

گواہی دینا بعض اوقات فرض، بعض مرتبہ مکروہ اور کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔

(۱) کسی واقعہ کے متعلق علم ہو اور مدعی اس کو گواہی کیلئے دعوت دے تو گواہی دینا فرض ہو جاتا

---

[1] بیہقی ۱۰/۱۵۶ [2] ترمذی ج۱ ص ۳۹۹

ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ'' [البقرہ: ۲۸۳] ''تم گواہی کو مت چھپاؤ' اور جو گواہی کو چھپائے گا تو وہ دل کا گناہ گار ہوگا۔'' دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے: ''وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا'' [البقرہ: ۲۸۲] ''نہ انکار کریں گواہ جب ان کو گواہی کیلئے بلایا جائے۔''

جب کسی واقعہ کے بارے میں گواہی کا متعلق صاحب علم کو نہ ہو اور گواہ کو صاحب حق کے حق کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں گواہ پر لازم ہے کہ وہ بلا طلب گواہی دینے کیلئے حاضر ہو۔ اس قسم کی گواہی کی حضور ﷺ نے تعریف فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے ''أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا'' [۱] ''کیا میں تمہیں بہترین گواہ کے متعلق نہ بتاؤں' بہترین گواہ وہ ہے جو بلانے سے قبل حاضر ہو۔''

(۲) کبھی گواہی دینا مکروہ بھی ہوتا ہے جب صاحب حق کو علم ہو کہ فلاں شخص گواہ ہے پھر بھی وہ اس کو گواہی دینے کیلئے نہ بلائے اور گواہ خود چل کر گواہی دینے کیلئے حاضر ہو جائے کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''ان خیر کم قرنی' ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم' ثم یکون بعد ھم قوم یشھدون ولا یستشھدون' ویخونون ولا یتمنون وینذرون ولا یوفون ویظھر فیھم السمن'' [۲] ترجمہ: ''بیشک تم میں بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں' پھر ان کے بعد آنے والے پھر ان کے بعد آنے والے پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو بن بلائے گواہی دیں گے جو خیانت کریں گے امانتداری سے عاری ہوں گے' وعدہ خلافی کریں گے ایفاء عہد نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا۔''

(۳) بعض دفعہ گواہی دینا حرام بھی ہو جاتا ہے جب گواہ کسی واقعہ میں موجود نہ ہو اور نہ ہی اس کے متعلق اس نے کچھ سنا ہو اور نہ ہی وہ اس کے متعلق کسی طرح کی کوئی معلومات رکھتا ہو۔ یہ درحقیقت جھوٹی گواہی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''الا انبئکم باکبر الکبائر'' ''کیا میں تمہیں سب گناہوں سے بڑا گناہ نہ بتاؤں'' ۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ ﷺ! ضرور بتلا دیجئے' فرمایا: ''الاشراک باللہ' وعقوق الوالدین'' ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا'' ۔ آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اٹھ کر

---

[۱] صحیح مسلم ج۲ ص ۱۹۶۴ [۲] صحیح مسلم ج۲ ص ۱۹۶۴

بیٹھ گئے فرمایا: "الا وقول الزور" "سنو! جھوٹ بولنا"۔ ان الفاظ کو آپ ﷺ بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جائیں[1]

حدود میں گواہی کا حکم:

حدود میں گواہ کو اختیار ہے' چاہے حکام کے سامنے گواہی دے چاہے خاموش رہے۔ دونوں صورتوں میں وہ آزمائش میں ہے کیونکہ بتانے کی صورت میں ایک حکم الٰہی (حد) کا قیام ہوتا ہے اور خاموشی کی صورت میں ایک مسلمان رسوائی سے بچتا ہے۔ حد کو قائم کرنا اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور نیک نیتی سے ایک مسلمان کی پردہ پوشی باعث اجر وثواب ہے بلکہ کسی کی جھک عزت سے اس کی پردہ پوشی افضل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہزال (جس نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو لا کر اس کے خلاف گواہی دی تھی) سے فرمایا: "لوسترته بثوبك كان خيراً لك"[2] "اگر تم اپنے کپڑے سے اس کو چھپاتے تو تیرے لیے بہتر تھا"۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة"[3] "جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے"۔

واجب الحد شخص کو تلقین کرنا:

شارع علیہ السلام نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ جس پر حد واجب ہو گئی ہو اس کو ایسی تلقین کی جائے کہ جس سے وہ ایسی بات کہہ دے کہ اس پر حد نہ لگ سکے اور اقرار سے رجوع کرلے۔ حد کے معاملے میں قاضی کو چاہیے کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔

حضور ﷺ حد ساقط کرنے کیلئے حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو تلقین فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لعلك قبلت او غمزت او نظرت"[4] "ہو سکتا ہے تم نے اس کو بوسہ دیا ہو یا ہاتھ لگایا ہو یا اس کی طرف دیکھا ہو"۔ انہوں نے کہا! نہیں آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں! اس وقت آپ ﷺ نے رجم کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اگر اس وقت "لا" (نہیں) کہہ دیتے تو حد سے بچ جاتے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چور (جس نے چوری کا اعتراف کیا تھا) سے فرمایا: مجھے نہیں لگتا کہ تم نے چوری کی ہے۔ چور نے کہا' کیوں نہیں! آپ ﷺ نے دو تین بار یہ الفاظ دہرائے اس نے یہی جواب دیا۔ تب آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔[5]

---

[1] [بخاری: ۵۲۲] [2] [ابوداؤد ۲ص ۱۳۲]

[3] [الترمذی: ۲/۳۲۰] [4] [ابوداؤد ۲ص ۱۳۲]

حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی ایک مرتبہ ایک چور کو حد سے بچانے کیلئے کچھ الفاظ تلقین فرمائے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں عکرمہ بن ابی خالد کی روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک چور کو پیش کیا گیا جس نے چوری کا اعتراف کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ایک شخص کا ہاتھ دیکھ رہا ہوں جو چور کا ہاتھ نہیں ہے۔ چور نے کہا: اللہ کی قسم میں چور نہیں ہوں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو چھوڑ دیا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''شراحة الھمدانیة'' کو حد سے بچنے کیلئے حیلہ کی تلقین فرمائی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مرتبہ ''شراحة الھمدانیة'' کو لایا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا ممکن ہے کہ تجھ پر کوئی شخص گرا ہو درحالیکہ تم سوئی ہوئی ہوگی کہنے لگی: نہیں پھر فرمایا: ہوسکتا ہے کہ تجھ پر کسی نے زبردستی کی ہو؟ کہنے لگی کہ نہیں ایسی بات بھی نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ تلقین کرتے رہے کہ شاید وہ عورت (جی ہاں) کہہ دے۔[2] ابو مطر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص کو لایا گیا اور عرض کیا گیا کہ اس نے ایک شخص کا اونٹ چوری کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا مجھے نہیں لگتا کہ تم نے چوری کی ہے اس نے کہا: کیوں نہیں پھر فرمایا: ہوسکتا ہے کہ تجھے شبہ ہوگیا ہو اس نے کہا ''نہیں'' بلکہ میں نے چوری کی ہے۔ فرمایا: اے قنبر! اس شخص کو لے جاؤ آگ جلاؤ اور قصاب کو بلاؤ میرے آنے تک اس کے باندھے رکھو پھر اس کے پاس آ کر فرمایا: کیا تم نے چوری کی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نے چوری نہیں کی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امارت کے زمانے میں ان کی خدمت میں ایک چور کو لایا گیا آپ نے اس سے فرمایا کیا تم نے واقعی چوری کی ہے؟ کہہ دو نہیں' کہہ دو نہیں' دو یا تین مرتبہ ان الفاظ کو دہرایا۔[3]

حدود میں عورتوں کی گواہی:

زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نصب الرایہ'' میں حضرت امام الزہری رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک اور حضرات خلفاء راشدین کے ادوار سے آج تک یہ بات چلی آرہی ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔ امام شعبیؒ' امام ابراہیم نخعیؒ' حضرت حسن بصریؒ اور امام ضحاکؒ وغیرہ حضرات کے نزدیک بھی حدود میں عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہے۔ امام بیہقیؒ نے ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک حدود اور طلاق میں عورتوں کی گواہی

---

[1] نصب الرایہ: ج۴ ص ۷۷ [2] نصب الرایہ: ج۴ ص ۷۷ [3] نصب الرایہ: ج۴ ص ۷۸

جائز نہیں ہے۔ طلاق کا معاملہ حدود سے اشد ہے لیکن حنفیہ کے نزدیک مشہور قول طلاق کی بجائے قصاص کا ہے۔ یعنی قصاص اور حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔

گواہی کی مراتب:

گواہی کے چار مراتب ہیں۔ (۱) زنا میں گواہی دینا' (۲) حدود وقصاص میں گواہی دینا (۳) حدود وقصاص کے علاوہ امور میں گواہی دینا' (۴) ولادت' بکارت اور عورتوں کے ان عیوب کے بارے میں گواہی دینا جن پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے۔

(۱) زنا کے متعلق گواہی دینا:

اس میں چار مردوں کی گواہی قابل قبول ہے عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہے۔ اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ "وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفٰحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ" [النساء:۱۵] "اور وہ عورتیں کہ آتی ہیں بے حیائی کو عورتوں تمہاری سے۔ پس گواہ مانگو اوپر ان کے چار گواہ اپنے میں سے۔" دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً" [النور:۴] "اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاک دامنوں کو پھر نہیں لاتے چار گواہ تو ان مار وان کو اسی کوڑے"۔

حدود میں عورتوں کی گواہی مقبول نہ ہونے کی دلیل امام زہری کی یہ روایت ہے وہ فرماتے ہیں: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء کے زمانے سے یہ سنت جاری ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔ گواہی دینے والے چار گواہ شہادت کے الفاظ سے گواہی دیں گے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے اور زنا کے فعل کو صریح الفاظ میں بیان کریں گے۔ اور کہیں گے کہ ہم نے دیکھا کہ فلاں شخص نے زنا کیا جیسے اپنی سلائی کو سرمہ دانی میں داخل کیا یا کہے جیسے اس نے رسی کو کنوئیں میں داخل کر دیا۔

(۲) حدود وقصاص کے متعلق گواہی دینا:

اس میں دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی اور حدود وقصاص میں بھی عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔ لواطت کے بارے میں گواہی دینے کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں دو عادل مردوں کی گواہی مقبول ہوگی اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک زنا کی طرح اس میں بھی چار مرد کا ہونا ضروری ہے۔ چار سے کم کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔

(۳) حدود وقصاص کے علاوہ دیگر حقوق میں گواہی دینا:

حدود کے علاوہ دوسرے حقوق میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بھی مقبول ہوگی۔ خواہ وہ حق مال کی صورت میں ہو یا کچھ اور ہو مثلاً نکاح' طلاق' وکالت' وصیت وغیرہ۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: "وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى" [البقرہ:۲۸۲] "اور گواہ کرلو دو گواہوں کو مردوں میں سے۔ پس اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان میں سے کہ پسند کرتے ہو تم گواہوں میں سے۔ اگر ہو یہ کہ بھول جاوے ایک ان میں سے پس یاد دلاوے ایک ان دو میں سے دوسری کو۔"

(۴) ولادت وبکارت اور عورتوں کے ان عیوب کے متعلق گواہی دینا جن پر عورتیں ہی مطلع ہوسکتی ہیں:

ایسے امور میں ایک عورت کی گواہی بھی مقبول ہوگی۔ اس کی دلیل امام زہری کی روایت ہے کہ جس میں وہ فرماتے ہیں: ولادت وغیرہ امور میں ایک عورت کی گواہی کے جواز کی سنت جاری ہے[1]۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں۔ صرف عورتوں کی گواہی مقبول نہیں مگر ان امور میں صرف عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی جن کی اطلاع مردوں کو نہیں ہوتی مثلاً حمل حیض وغیرہ اور دیگر امور[2]۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے پیدائش کے وقت بچے کی آواز نکالنے اور زندہ پیدا ہونے کے سلسلے میں ایک عورت کی گواہی کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو مقبول مانا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے راجح قول کے مطابق ایک عورت کی گواہی سے ایسا بچہ میراث کا مستحق ہوگا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان امور کے متعلق چار عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی جن سے صرف عورتیں ہی مطلع ہوسکتی ہیں مرد نہیں ہوسکتے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس مسئلہ میں حضرات حنفیہ کے مطابق ہے۔ رضاعت کی گواہی میں دو مردوں کی گواہی مقبول ہوگی یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس سے مرد بھی مطلع ہوسکتے ہیں کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ذی رحم محرم کیلئے عورت کے پستان کی طرف دیکھنا جائز ہے لہذا وہ دودھ پلانے کے عمل کو دیکھ سکتا ہے۔

---

۱ نصب الرایہ ج ۴ ص ۸۰ ۲ نصب الرایہ ج ۴ ص ۸۰

گواہی کے صحیح ہونے کی شرائط:

گواہی کے صحیح ہونے کی چار شرطیں ہیں۔(۱) گواہوں کا عادل ہونا۔(۲) شہادت کے الفاظ سے گواہی دینا۔(۳) آزاد ہونا۔(۴) مسلمان ہونا۔

(۱) گواہی کی پہلی شرط گواہوں کا عادل ہونا ہے خواہ حدود وقصاص کا معاملہ ہو یا دوسرے حقوق کا۔ارشاد خداوندی ہے:"وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ" [الطلاق:۲] "اپنے میں سے عادل لوگوں کو گواہ بناؤ"۔دوسری جگہ ارشاد ہے:"فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ" [البقرہ:۲۸۲] "پس اگر نہ ہوں دو مرد پس ایک مرد اور دو عورتیں ان میں سے کہ پسند کرتے ہو تم گواہوں میں سے۔"

فاسق کی گواہی مقبول نہیں ہے کیونکہ حاکم یا قاضی گواہوں کی گواہی پر اعتماد کر کے فیصلہ کرتا ہے اور حکم کو نافذ کرتا ہے پس ضروری ہے کہ حاکم کے ذہن میں اس فیصلے کے درست ہونے کا غالب گمان ہو۔اور ایسا گواہوں کے عادل ہونے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اور عدل کی بہترین تفسیر یہ ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچنے والا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہ ہو اور اس کے اندر اصلاح کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہو۔بعض نے عادل کی تفسیر یوں کی ہے کہ اس کے پیٹ اور شرم گاہ کے متعلق کوئی شخص اس پر انگلی نہ اٹھا سکتا ہو یعنی اس پر حرام خوری اور حرام کاری کا الزام نہ لگا سکے۔جو شخص حرام خوری اور حرام کاری سے بچ گیا اس کے ملحقات سے بھی بچ سکتا ہے۔

(۲) گواہی کے صحیح ہونے کی دوسری شرط گواہی کی ادائیگی "شہادت" کے الفاظ کے ساتھ ہو اس کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے۔"وَاسْتَشْهِدُوْا" یہ طلب شہادت میں صریح ہے۔لہٰذا گواہ کیلئے شہادت کے الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے۔چنانچہ گواہ اگر شہادت کے الفاظ استعمال نہ کرے اور یوں کہہ دے کہ مجھے یقین ہے کہ معاملہ ایسا ہے یا کہہ دے کہ اس معاملے کو میں جانتا ہوں تو یہ گواہی مقبول نہیں ہوگی۔اسی طرح دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ" [النور:۶] "پس گواہی ایک کی ان میں سے چار بار گواہیاں"۔

(۳) صحت شہادت کی تیسری شرط حریت و آزادی ہے کیونکہ شہادت دراصل دوسروں پر کچھ لازم کرنے کا نام ہے۔جبکہ غلام خود اپنے نفس کا مالک نہیں تو دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے۔

(۴) صحت شہادت کی چوتھی شرط مسلمان ہونا ہے اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ ''وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا'' [النساء:۱۴۱] ''اور ہرگز نہ کرے گا اللہ واسطے کافروں کے اوپر مسلمانوں کے راہ۔''

کیا حاکم اور قاضی گواہوں کے عادل ہونے کے متعلق کچھ دریافت کرسکتا ہے:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: قاضی گواہ کے ظاہری اسلام کی بنیاد پر بھروسہ کرے گا اس کی عدالت کے متعلق نہیں پوچھے گا۔ الا یہ کہ مدمقابل اس پر جرح کرے تو اس کے متعلق دریافت کرے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا تھا'' تمام مسلمان عادل ہیں (ان کی گواہی مقبول ہے)۔ الا یہ کہ وہ محدود فی القذف (تہمت لگانے کی بناء پر حد یافتہ) ہو یا جھوٹی گواہی دینے کا عادی ہو یا قریبی رشتے دار ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی پوشیدہ اور باطنی معاملات کو جانتا ہے[1]

ایک مسلمان کے اندر عدالت و پرہیزگاری ہی اصل ہے اور فسق ایک امر عارض ہے جو درجہ گمان میں ہوتا ہے پس اصل کو محض گمان کی بناء پر ترک نہیں کیا جائے گا۔ البتہ قاضی حدود وقصاص کی گواہی کے متعلق گواہوں سے پوچھ گچھ کرسکتا ہے اگرچہ اس کا مدمقابل ان پر طعن نہ بھی کرے کیونکہ حاکم حد دور کرنے کیلئے کوئی تدبیر کرتا ہے اور اس بارے میں ایک گواہ کا تذکرہ ہونا کافی ہوگا۔ زنا کی گواہی کیلئے بھی چاروں گواہوں کا تذکرہ ہونا ضروری ہے۔

حضرت امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں۔ قاضی حدود وقصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی گواہوں کی تنقیح کرسکتا ہے۔ ان کی عدالت کے متعلق سوال کرسکتا ہے کیونکہ صحیح فیصلے کرنے کیلئے اسے محتاط ہونا چاہیے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ جب گواہوں کے متعلق مکمل معلومات سے حاصل ہوں۔ ظاہری طور پر بھی اور خفیہ طور پر بھی اور فتویٰ بھی صاحبینؒ کے قول پر ہے کیونکہ فی زمانہ جھوٹ کی کثرت ہے۔ حضرات صاحبینؒ کے دور میں جھوٹ بولنے کا رواج ہوگیا تھا اس لیے انہیں ضرورت پڑی کے گواہی کی خوب چھان بین کریں۔ حضرت امام صاحبؒ کے دور میں جھوٹ بولنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہ تھی۔ اگر امام صاحب صاحبین کے زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی یہ فتویٰ دیتے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حاکم پر لازم ہے کہ وہ گواہوں

---

[1] دارقطنی ج ص ۲۰۷

کے متعلق ہر چھ مہینے کے بعد خفیہ معلومات حاصل کرتا رہے کیونکہ بعض دفعہ اتنے عرصہ میں انسان پر ایسی حالت آجاتی ہے کہ جس کی وجہ سے گواہی کی اہلیت سے محروم بھی ہو جاتا ہے۔

گواہ بننا:

گواہ بننے کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت وہ ہے کہ جس کا حکم بنفسہ ثابت ہوتا ہے دوسری صورت وہ کہ جس کا حکم بنفسہ ثابت نہیں ہوتا ہے۔

حکم کے بنفسہ ثابت ہونے کی مثال بیع' اقرار' غصب اور قتل وغیرہ ہے جو از قبیل حقوق و عقود ہوں چنانچہ جو کچھ اس نے سنا اس کی گواہی دے جبکہ معاملہ کا تعلق سننے سے ہو۔ جیسے بیع' اور اقرار وغیرہ۔ اگر معاملہ کا تعلق دیکھنے سے ہو تو جو کچھ اس نے دیکھا ہے اس کی گواہی دے مثلاً غصب' قتل وغیرہ۔ گواہ دیکھے اور سنے بغیر گواہی نہ دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''اما انت یا ابن عباس فلا تشهد الا علی امر یضیئ لک کضیاء هذه الشمس''[1] ''حضور ﷺ نے سورج کی طرف اشارہ کر کے فرمایا'' اے ابن عباس! جب تک کوئی معاملہ اس سورج کی روشنی کی طرح تیرے سامنے واضح نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق گواہی نہ دے۔''

گواہی دیتے وقت یوں کہے ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اس نے فروخت کیا ہے' اگر بیع کا معاملہ اپنے سامنے ہوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ پردے کے پیچھے (ایجاب وقبول) کو سنا تو اس کیلئے وقوع بیع کی گواہی دینا جائز نہیں ہے۔ اگر چہ واقعہ کی پوری تفصیل بھی قاضی کے سامنے بیان کردے تب بھی قاضی کیلئے اس کو قبول کرنا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ آوازیں ایک دوسری کے مشابہ ہو سکتی ہیں لیکن اگر معاملہ سننے کے بعد گھر میں داخل ہو جائے اور اس میں متعاقدین کے علاوہ اور کوئی موجود نہ ہو اور اس کو شہادت کے الفاظ سے تعبیر کر کے گواہی دے تو قبول ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں اس کو یقین حاصل ہو گیا کہ متعاقدین یہی ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر گواہ پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں اور ایک شخص دوسرے کیلئے مال کا اقرار کرے تو ان گواہوں کی گواہی قبول ہو گی بشرطیکہ یہ اقرار کرنے والے کے چہرے کو پہچانتے ہوں۔ اور اگر چہرہ دیکھے بغیر محض اس کی آواز کو سنا ہو تو پھر ان کیلئے گواہی دینا جائز نہیں ہو گا۔ الا یہ کہ انہیں یقین ہو کہ گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے تو پھر گواہی دینا جائز ہو گا۔

---

1. (سنن بیہقی: ۱۰/۱۵۶)

وہ گواہی جس سے حکم بنفسہ ثابت نہیں ہوتا اس کی مثال شہادت علی الشہادت ہے۔ اس گواہی سے حکم بنفسہ ثابت نہیں ہوتا البتہ عدالت میں اسے نقل کرنا درست ہے۔ کسی گواہ کو گواہی دیتے ہوئے سن کر اس پر گواہی دینا جائز نہیں ہے کیونکہ نیابت موجود نہیں ہے لیکن اگر وہ اس کو اس گواہی پر گواہ بنائے اور اسے گواہی دینے کو کہہ دے تو یہ اس کا نائب ہو گا تب اس کے لیے گواہی دینا جائز ہو گا۔ گواہ کو چاہیے کہ جب تک اسے واقعہ پوری طرح یاد نہ ہو اس کی گواہی نہ دے۔ قاری اور راوی حدیث کا بھی امام صاحب کے نزدیک یہی حکم ہے کیونکہ خط دوسرے خط کے مشابہ ہو سکتا ہے۔

اگر واقعہ تحریری صورت میں اس کے پاس محفوظ ہو اور اس پر اس کے دستخط ثبت ہوں تو واقعہ یاد نہ ہونے کی صورت میں بھی گواہی دینا جائز ہے کیونکہ اس صورت میں واقعہ میں کمی بیشی کا امکان نہیں ہے۔ واقعہ کو مشاہدہ کیے بغیر گواہی دینا درست نہیں ہے اس لیے کہ شہادت مشاہدہ سے مشتق ہے لہٰذا دیکھے بغیر گواہی دینا درست نہیں ہے البتہ چند امور اس سے مستثنیٰ ہیں جن امور میں مشاہدہ کے بغیر بھی قابل اعتماد شخص کی گواہی جائز ہے۔ مثلاً نسب' موت' نکاح اور دخول وغیرہ ان اشیاء میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ان کے متعلق باوثوق (قابل اعتماد) دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں بتا دیں جن کے کہنے سے یقین ہو جائے تو گواہی دینا جائز ہو جائے گا۔ بعض علماء نے کہا کہ کسی کی موت کی خبر ایک مرد کے کہنے پر دی جا سکتی ہے البتہ ادائیگی گواہی کے الفاظ لفظ شہادت سے ہوں گے۔

گواہی پر گواہی دینا:

شہادت علی الشہادت ان تمام معاملات وحقوق میں جائز ہے جو شبہ سے ساقط نہیں ہوتے اور وہ حقوق جو شبہ سے ساقط ہوتے ہیں وہ حدود اور قصاص ہیں۔ شبہ کی وجہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے اور قصاص بھی ساقط ہو جاتا ہے اور جو حقوق شبہ کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے وہ بہت زیادہ ہیں۔ لوگوں کے حقوق کے احیاء کے پیش نظر شہادت علی شہادت کو قبول لیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ گواہ اپنی کسی مجبوری مثلاً بیماری' سفر یا موت کی وجہ سے گواہی دینے سے قاصر رہتا ہے پس اگر اس کی اجازت نہ ہو تو لوگوں کے حقوق تلف ہوں گے۔ اس کے جواز کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے' ارشاد مبارک یہ ہے: "**تسمعون ويسمع منكم ويسمع ممن سمع منكم**"[1]

مسروقؒ اور قاضی شریحؒ کہتے ہیں کہ حد میں شہادۃ علی الشہادۃ جائز نہیں ہے۔ طاؤس اور

---

[1] سنن بیہقی ۱۰ص ۲۵۰

عطاء بن ابی رباحؒ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے کہ حد میں گواہی پر گواہی جائز نہیں ہے۔[1]

ایک شخص کی گواہی پر ایک کی گواہی:

ایک گواہ پر ایک گواہ کی گواہی مقبول نہیں ہوگی کیونکہ ایک گواہ کی گواہی سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ثبوت حق کیلئے نصاب کا ہونا ضروری ہے (جو کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں) لہٰذا اس کی گواہی پر دوسروں کی گواہی ضروری ہوگی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ دو آدمیوں کی گواہی پر دو آدمیوں کی گواہی دو گواہوں کی گواہی پر دو مرد یا ایک مرد اور عورتوں کی گواہی جائز ہے کیونکہ گواہی دینا منجملہ حقوق میں سے ہے اور یہاں پر دو آدمیوں نے کسی حق پر گواہی دی پھر دوسرے حق دو نے گواہی دی ہے لہٰذا ایسی گواہی مقبول ہوگی اس لیے دو گواہوں کی دو قسم کے حقوق پر گواہی دینا جائز ہوتا ہے۔

گواہی پر گواہی دینے کے الفاظ:

گواہی پر گواہی دیتے وقت اس طرح کہے گا کہ "میں فلاں کو اپنی گواہی پر گواہ بناتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے پاس فلاں کیلئے اتنے مال کا اقرار کیا ہے" اور جس کو گواہ بنایا گیا ہو وہ گواہی دیتے وقت یوں کہے گا۔ "میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں نے اپنی شہادت (گواہی) پر مجھے گواہ بنایا ہے کہ فلاں نے فلاں کیلئے اتنے مال کا اقرار کیا ہے۔"

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ شہادت کے الفاظ آٹھ مرتبہ دہرائے اور وہ نائب یوں کہے گا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں نے اپنی شہادت (گواہی) پر مجھے شاہد (گواہ) بنایا ہے اور یہ شہادت (گواہی) دی ہے کہ فلاں نے اس کے سامنے فلاں کیلئے اتنے اتنے مال کا اقرار کیا ہے۔ میں اس کے اقرار پر شاہد (گواہ) ہوں اور مجھ سے کہا ہے کہ تم میری شہادت (گواہی) پر شاہد (گواہ) رہو اور میں اس کی شہادت (گواہی) دیتا ہوں۔"

صاحب "الدر" نے کہا ہے کہ مختصر الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتا ہے کہ "میں فلاں کو فلاں واقعہ میں اپنی شہادت (گواہی) پر گواہ بناتا ہوں" اور دوسرا گواہی دیتے وقت یوں کہے کہ "میں فلاں کی فلاں شہادت پر گواہ ہوں۔" مگر اس دوسرے گواہ کی گواہی تبھی مقبول ہوگی جب اصل گواہ کا عدالت میں حاضر ہونا دشوار ہوگیا ہو اور یہ دشواری موت، مرض یا سفر کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ اصل کی عدم موجودگی کی صورت میں فرع (نائب) کی گواہی قبول ہوگی۔ اصل گواہ کی بیماری ایسی ہو کہ جس

[1] بیہقی ج ۱۰ ص ۲۵۱

کی وجہ سے وہ عدالت میں حاضر نہ ہوسکتا ہو اور سفر سے بھی وہ سفر مراد ہے جس سے شرعی احکام تبدیل ہوتے ہوں اور اگر اصل گواہ گواہی دینے سے بلاوجہ انکار کرے تو نائب کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔

گواہوں کا تعارف مکمل کیسے ہوگا:

گواہ کا تعارف باپ، دادا اور اس کے خاص قبیلہ کے ذکر سے مکمل ہو جاتا ہے۔ عام قبیلے کو ذکر کرنے سے تعارف کامل نہیں ہوتا کیونکہ عام قبیلہ بہت سارے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے خاص قبیلے کا ذکر تعارف کامل کیلئے ضروری ہے۔ اسی طرح باپ دادا کے نام ذکر کرنا بھی ضروری ہے اس لیے کہ عام طور پر لوگوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن انسان اور اس کے باپ اور دادے کے ناموں میں اشتراک بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے دادے کے نام سے کامل تعارف ہوسکتا ہے۔ صرف شہر یا پیشے کی طرف منسوب کرنا ناقص تعارف ہے جب تک باپ دادے اور قبیلے کے اسماء ذکر نہ کیے جائیں۔ اصل گواہوں کی طرح نائب گواہوں کی تعدیل اور ان کا تزکیہ (یعنی ان کے متعلق مکمل چھان بین) بھی ضروری ہے۔

گواہی کا دعویٰ کے مطابق اور مخالف ہونے کے اثرات:

گواہی کا دعویٰ کے مطابق ہونا ضروری ہے لفظاً بھی موافق ہو اور معنی بھی۔ گواہی کا صرف معنی کے لحاظ سے موافق دعویٰ ہونا بھی معتبر ہے۔ دعویٰ سے قبل کی گواہی معتبر نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر گواہی اور دعویٰ میں عدم مطابقت پائی جائے وہ بھی قابل قبول نہیں ہے۔ دو گواہوں کی گواہی آپس میں مختلف ہو تو اس کا بھی اعتبار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک گواہ نے ایک ہزار اور دوسرے نے دو ہزار کی گواہی دی تو یہ گواہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کی گواہیوں میں لفظی اختلاف پایا جاتا ہے جو معنوی اختلاف پر دلالت کرتا ہے۔ کیوں کہ ایک ہزار کا مفہوم دو ہزار کے مفہوم کے مخالف ہے۔ اور حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں ایک ہزار میں ان کی گواہی قبول کی جائے گی۔ یہی حکم ہوگا جب ایک نے پندرہ سو اور دوسرے نے ایک ہزار کی گواہی دی ہو۔ ایک طلاق اور دو طلاقوں کا حکم اسی اختلاف پر مبنی ہے لیکن اگر مذکورہ مسائل میں وہ مدعی کم کے وجوب کا دعویٰ کرے تو ان تمام مسائل میں گواہی مقبول نہ ہوگی۔ کیونکہ مدعی اس طرح ایک گواہ کو جھٹلا رہا ہے۔

اگر دو گواہ ایک گائے کے چوری ہونے کی گواہی دیں اور اس کا رنگ بتانے میں اختلاف کریں تو یہ گواہی مقبول ہوگی ان کی گواہی سے چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن اگر مادہ اور نر میں مختلف گواہی دیں تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔ یہ قول امام صاحب کا ہے جبکہ صاحبینؒ دونوں مسئلوں میں

ہاتھ نہ کاٹنے کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ گواہوں کے مختلف بیانات سے شبہ پیدا ہوگیا اور حدود وشبہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ امام صاحب ؒ کی دلیل یہ ہے کہ ایک گائے کے دو رنگوں کی ہو سکتی ہے ہر ایک نے جو رنگ دیکھا اس کی گواہی دے دی۔ نر اور مادہ کی گواہی اس کے خلاف ہے کیونکہ ایک گائے میں یہ دونوں صفات جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

مثال: دو گواہوں میں سے ایک نے گواہی دی کہ زید کو عید کے دن مکہ میں قتل کر دیا گیا دوسرے نے گواہی دی کہ زید کو عید کے دن مدینہ میں قتل کر دیا گیا تو یہ گواہی رد کی دی جائے گی کیونکہ ان میں سے ایک کا جھوٹا ہونا یقینی ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ کون جھوٹا ہے لہٰذا دونوں مشکوک ہو گئے لہٰذا دونوں کی گواہی قابل رد ہوگی۔ ایک نے پہلے گواہی دی جس کی بنیاد پر فیصلہ دے دیا گیا پھر دوسرے نے آ کر اس کے خلاف گواہی دی تو دوسرے کی گواہی رد کی جائے گی کیونکہ پہلی گواہی کو فیصلے میں ترجیح حاصل ہوگئی ہے۔

گواہوں پر جرح:

مدعی علیہ اگر مدعی کے گواہوں پر جرح کرے اور کہہ دے کہ یہ لوگ گواہی کے اہل نہیں بلکہ فاسق ہیں اور اپنے دعوے پر گواہ بھی لائے تو قاضی اس کی طرف التفات نہیں کرے گا اور اس کا فیصلہ نہیں کرے گا بلکہ اپنے طور پر خفیہ اور علانیہ گواہوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گا۔ اگر قاضی کی اپنی تحقیق اور چھان بین سے گواہوں کا اہل ہونا ثابت ہو گیا تو ان کی گواہی کو قبول کر کے فیصلہ دے گا اور اگر وہ گواہی کی اہلیت سے محروم ثابت ہوئے تو ان کی گواہی رد کر دے گا۔

جھوٹی گواہی دینے والے کا حکم:

امام ابوحنیفہ ؒ نے فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینے والے کو اس کے علاقے اور اس کے بازار میں مشتہر کیا جائے گا کہ یہ شخص جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ تم لوگ اس سے بچتے رہو اور دوسروں کو بھی اس سے بچاؤ۔ حضرت قاضی شریح ؒ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ وہ جھوٹی گواہی دینے والے کو بازار میں لے جاتے اور لوگوں کو جمع کر کے لوگوں کو اس کے متعلق بتاتے کہ یہ شخص جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ جھوٹی گواہی دینے والا مرد ہو یا عورت اس کی یہی سزا ہے۔ البتہ اس کو مار کر متنبہ نہیں کیا جائے گا مقصود تنبیہ ہے اور یہ مقصد مذکورہ عمل سے حاصل ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ مار سے بھی زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے۔

سوال: اگر جھوٹی گواہی دینے والا توبہ کر لے تو کیا اس کی گواہی کسی معاملے میں مقبول ہوگی؟

جواب: اس کے دو جواب ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ وہ جھوٹی گواہی فاسق ہونے کی وجہ سے دی تھی اور پھر فسق سے توبہ کر لی تو اس کی گواہی کو قبول کر لیا جائے گا کیونکہ توبہ کی وجہ سے فسق جاتا رہا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ مستور الحال ہے یعنی اس کے فاسق ہونے اور نہ ہونے کا علم نہیں ہے تو فیصلوں میں اس کی گواہی ہرگز مقبول نہیں ہوگی۔ امام یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک توبہ کے بعد اس کی گواہی کو قبول کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول فتویٰ پر ہے۔

جھوٹی گواہی دینے والے کو بازار میں مشہور کرنے کی سزا جب دی جائے گی جب اس نے جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دی ہو اور اس کا جھوٹ گواہوں سے واضح ہو جائے۔ اگر غلطی سے غلط بیانی کی تو اس کو مذکورہ سزا نہیں دی جائے گی۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جھوٹی گواہی دینے والے کو مارنے اور قید کرنے کی سزا دینا بھی درست ہے تا کہ وہ اپنی غلطی سے توبہ کر لے جب کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مارنے اور قید کرنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

کن لوگوں کی گواہی قبول نہیں ہوگی؟:

(۱) نابینے کی گواہی قبول نہیں ہوگی اسی طرح نابینا شخص کو قاضی بنانا بھی درست نہیں ہے کیونکہ گواہی دیتے وقت اشخاص کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ نابینا شخص جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے یا جس کے خلاف گواہی دے رہا ہے ان دونوں کے درمیان امتیاز کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ تو صرف آوازوں کے ذریعے سے پہچان سکتا ہے جبکہ آوازیں ایک دوسری کے مشابہ ہو سکتی ہیں۔ اگر گواہی دینے کے بعد فیصلے سے قبل نابینا ہو گیا تب بھی امام اعظم اور امام محمد کے نزدیک اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ فیصلے کے وقت گواہی کی اہلیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ ایسا ہی ہو گیا جیسے گواہ فیصلہ سے پہلے گونگا یا مجنون یا فاسق ہو جائے تو گواہی باطل ہو جاتی ہے۔

(۲) محدود فی القذف (تہمت لگانے کی وجہ سے سزا یافتہ) کی گواہی قبول نہیں ہوگی اگرچہ توبہ بھی کر لے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ''وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا'' (النور ۴) اور مت قبول کرو ان کی شہادت کبھی بھی''۔ اور ''اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا'' (البقرہ ۱۶۰) میں استثناء کا تعلق ''وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' (النور ۴) سے ہے۔

(۳) والد کی گواہی بیٹے کیلئے قبول نہیں ہوگی اسی طرح دادے پڑدادے کی گواہی پوتے پڑپوتے کیلئے قبول نہیں ہوگی بیٹے پوتے اور پڑپوتے کی گواہی باپ دادے اور پڑدادے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ منافع اولاد اور آباؤ اجداد کے مابین متصل اور مشترک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اپنی زکوۃ ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے یعنی اصول (آباؤ اجداد) فروع (اولاد) کو اور فروع اصول کو زکوۃ نہیں دے سکتے۔ رضاعی بیٹے کی گواہی رضاعی باپ کے حق میں اور رضاعی باپ کی گواہی رضاعی بیٹے کے حق میں قبول کی جائے گی۔ کیونکہ منافع ان کے درمیان مشترک و متصل نہیں ہیں۔

اولاد آباؤ اجداد کے اجزاء ہیں اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''فاطمة بضعة مني' فمن اغضبها فقد اغضبني ''[1] ''فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا''۔ یعلی بن منبہ الثقفی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ حضور ﷺ تک پہنچنے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے حضور اقدس ﷺ نے ان کو گلے لگا کر فرمایا: ''ان الولد منجنة مجبنة محزنة''[2] ''اولاد بخل' بزدلی اور حزن کا سبب ہوتی ہے''۔ جب بیٹا باپ کا جزو قرار پایا تو فطری بات ہے کہ باپ بیٹے پر مہربان ہوتا ہے اور بیٹا باپ پر لہٰذا ان کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

(۴) میاں بیوی کی گواہی بھی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ ان کے فوائد و منافع ایک ہیں گویا یہ گواہی خود اپنے حق میں دینے کے مترادف ہے۔

(۵) ایک شریک کی گواہی' شراکت کے معاملات میں دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوگی۔ شراکت کے معاملے کے علاوہ دوسرے امور میں ایک دوسرے کیلئے ان کی گواہی مردود نہیں ہوگی کیونکہ اس میں تہمت کا اندیشہ نہیں ہے۔ اسی طرح تعصب پھیلانے والے کی گواہی' بھی قبول نہیں ہوتی کیونکہ اس نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے تعصب کے حرام ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف کیسے ہوسکتا؟ جبکہ ارشاد خداوندی ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' [الحجرات:۱۰]

امام عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں اور باپ کی بیٹے کیلئے قبول نہیں ہوگی نہ ہی بیوی کی گواہی اپنے شوہر کیلئے

---

[1] [صحیح: ۳۷۱۴] [2] [سنن البیہقی: ۱۰/۲۰۲]

اور شوہر کی بیوی کے حق میں قبول ہوں اسی طرح دو شریکوں کی گواہی شراکت کے معاملے میں ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کی جائے گی نہ ہی اجیر گواہی اپنے مستاجر کے حق میں اور غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قبول ہوگی۔

(۶) نوحہ کرنے والی عورت کی گواہی بھی نامقبول ہے گانا گانے والی اور اسی طرح شاعر جو اپنے اشعار میں لوگوں کی جھوٹی تعریف کرتا ہو ان کی گواہی بھی قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ جھوٹی تعریف کرنا شرعی لحاظ سے غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی تعریف کی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ویحک قطعت عنق صاحبک" "تیرا ناس ہو تو نے اپنے صاحب کی گردن کاٹ دی" ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ الفاظ بار بار دہراتے رہے پھر فرمایا کہ اگر تعریف کرنا ہی ہے تو یوں کہیے کہ میرے خیال میں وہ ایسا ایسا ہے۔[1]

شاعر اپنے اشعار کے ذریعے کسی کی تعریف کرنا چاہے تو ان صفات سے تعریف کرے جو موصوف کے اندر واقعی موجود ہوں۔ اگر جھوٹی تعریف کرے گا تو وہ مردود الشہادۃ ہوگا کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "آیۃ المنافق ثلاث اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان"[2] "منافق کی تین علامتیں ہیں اگر بولے تو جھوٹ بولے اگر وعدہ کرے تو وعدہ کی خلاف ورزی کرے اور اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے"۔ مخنث کی گواہی بھی نامقبول ہے کیونکہ خود کو عورت جیسا بنانے والا فاسق ہے لیکن اگر اس کی آواز میں قدرتی طور پر نرمی ہو اور اعضا بھی خلقۃً کمزور ہوں تو وہ مردود الشہادۃ نہیں ہوگا بلکہ اس کی شہادت قبول ہوگی گانے والی بھی مردود الشہادۃ ہے کیونکہ اس نے آواز بلند کر کے فسق کا ظہور کیا ہے۔ اور فاسق بھی مردود الشہادۃ ہوتا ہے۔

پیشہ ور نوحہ کناں جو کسی کے مرنے پر اس لیے روتا ہے کہ لوگ رونے پر اس کو کوئی چیز پیش کریں گے وہ بھی اس کے مثل ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے دیکھا کہ وہ جان کنی کے عالم میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی گود میں بٹھایا اور رونے لگے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ نے رونے سے منع نہیں فرمایا تھا؟ فرمایا: نہیں لیکن میں نے دو فاجر احمقوں کی آوازوں سے منع کیا تھا ایک وہ آواز جو مصیبت کے وقت چہرہ نوچ کر گریبان پھاڑ کر اور شیطان کی طرح چیخ چیخ کر ہو۔[3]

---

[1] بخاری ۲۹۷ | [2] بخاری ۱۳۹۳ | [3] ترمذی ج۳ ص ۳۳۷

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم کہتے ہیں کہ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "لیکونن فی امتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف۔ الحدیث"[1] "میری امت میں ایسے لوگ ضرور آئیں گے جو نوحہ کرنے، ریشم پہننے اور شراب پینے اور آلات موسیقی کو حلال سمجھیں گے"۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور فرمایا: "ان ربی حرم علی الخمر والمیسر والکوبة والقنین" "بے شک میرے رب نے مجھ پر شراب اور جوئے کو اور ڈھول بجانے اور دف کو حرام قرار دیا ہے"۔

نافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عمر نے بانسری کی آواز سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور فرمایا: ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ آپ نے اسی طرح کی آواز سن کر اسی طرح کیا تھا جس طرح میں نے کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دف حرام ہے، گانا باجے اور ڈھول بجانا حرام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" [المائدہ:۹۰] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! سوائے اس کے نہیں کہ شراب اور جوا اور تھان بتوں کے اور تیر فال کے ناپاک ہیں کام شیطان کے۔ پس بچو اس سے تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے باطل کو مٹا دے اس کے ذریعے لہو و لعب کو باطل قرار دے ڈھول، باجے، گانے اور دف کو حرام قرار دے۔ ایک روایت میں مزید ہے کہ (اس حق کے ذریعے) تصاویر، شعر و شاعری اور شراب کو حرام فرما دے۔ جس نے ان چیزوں کو چکھا اس کیلئے سخت وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جس نے اس کو پیا قیامت کے دن میں اس کو ضرور پیاسا رکھوں گا اور جس نے اس کو حرام جان کر اس سے احتراز و اجتناب کیا تو اس کو جنت کے حوض سے پلاؤں گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں گانا بجانا دل میں منافقت کی ایسی آبیاری کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو تقویت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں ایمان کو اس طرح پیدا کرتی ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔

اس آیت کریمہ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ" [لقمان:۶] کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا: "لهو الحدیث" سے مراد گانا اور اس جیسی چیزیں

[1] [بخاری:۵۵۹۰] [2] [بیہقی ۱۰ص۲۲۲]

گیا۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "لھو الحدیث" خریدنے سے مراد گانے بجانے والوں کو پیسہ دے کر ان سے گانا بجانے کا عمل کرانا ہے چنانچہ گانا گانا اور اس کو سننا سب حرام اور باطل ہیں۔[1]

(۷) شراب خور کی گواہی بھی مردود ہے کیونکہ شراب خوری فسق ہے اور فاسق گواہی کی اہلیت سے محروم ہے اسی طرح فاسق کی گواہی بھی مردود ہے۔ البتہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص تنہائی میں وحشت کو دور کرنے اور اپنے دل کو بہلانے کیلئے گانا گائے تو کوئی گناہ نہیں ہے جب تک کہ گانے میں عورت کی صفات اور حرام باتیں شامل نہ ہوں۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گن گنا رہے ہیں اور بڑے ترنم کے ساتھ کچھ گا رہے ہیں۔ حضرت ابن عوف نے گھر کے دروازے پر دستک دی حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور فرمایا: عبدالرحمٰن تم نے میری آواز کو سنا؟ فرمایا جی ہاں! میں نے آپ کی آواز کو سنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم تنہائی میں اشعار پڑھا کرتے تھے تمہیں یاد ہے کہ ہم کیا پڑھا کرتے تھے؟ عبدالرحمٰن نے کہا کہ نہیں فرمایا میں تو یہ کہا کرتا تھا:

لم یبق من شرف العلاء الا التعرض للخیوف

فلا زمین بمھجتی بین الاسنة والسیوف

(۸) گناہ کبیرہ کا مرتکب بھی گواہی کا اہل نہیں ہے۔ گناہ کبیرہ وہ جرم گنا ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہو اور اس کے ارتکاب پر سزا مقرر ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کبائر کل سات ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا' والدین کی نافرمانی کرنا' ناحق قتل کرنا' یتیم کے مال کو ظلماً کھانا' سود کھانا' پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا' جھوٹی قسم کھانا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا گناہ کبیرہ نو ہیں مذکورہ سات کے علاوہ ایک ہے جھوٹی گواہی دینا اور دوسرا ہے زنا کرنا یا جھوٹی گواہی دینا یا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کبائر کی تعداد کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا وہ تقریباً ستر تک پہنچتے ہیں۔ بعض حضرات کی رائے کے مطابق وہ سترہ ہیں ان میں سے چار کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انکار' اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اصرار کرنا' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا' اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونا۔ اور چار کا تعلق زبان سے ہے اور وہ یہ ہیں زبان سے کفریہ الفاظ بکنا' جھوٹی گواہی دینا' پاک دامن عورت پر تہمت لگانا اور جھوٹی قسم کھانا۔ تین کا تعلق پیٹ سے ہے اور وہ

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۲۵

یہ ہیں: سود کھانا' یتیم کے مال کو ناحق طریقے سے کھانا اور شراب پینا اور دو کا تعلق شرم گاہ سے ہے اور وہ یہ ہیں: زنا کرنا اور لواطت کرنا۔ اور دو کا تعلق ہاتھ کے ساتھ ہے قتل کرنا اور چوری کرنا۔ اور ایک کا تعلق پاؤں کے ساتھ ہے اور وہ ہے میدان جنگ سے بھاگ نکلنا۔ ایک کا تعلق پورے بدن اور جسم سے ہے اور وہ ہے والدین کی نافرمانی۔ اسی طرح جادو کرنا' بلاوجہ گواہی کو چھپانا' بلاعذر رمضان میں روزے نہ رکھنا' رشتہ داروں کے ساتھ قطع رحمی کرنا' جان بوجھ کر نماز کر ترک کرنا' زکوۃ نہ دینا' قرآن کریم کو یاد کر کے بھلا دینا' حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنا' ناپ تول میں کمی بیشی کرنا' رشوت وصول کرنا' کسی مسلمان کو ناحق مارنا' بیوی کا بلاوجہ اپنے شوہر کو اپنے اوپر قابو نہ دینا' مردار کھانا' اضطراری حالت کے علاوہ خنزیر کا گوشت کھانا' حالت حیض میں بیوی کے ساتھ جماع کرنا' غیبت کرنا' چغلی کھانا' جھوٹ بولنا' نوحہ کرنا' حسد کرنا' تکبر کرنا' استطاعت وقدرت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرنا' غربت کے خوف سے اولاد کو قتل کرنا اور وصیت کے معاملہ میں ظلم کرنا اور مسلمانوں کی تحقیر کرنا یہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر وہ گناہ جس پر اللہ تعالیٰ کی وعید سنائی ہے وہ کبیرہ ہے۔

گناہ صغیرہ یہ ہیں: غیر محرم کی طرف دیکھنا' اس کو چھونا' بوسہ دینا' ایک مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا' مسجد میں خرید وفروخت کرنا' نماز میں فضول حرکتیں کرنا' جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کیلئے صفیں پھلاندنا' خطبہ جمعہ کے وقت گفتگو کرنا' قبلہ کی طرف رخ کر کے بول وبراز کرنا' مسلمانوں کی گذرگاہ میں پاخانہ کرنا' مشت زنی کرنا' غیر محرم کے ساتھ خلوت نشینی کرنا' عورت کا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا' غبن کرنا' کسی کے خرید وفروخت کے معاملہ میں دخل اندازی کرنا' ذخیرہ اندوزی کرنا' عیب دار چیز عیب بتائے بغیر فروخت کرنا' کسی کے منگیتر کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کرنا' اکڑ کر چلنا' اوقات مکروہ میں نماز پڑھنا' غیبت سننا اور اس میں خاموش رہنا' ظہار والی بیوی کے ساتھ کفارہ ادا کرنے سے پہلے ہم بستری کرنا' تنبیہ: جان لیجئے صغیرہ پر اصرار اور اس کو بار بار کرنے سے وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔

(۹) حرام خور کی شہادت مردود ہے کیونکہ حرام خوری اور سود رشوت وغیرہ بھی فسق ہے اور فاسق مردود الشہادۃ ہے۔

(۱۰) چوسر لڈو کھیلنے والے کی گواہی بھی مقبول نہیں ہے کیونکہ علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے ''من لعب بالنرد فکانما صبغ یدہ فی لحم خنزیر و

دمہ [۱] ''جو نرد کھیل کھیلے گویا اس نے اپنے ہاتھ کو خنزیر کے گوشت اور خون سے ملوث کیا''۔
اسی طرح جو شخص نرد، چوسر، تاش وغیرہ کے ذریعے جوا بازی کرتا ہو وہ بھی مردود الشہادۃ ہے کیونکہ جوا حرام ہے اور حرام کا مرتکب فاسق ہے اور فاسق کی گواہی مردود ہے۔ اگر شطرنج اور دوسرے کھیل بغیر جوئے بازی کھیلے اور اس میں فحش گوئی اور ترک نماز نہ ہوتی ہو تو مردود الشہادۃ نہیں ہوگا اور مذکورہ امور کے ساتھ شطرنج کھیلنا گواہی کی اہلیت سے محروم کر دیتا ہے اسی طرح ہر وہ عمل جو نماز سے غافل کر دے وہ ممنوع ہے اور جوا ہے۔ قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو عمل بھی یاد الٰہی اور نماز سے غافل کر دے وہ جوا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اصدق كلمة قالها الشاعر كلمة لبيد الا كل شئي ماخلا الله باطل''[۲]
''سب سے سچی بات جو شاعر نے کہی ہے وہ لبید (شاعر) کا یہ قول ہے: سنو! اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا سب کچھ ختم ہونے والا ہے''۔

(۱۱) اس طرح ناپسندیدہ افعال کے مرتکب شخص کی گواہی بھی مقبول نہیں ہے۔ مثلاً لوگوں کے سامنے بغیر پردے کے بول و براز کرنا، صرف شلوار پہن کر راستے میں چلنا، اسی طرح ہر وہ فعل جو مروت کے خلاف ہو جائز نہیں ہے۔ جیسے کوئی گالی گلوچ کا عادی ہو۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ائذنوا له فبئس ابن العشيرة'' ''اسے اندر آنے کی اجازت دو یہ شخص اپنے قبیلہ کا برا آدمی ہے''۔ جب وہ حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ نرم انداز میں گفتگو فرمائی، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس کے متعلق کچھ اور فرمایا تھا مگر اب اس کے ساتھ گفتگو میں نرم انداز اختیار فرمایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا عائشہ! ''ان شرالناس منزلة عند الله يوم القيامة من ودعه او تركه الناس اتقاء فحشه''[۳] ''عائشہ! قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین درجہ والا وہ ہوگا جس کی فحش گوئی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں''۔

(۱۲) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کو گالی دینے والا بھی مردود الشہادۃ ہے۔ اسی طرح اعراض کرتے ہوئے نماز جمعہ ترک کرنے والا بھی گواہی کا اہل نہیں ہے کیونکہ بلا عذر جمعہ کی نماز ترک کرنا فسق ہے اور فاسق کی گواہی قبول نہیں ہوتی، اسی طرح زکوٰۃ نہ دینے والے کی گواہی بھی مقبول نہیں ہوگی، اسی طرح جھوٹ بولنے کا عادی شخص بھی مردود الشہادۃ ہے لیکن

---

[۱] مسلم ج۲ ص۲۴۰ [۲] صحیح بخاری: ۱۳۰۳ [۳] مسلم ج۲ ص۳۲۰

اگر جھوٹ بولنے کا عادی نہ ہو بلکہ اس نے کسی وجہ سے جھوٹ بولا ہو اور بھلائی اس کے اندر غالب ہو تو گواہی اس کی مقبول ہوگی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید کے وزیر نے قاضی ابو یوسف کے پاس حاضر ہو کر گواہی دی۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے ان کی گواہی کو قبول نہیں فرمایا۔ ہارون الرشید نے امام صاحب سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس کی گواہی قبول نہیں فرمائی' میں تو اس کے اندر خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھتا؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر وہ اپنے قول میں سچا ہے تو غلام کی گواہی غیر مقبول ہے' اگر جھوٹا ہے تو جھوٹ بولنے والا گواہی کا اہل نہیں۔

(۱۳) کبوتر بازی کرنے' اور دیگر پرندوں کے ذریعہ بازیاں لگانے والا بھی شہادت کا اہل نہیں ہے۔ ہاں پرندوں کو فروخت کرنے والا' ان سے جوانہ کھیلنے والا مردود الشہادۃ نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنے کبوتر کا پیچھا کرتے دیکھ کر فرمایا: ''شیطان یتبع شیطانا''۔[1] ''شیطان' شیطان کا پیچھا کر رہا ہے''۔

کون لوگ مقبول الشہادۃ ہیں؟:

(۱) ان شعراء کی گواہی مردود نہیں ہوگی جو لوگوں کو تکلیف پہنچانے' ان کی ہجو اور برائی بیان کرنے میں معروف نہ ہوں۔

(۲) ایک مسلمان کی گواہی دوسرے مسلمان کے حق میں مقبول ہے۔

(۳) ایک شخص کی گواہی اس کے بھائی اور اس کے چچا کے حق میں مقبول ہوگی کیونکہ بھائی بھائی اور چچا بھتیجے کے منافع جدا جدا ہوتے ہیں' اس میں تہمت کا اندیشہ نہیں ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ قاضی شریح رحمہ اللہ بھائی کی گواہی کو قبول فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھائی کی بھائی کیلئے گواہی کو صحیح اور جائز قرار دیا ہے۔[2]

(۴) ولد الزنا کی گواہی بھی مردود نہیں ہوگی۔ حضرت عطاء اور شعبی کا بھی یہی قول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''المومنون شھداء اللہ فی الارض'' ''مسلمان زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں''۔

(۵) مزاح کرنے والا جو اپنے مزاح میں حد سے تجاوز نہ کرتا ہو جو کسی کے نسب اور عزت پر حملہ نہ کرتا ہو' کسی پر تہمت نہ لگاتا ہو اس کی گواہی بھی مردود نہیں ہوگی چنانچہ حضرت عوف بن مالک

---

[1] السنن الکبریٰ ۱۰/ص ۲۱۳ [2] بیہقی ۱۰/ص ۲۰۲

اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں غزوہ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم چمڑے کے ایک خیمہ کے اندر تشریف فرما تھے' میں خیمہ کے باہر بیٹھ گیا اور سلام عرض کیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سلام کا جواب دیا' فرمایا: ''عوف اندر آجاؤ'' میں نے عرض کیا میں مکمل طور پر اندر آجاؤں یا آدھا؟ فرمایا: مکمل تو میں اندر داخل ہوا۔[1]

(۶) عید کے دن کھیل کود جائز ہے' اس دن لہو لعب کرنے والے شخص کی گواہی مردود نہیں ہوگی۔ حضرت عقبہ ابن عامر الجہنی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**کل شئی یلھو بہ الرجل باطل' الا رمی الرجل بقوسہ' وتادیبہ فرسہ' وملاعبتہ امراتہ فلھن من الحق**''[2] ''ہر وہ کھیل جو انسان کو غفلت میں ڈالے باطل ہے مگر اپنی کمان سے تیر اندازی کرنا' اپنے گھوڑے کو سدھانے کیلئے کھیلنا' اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت کرنا باطل نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے حقوق میں سے ہے''۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے' میرے پاس دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں جنگ بعاث کے متعلق اشعار گا رہی تھی اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بستر پر لیٹ گئے اور چہرہ انور کو پھیر لیا' اتنے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور مجھے ڈانٹنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شیطانی آواز؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**دعھما**'' ان کو اپنی حالت پر چھوڑ جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے ان کو اشارے سے جانے کو کہا تو وہ چلی گئیں۔

ایک مرتبہ عید کے دن سوڈان کے کچھ لوگ آلات حرب کے ساتھ کھیل رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تم انہیں دیکھنا چاہتی ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں میں دیکھنا چاہتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر دیا' میرا رخسار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک کے برابر تھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے جا رہے تھے: ''**وانکم یا بنی ارفدہ**'' حتیٰ کہ جب میں (دیکھ دیکھ کر) اکتا گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس؟ میں نے عرض کیا جی ہاں' فرمایا: تو پھر اندر چلی جاؤ۔[3]

(۷) شطرنج کھیلنے والے شخص کی گواہی بھی مردود نہیں ہوگی' بشرطیکہ'' یاد الٰہی سے غافل نہ ہو' نماز ترک نہ کرنے اور اس پر جھوٹی قسم نہ کھائے اور جوا بازی کیلئے نہ کھیلے اسی طرح تاش وغیرہ کھیلنے کی عادت نہ بنائے ایک دو مرتبہ کھیلنے سے مردود الشہادۃ نہیں ہوگا ہاں اگر عادی ہو جائے تو گواہی اس کی قبول نہیں ہوگی۔

---

[1] [بیہقی ۱۰/۲۴۸] [2] [بیہقی ۱۰/۲۱۸] [3] [بخاری ۱۸۸]

شہادت سے رجوع کرنا:

اس کا ایک رکن، ایک شرط اور ایک حکم ہے۔ اس کا رکن تو گواہ کا یہ کہنا ہے کہ میں نے اپنی گواہی سے رجوع کیا یا یہ کہا کہ میں نے جھوٹی گواہی دی تھی۔ یہ بات عدالت کے روبرو کہنا شرط ہے اور اس کا حکم اس پر قاضی کی طرف سے سزا کا مقرر کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ قاضی کے فیصلے سے پہلے رجوع کرے یا بعد میں۔ اگر گواہی مال کے متعلق ہو اور رجوع قاضی کے فیصلے کے بعد ہو تو بدنی سزا کے ساتھ مالی جرمانہ بھی اس پر ڈال دیا جائے گا۔

رجوع کے معاملے میں اصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب ہے جس کو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا کہ "سابقہ فیصلے کے متعلق اگر معلوم ہو کہ وہ غلط تھا تو اس سے رجوع کرنے میں کوئی چیز بھی تیرے لیے رکاوٹ نہ بنے تاکہ حق حقدار کو پہنچے کیونکہ حق ثابت شدہ ہے۔ باطل میں جتلا ہونے کے بجائے حق کی طرف رجوع کرنا زیادہ بہتر ہے۔"[1] گواہ کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح ہے کیونکہ جھوٹی گواہی سے رجوع کرنا باطل سے رجوع کر کے حق کی طرف آنا ہے۔ شاہد (گواہ) اپنی شہادت کے ذریعے مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی) کے مال کو ضائع کرنے کا سبب بنتا ہے۔ پس اگر بلا عوض اس کی ملکیت کو زائل کرے تو سارے مال کا ضامن ہوگا اور اگر مشہود علیہ سے اس کی ملکیت بالعوض زائل کی ہو تو اگر وہ عوض اس کے مثل ہو تو اس پر ضمان نہ ہوگا اور اگر عوض اس مال سے کم ہو جو مال اس کی شہادت (گواہی) کے سبب اس کی ملکیت سے خارج ہوا ہے تو نقصان کا ضامن ہوگا۔

شہادت سے رجوع کرنے کی شرط:

عدالت کے علاوہ دوسری جگہ رجوع کا اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ اس میں قاضی کے فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کیلئے قاضی کے روبرو کہنا ضروری ہے۔ اگر قاضی کے فیصلے سے قبل اپنی شہادت سے رجوع کر لیا تو شہادت ساقط ہوگی۔ کیونکہ حق ثابت ہی قاضی کے فیصلے سے ہوتا ہے اور قاضی کے فیصلے کی بنیاد شہادت پر ہے اور شہادت تضاد پایا جانے کی وجہ سے ساقط ہوگی۔ اگر قاضی کے فیصلے کے بعد رجوع کر لیا تو فیصلہ کو منسوخ نہیں کیا جائے گا کیونکہ صدق و کذب کے احتمال میں شہادت اور رجوع عن الشہادت دونوں برابر ہیں۔ مگر شہادت کی بنیاد پر فیصلہ قاضی کے حکم سے مستحکم ہو گیا پس شہادت سے رجوع کی وجہ سے اس کو منسوخ نہیں قرار دیا جائے گا۔ ہاں یہ ہوگا کہ گواہ اس

---

[1] (بیہقی ۳م ص ۲۰۶)

چیز کے ضامن ہوں گے جن کی گواہی کی وجہ سے وہ مال تلف ہوا۔ مثلاً دو گواہوں نے عدالت کے روبرو گواہی دی کہ مدیون نے قرض دائن کو ادا کر چکا ہے یا یوں شہادت دی کہ صاحب حق نے اپنا حق (دین) معاف کر دیا۔ قاضی نے اس شہادت کو بنیاد بنا کر مدیون کی برات کا حکم دیدیا۔ قاضی کے فیصلے کے بعد گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع کر لیا تو گواہ اس کے ضامن ہوں گے جب تک مشہود لہ مشہود علیہ سے قرض وصول کر لے کیونکہ قرض کی ملکیت قبضہ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کیلئے مال کی گواہی دی۔ قاضی نے فیصلہ سنا دیا مدعی نے فیصلہ کے مطابق مال پر قبضہ کر لیا پھر گواہوں نے گواہی سے رجوع کر لیا تو جس کے خلاف انہوں نے گواہی دی تھی اس کے مال کا تاوان دیں گے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ سے مال ان کی گواہی کی وجہ سے نکلا ہے اس کا سبب یہ لوگ بنے ہیں اور یہ چیز ضمان کا موجب ہے۔ مدعی پر تاوان نہیں ڈالا جائے گا کیونکہ حکم اور فیصلہ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی قاضی اس کا تاوان بھرے گا کیونکہ اس نے تو گواہوں کی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ دیا اور اگر قاضی کو مورد الزام ٹھہرائیں گے یا ضامن قرار دیں گے تو آئندہ قضاء کیلئے کوئی شخص تیار ہی نہ ہوگا۔

دو گواہوں نے ایک قطعہ اراضی کے متعلق گواہی دی کہ یہ فلاں شخص کی ملکیت ہے جس پر قاضی نے فیصلہ سنا دیا۔ اس کے بعد گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع کر لیا تو فیصلہ منسوخ نہیں ہوگا اور دونوں گواہ اس کا تاوان ادا کریں گے۔ زمین کی قیمت ادا کرنا ان کی ذمہ داری ہوگی۔ چاہے مشہود لہ (جس کے حق میں گواہی دی گئی) نے زمین پر قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو کیونکہ وہ زمین کے صرف فیصلے سے ہی مالک بنا ہے۔

اگر دو گواہوں میں سے ایک نے رجوع کیا ایک نے نہیں کیا تو جس نے رجوع کیا ہے اس کے ذمہ نصف تاوان ادا کرنا ضروری ہوگا۔ اگر گواہی تین آدمیوں نے دی تھی پھر ان میں سے ایک نے رجوع کر لیا تو اس پر تاوان نہیں ہے کیونکہ دو کی شہادت سے سارا حق باقی ہے۔ اگر ان میں سے دو نے رجوع کیا اور ایک نے نہیں کیا تو رجوع کرنے والوں پر نصف تاوان ادا کرنا لازم ہوگا۔ اگر ایک مرد اور دو عورتوں نے شہادت دی ان میں ایک عورت نے رجوع کر لیا تو وہ ایک ربع ۱/۴ تاوان ادا کرے گی اگر دونوں نے رجوع کیا تو نصف تاوان بھریں گے اور اگر دو مرد اور ایک عورت نے گواہی دی پھر سب نے اس سے رجوع کر لیا تو تاوان صرف مردوں کا پڑے گا اس لئے کہ عورت کے علاوہ دو مردوں کی گواہی سے حق ثابت ہو چکا ہے۔

اگر دو گواہوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو قبل از دخول طلاق دی ہے پھر گواہوں نے رجوع کیا تو وہ نصف مہر ادا کریں گے کیونکہ ان کی گواہی سے اس شخص پر آدھا مہر لازم

ہو گیا جس کے ساقط ہونے کا احتمال بھی تھا کیونکہ اگر مطالبہ طلاق عورت کی طرف سے ہوتا تو پھر شوہر پر کچھ بھی واجب نہ ہوتا لیکن اگر طلاق دینے کی گواہی ہمبستری کے بعد ہو تو گواہوں پر کچھ بھی واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ مہر کا وجوب دخول سے ہو گیا تھا اور ملک بضعہ کی ملک سے نکلتے وقت کوئی قیمت نہیں ہے لہٰذا اس کے بدلے کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر نائب گواہ شہادت دینے کے بعد رجوع کر لیں تو ضامن بھی وہی ہوں گے کیونکہ قاضی کی عدالت میں انہوں نے گواہی دی ہے اور فیصلہ انہی کی گواہی پر ہوا ہے لہٰذا ضامن بھی وہی ہوں گے۔

نائب گواہوں کی شہادتوں سے فیصلہ سنانے کے بعد اصل گواہ یہ کہہ دیں کہ ہم نے ان لوگوں کو گواہ نہیں بنایا ہے تو بھی اصل گواہوں پر تاوان نہیں آئے گا وہ نائب گواہ ہی ضامن ہوں گے کیونکہ اصل گواہوں نے تو گواہ بنانے سے ہی انکار کر دیا لیکن پھر بھی فیصلے کو منسوخ قرار نہیں دیا جائے گا۔ ہاں اگر فیصلہ سے قبل اصل گواہوں نے کہا کہ ان لوگوں کو ہم نے گواہ نہیں بنایا ہے تو اس سے نائب کی گواہی باطل ہوگی۔ اور ان کی بنیاد پر فیصلہ نہیں دیا جائے گا اور اگر نائب گواہوں نے کہا کہ وہ (اصل گواہ) جھوٹ بول رہے ہیں انہوں نے ہمیں گواہ بنایا ہے تو ان کی بات کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا ان کے قول سے حکم منسوخ نہیں ہوگا اور ان پر ضمان بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی شہادتوں سے رجوع نہیں کیا ہے۔ اگر گواہوں کے اہل ہونے کی گواہی دینے والوں نے فیصلے کے بعد اپنے قول سے رجوع کر لیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ ضامن ہوں گے کیونکہ انہوں نے ہی گواہوں کو گواہی کا اہل قرار دیا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ محل شک پر تھے۔

دو گواہوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کی طلاق کو فلاں گھر میں داخل ہونے کے ساتھ معلق کیا ہے اور پھر دو گواہوں نے گواہی دی کہ وہ عورت فلاں گھر میں داخل ہوگئی ہے قاضی نے طلاق کا حکم نامہ صادر کیا۔ پھر پہلے گواہوں نے کہا کہ ہم نے غلط گواہی دی تھی اس نے اپنی بیوی کی طلاق کو گھر میں داخل ہونے کے ساتھ معلق نہیں کیا تھا۔ جو گواہ اس کا سبب بنے ہیں یعنی تعلیق کے گواہ تو وہ تاوان ان کے ذمہ ہوگا۔ دوسرے گواہوں پر نہیں ہوگا جنہوں نے شرط کے پائے جانے کی گواہی دی تھی۔

کتاب الحجر

حجر کا لغوی معنی روکنا اور منع کرنا ہے۔ پتھر کو بھی اس کی سختی کی وجہ سے حجر کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں "حجر" مخصوص اوصاف کی وجہ سے مخصوص چیزوں پر پابندی لگانے کو کہا جاتا ہے۔

پابندی کے اسباب:

حجر (پابندی) کے تین سبب ہیں (۱) صغر (نابالغ ہونا)' (۲) مجنون ہونا (۳) غلام ہونا۔

نابالغ بچہ اور مجنون اپنے امور درست طریقے سے انجام نہیں دے سکتے اور اپنے فائدے اور نقصان کی پہچان بھی نہیں رکھتے لہٰذا مجنون اور ایسے بچے کا تصرف جو معاملات سے بالکل واقف نہ ہو عدم اہلیت کی بنا پر جائز نہیں ہے۔ اور وہ بچہ جو سمجھدار ہو فائدہ اور نقصان کی پہچان رکھتا ہو تو سرپرست کی اجازت سے تصرف کرسکتا ہے کیونکہ اس کے سرپرست کا اجازت دینا اس بات کی دلیل ہے وہ تصرف کرنے کا اہل ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو تصرف کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا اور مجنون کا تصرف کسی طرح بھی جائز نہیں ہے اگرچہ اس کو تصرف کی اجازت دی گئی ہو جبکہ وہ ہمیشہ جنون کی کیفیت میں رہتا ہو۔ ہاں اگر کبھی جنون طاری ہوتا ہو اور کبھی ہوش میں بھی رہتا ہو تو اس کا تصرف جائز ہے۔ لہٰذا بچے اور مجنون کا معاملات کرنا' اقرار کرنا اور طلاق دینا وغیرہ وغیرہ ناقابل اعتبار ہے ہاں اگر کسی چیز کو تلف کردیں تو ضامن ہوں گے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ضمان وتاوان قصدواراد ے کے بغیر بھی واجب ہوجایا کرتا ہے جیسا کہ سونے والے کا جرم کرنا' اس پر تاوان کو لازم کرتا ہے۔ اسی طرح مجنون ہے کیونکہ اتلاف جو ضمان کا سبب ہے اس میں موجود ہے البتہ حدود وقصاص ان پر نہیں ہوگا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتى يستيقظ وعن المبتلى حتى يبرء وعن الصبي حتى يكبر"[1] "وہ تین آدمیوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے ایک سونے والے سے یہاں تک کہ بیدار ہو جائے دوسرا بیمار سے یہاں تک کہ ٹھیک ہو جائے اور بچہ سے یہاں تک کہ بڑا ہو جائے"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] السنن ابی داؤد ج۲ ص ۱۴۰

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مجنونہ کو لایا گیا جس نے زنا کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگساری کیلئے لے جا رہے تھے راستے میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آمنا سامنا ہوا فرمایا اس کا کیا معاملہ ہے اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ لوگوں نے کہا: اس کا تعلق فلاں قبیلے سے ہے۔ یہ مجنونہ ہے اور اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: اس کو واپس لے چلو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے فرمایا: آپ کو معلوم نہیں تین اشخاص مرفوع القلم ہیں۔ (۱) مجنون جب تک ہوش میں نہ آ جائے (۲) خوابیدہ شخص جب تک کہ بیدار نہ ہو (۳) اور بچہ جب تک سمجھدار نہ ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واقعی ایسا ہی ہے حضرت علی نے فرمایا تو پھر اس مجنونہ کو رجم کرنے کا حکم کیسا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو چنانچہ اس کو چھوڑ دیا گیا۔ پھر آپ نے نعرہ تکبیر لگایا۔[۱] ان لوگوں میں سے اگر کوئی خرید و فروخت کا معاملہ کرے اور اس کے فائدہ و نقصان کو سمجھتا ہو تو اس کے سرپرست کو اختیار ہے چاہے وہ اس کی اجازت دے اگر اس میں مصلحت اور بہتری سمجھتا ہو اور چاہے تو فسخ کردے کیونکہ ان کے معاملات ولی کی اجازت پر موقوف ہوتے ہیں کیونکہ نقصان کا بھی احتمال موجود ہے اگر وہ اس میں مصلحت دیکھے تو اجازت دے سکتا ہے۔ اگر ہنسی مزاح میں معاملہ کیا تو سرپرست کی اجازت کے باوجود اس کا معاملہ درست نہ ہوگا۔

حد بلوغ:

لڑکے کے بالغ ہونے کا حکم اس کے احتلام یا احبال (عورت کو حاملہ کرنا) یا انزال یا سن شعور سے لگایا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ" [الانعام: ۱۵۲] "اور مت نزدیک جاؤ مال یتیم کے مگر اس طرح کہ جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ پہنچے جوانی اپنی کو"۔ یہ قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور ان کے نزدیک حد بلوغ اٹھارہ سال ہے اور یہی بلوغ الاشد ہے۔ امام ابن جریر طبری نے "وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ" [یوسف: ۲۲] کی تفسیر میں فرمایا ہے جب وہ قوت کی انتہا اور جوانی کو پہنچے اور اس کی حد اٹھارہ سال سے ساٹھ سال تک ہے۔ ایک قول کے مطابق چالیس سال تک ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے کہ جوانی اٹھارہ سے تیس سال کے درمیان ہے۔ دیکھیے جوانی کی ابتداء سبھی نے اٹھارہ سال بتائی ہے لہٰذا حد بلوغ اٹھارہ سال ہے۔ جہاں تک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا تعلق ہے وہ احتیاط پر مبنی ہے ورنہ

---

[۱] [ابوداؤد ۲: ۳۴۴، ص ۱۳۰]

''بلوغ اشد'' چالیس سال کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ''حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً'' [الاحقاف: ۱۵] ''یہاں تک کہ پہنچا جوانی اپنی کو اور پہنچا چالیس برس کو''۔ اور لڑکی کے بلوغ کا حکم احتلام یا حیض یا حمل یا سترہ سال کی عمر کو پہنچنے پر لگایا جائے گا۔ بلوغ کی حقیقت احتلام اور انزال سے ثابت ہوتی ہے کیونکہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''ومن كل حالم دينارا او عدله معافر''[۱]

مذکورہ حدیث میں موجود لفظ ''حالم'' سے ماخوذ ہے اور بلوغ کی علامت حیض بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''لا يقبل الله صلاة حائض الا بخمار''[۲] ''بالغہ کی نماز بغیر دوپٹے کے اللہ کے ہاں مقبول نہ ہوگی''۔ یہاں حائض سے مراد بالغہ ہے اگر ان میں سے کوئی علامت ظاہر نہ ہو تو حد بلوغ سترہ سال ہے۔ لڑکی جلدی بالغ ہو جاتی ہے لہٰذا ایک سال کم کر دیا گیا اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک مذکر ہو یا مونث دونوں کی حد بلوغ پندرہ سال مکمل ہوتا ہے کیونکہ یہی عام عادت ہے۔ اور دوسری دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے وہ فرماتے ہیں' غزوہ احد میں مجھے خدمت نبوی شریف میں پیش کیا گیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دی جب غزوہ خندق (غزوہ احزاب) کا موقع آیا تو مجھے اجازت مل گئی اس وقت میر عمر پندرہ سال کی تھی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور حکومت میں میں نے ان کو یہ حدیث سنائی تو انہوں نے اپنے گورنروں کو لکھا کے پندرہ سال کے بالغ شمار کرو' اور پندرہ سال سے کم عمر والوں کو عیال میں شمار کرو۔[۳] امام صاحب رحمہ اللہ اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات نابالغ کو بھی جہاد میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمایا کرتے تھے' چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوہ بدر میں ان کو خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سنی کی وجہ سے اجازت نہ دی پھر انہیں غزوہ احد میں جہاد میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کو بھی پیش کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ انہوں نے کہا کہ ان کو (رافع کو) آپ نے اجازت دی اور مجھے اجازت نہیں اگر اس کے ساتھ میرا مقابلہ کرا دیں تو میں اس پر غالب آ ؤں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مقابلہ کرو' پھر ان کا مقابلہ ہوا سمرہ رضی اللہ عنہ غالب آ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شریک جہاد فرمایا۔ اگر لڑکا بلوغ کا دعویٰ کرے تو اس کیلئے بلوغ کی ادنیٰ مدت بارہ سال ہے اور لڑکی کی نو سال ہے۔ اگر وہ اس عمر میں بلوغ کا دعویٰ کرے تو ان کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ یہ معاملہ ان کے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہو سکتا۔

---

۱ [ترمذی: ج۱ ص ۱۶۷] ۲ [ابوداؤد، ج۱ ص ۱۷۳] ۳ [بیہقی، ج۵۲]

کیا بالغ بے وقوف پر تصرف کی پابندی لگائی جاسکتی ہے؟

اس میں دو قول ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ (۱) عاقل بالغ پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اگرچہ وہ بے وقوف ہو اور اپنے مال کو بلا مقصد خرچ کرتا ہو اور فضول خرچی کرتا ہو کیونکہ ایسا کرنا حقوق انسانی کے خلاف ہے۔ اپنے مال میں تصرف کرنا اس کا حق ہے اور اس حق کو اس سے چھیننا اس کیلئے مال کے خرچ ہونے سے بڑھ کر ضرر ہے اور اس کو بہائم کی صف میں شامل کرنے کے مترادف ہے۔ چھوٹے نقصان سے بچنے کیلئے بڑے نقصان میں مبتلا کرنا درست اقدام نہیں ہے لیکن اگر اس کے تصرف پر پابندی نہ لگانے سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اس کا تصرف کالعدم قرار دے کر اس پر پابندی لگائی جاسکتی ہے جیسے۔ جاہل طبیب یا غلط فتویٰ دینے والے مفتی پر فتویٰ دینے کی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے اقدام سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ البتہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر بچہ بالغ تو ہو گیا ہو مگر ہوشیاری اور سمجھداری ابھی تک اس کے اندر پیدا نہ ہوئی ہو تو اس کے مال کو اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا کیونکہ مال حوالہ کرنے کی شرط رشد (سمجھداری) ہے اور یہ اس میں ابھی تک مفقود ہے اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ”فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ“ [النساء:۶] ”پس اگر پاؤ تم ان میں سے ہوشیاری پس حوالے کر دو ان کو ان کے مال“۔ تاہم اگر وہ اپنے مال میں تصرف (خرید وفروخت) کرے تو اس کا تصرف نافذ ہوگا کیونکہ مال میں تصرف کرنے کی اہلیت (بلوغ) موجود ہے جب پچیس سال کو پہنچ جائے تو بہر صورت اس کا مال اس کے سپرد کیا جائے گا۔ اگرچہ رشد اس میں نہ آئی ہو کیونکہ ارشاد خداوندی ہے ”وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا“ [النساء:۶] ”اور مت کھاؤ ان کو زیادتی سے اور جلدی سے اس سے کہ بڑے ہو جائیں“۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جب بڑا ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کردو۔ بڑے ہونے کی حد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس سال مقرر فرمائی ہے کیونکہ عام طور پر پچیس سال میں سمجھداری آ ہی جاتی ہے۔ دیکھئے پچیس سال میں وہ دادا بھی بن سکتا ہے وہ اس طرح کے بچہ کے بالغ ہونے کی کم از کم مدت بارہ سال ہے۔ چنانچہ بارہ سال کی عمر میں اس نے شادی کر لی شادی کے چھ مہینے بعد بچہ پیدا ہوا اس بچے نے بھی بارہ سال میں بالغ ہو کر نکاح کر لیا۔ شادی کے چھ مہینے بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ اس طرح پچیس سال میں وہ دادا بن گیا۔ اور یہ محال ہے کہ وہ دادا تو بن جائے لیکن اس کے اندر رشد پیدا نہ ہو لہٰذا پچیس سال کے بعد بھی اس کا مال اس کے حوالہ نہ کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ قبیح

فعل ہے۔ (۲) دوسرا قول صاحبینؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ بے وقوف پر پابندی لگ سکتی ہے۔ اسے مالی تصرفات سے منع کیا جاسکتا ہے جیسا کہ جنون یا عدم بلوغ کی وجہ سے اس کا تصرف درست نہیں تھا کیونکہ نابالغ ہونے کی وجہ سے تصرفات کی پابندی عدم رشد کے احتمال کی وجہ سے تھی جب کہ اس وقت عدم رشد حقیقتاً موجود ہے لیکن فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے۔ لہٰذا ان کے فتویٰ کے مطابق اگر پابندی کے بعد کوئی چیز فروخت کرے تو اس کی بیع نافذ نہیں ہوگی۔ ہاں اگر اس کی بیع کے نفاذ میں کوئی مصلحت موجود ہو تو عدالت اس کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر وہ کسی عورت سے نکاح کرلے تو نکاح ہو جائے گا کیونکہ یہ اس کی ضروریات اصلیہ میں شامل ہے اور اگر مہر اس کیلئے مقرر کرے تو وہ مہر مثل کی مقدار میں درست ہوگا کیونکہ مہر مقرر کرنا نکاح کی ضروریات میں سے ہے اور مہر مثل سے زیادہ مقرر کرنا ضروریات میں داخل نہیں ہے لہٰذا اس مقدار سے زیادہ مقرر کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس طرح چار شادیاں کرنا بھی ضروریات میں داخل نہیں ہے۔ اور حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر بالغ ہونے کے باوجود بھی سمجھداری اس میں پیدا نہیں ہوئی تو اس کا مال اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا اگرچہ اس کی عمر پچیس سال ہوجائے جب تک کہ اس میں سمجھداری پیدا نہ ہو کیونکہ اس کے تصرفات پر پابندی کی علت اس کی بے وقوفی ہے لہٰذا جب تک یہ علت برقرار رہے گی تو پابندی بدستور برقرار رہے گی۔

لہٰذا اس کیلئے اپنے مال میں تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا لیکن اگر اس میں کوئی مصلحت کارفرما ہو تو عدالت اس کو نافذ قرار دے سکتی ہے۔ اس کے مال سے زکوٰۃ نکالی جائے گی کیونکہ زکوٰۃ امور واجبہ میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہے جیسا کہ اس پر روزہ رکھنا فرض ہے۔ البتہ زکوٰۃ کی مقدار کے مطابق اس کو مال دیا جائے گا تاکہ وہ مصرف زکوٰۃ میں اس کو صرف کرے اور اس کی ادائیگی کیلئے اس کی نیت شرط ہے لیکن اس کے ساتھ ایک امین کو بھی مقرر کیا جائے گا تاکہ وہ اس مال کو زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور جگہ صرف نہ کرے۔ اس کے مال میں سے اس کی بیوی بچوں اور جن لوگوں کا خرچ اس پر واجب ہے ان پر خرچ کیا جائے گا۔

بے وقوفی اور کم عقلی کی وجہ سے لوگوں کے وہ حقوق جو اس کے ذمہ ہیں واجب الادا ہیں باطل نہیں ہوں گے اسی طرح اگر وہ حج فرض ادا کرنا چاہے تو اس کو منع نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب شدہ ہے لیکن قاضی مال اس کے حوالہ نہیں کرے گا بلکہ کسی با اعتماد شخص کے حوالہ کرے گا جو اس کے ساتھ حج کیلئے جا رہا ہو۔ وہ راستہ میں معروف طریقے کے مطابق اس پر خرچ کرتا رہے گا۔ اگر وہ کم عقل بیمار ہوجائے اور اپنے عزیز واقارب وغیرہ کیلئے اپنے اموال میں سے

وصیت کرلے تو ایک ثلث (۱/۳) مال میں اس کی وصیت نافذ ہوگی اس لیے کہ وصیت کا حکم شرعی لحاظ سے ہے اس سے اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے تصرف پر پابندی اس کی حالت حیات کے ساتھ متعلق ہے جبکہ وصیت کا تعلق حالت ممات کے ساتھ ہے۔

مفلس پر پابندی کا حکم:

حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں مفلس پر دین کی وجہ سے پابندی لگانے کے حق میں نہیں ہوں چنانچہ ایک شخص کے اوپر مختلف لوگوں کے قرض ہوں اور قرض خواہ یہ مطالبہ کریں کہ اس پر تصرف کی پابندی لگائی جائے اور اس کو محبوس کیا جائے تو اس پر تصرف کی پابندی نہیں لگائے جائے گی کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں اس کی اہلیت تصرف کی توہین لازم آتی ہے۔ قرض خواہ کے ضرر کو دور کرنے کیلئے مقروض پر پابندی لگانا جائز نہیں ہے۔

پس اگر اس کے پاس مال موجود ہو تو حاکم اس میں تصرف نہیں کرسکتا کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی پابندی ہے ہاں البتہ حاکم اس کو قید کرسکتا ہے تاکہ وہ اس مال کو فروخت کرکے قرض خواہ کے قرض اتار دے کیونکہ قرض کو ادا کرنا اس پر واجب ہے اور قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "مطل الغنی ظلم" [1] "مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے"۔ لہٰذا حاکم حقدار تک حق کو پہنچانے اور اس کو ظلم سے بچانے کیلئے اس کو محبوس کرسکتا ہے۔ اگر اس کے پاس نقد مال موجود ہو اور قرض بھی نقد کا ہو تو قاضی اس کی اجازت کے بغیر بھی وہ مال قرض خواہ کو دے سکتا ہے کیونکہ اصول ہے کہ قرض دینے والا اگر مقروض کے پاس اپنا دیا ہوا قرض پائے تو مقروض کی اجازت کے بغیر اسے لے سکتا ہے۔ کیونکہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے: "من ادرک ماله بعینه عند رجل او انسان قد افلس فهو احق به من غیره" [2] "جو شخص اپنے مال کو بعینہ کسی ایسے شخص کے پاس دیکھے جس کو مفلس قرار دیا گیا ہے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق دار ہے"۔ یہ حدیث مبارک صرف نقد پر محمول ہے سامان اسباب کا مسئلہ اس کے خلاف ہے۔ اس کے متعلق بات آگے آرہی ہے۔ اور صاحبین فرماتے ہیں کہ اگر مفلس کے قرض خواہ اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کریں تو اس پر عدالت پابندی لگا سکتی ہے اور ثمن مثل سے کم قیمت پر اشیاء فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اپنے مال میں تصرف اور دوسرے کیلئے اقرار کرنے سے اس کو روکا جاسکتا ہے تاکہ اس کے قرض خواہ ضرر سے محفوظ رہیں اگر وہ اپنے مال کو فروخت کرکے قرض ادا کرنے سے انکار

---

[1] [بخاری: ۲۲۸۷] [2] [بخاری: ۲۴۰۲]

کرے تو قاضی اس کو فروخت کر کے حاصل شدہ قیمت قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کر سکتا ہے۔ فروخت کرنے میں پہلے اس کا سامان پھر اس کی جائیداد اور زمین کو فروخت کیا جائے گا جو بھی آسانی سے فروخت ہو سکے اس کو پہلے فروخت کیا جائے گا۔ اگر اس نے پابندی کے زمانے میں قرض خواہوں کے علاوہ کسی اور کیلئے بھی قرض کا اقرار کر لیا تو موجودہ مال اس کو ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ موجودہ مال کے ساتھ ان قرض خواہوں کا حق متعلق ہوا ہے۔ لہٰذا دوسرے کیلئے اقرار کر کے ان کے حقوق کو باطل کرنے کا اسے اختیار نہیں ہوگا ہاں اگر پابندی لگنے کے بعد مال اس کے پاس آ گیا ہو تو اس مال میں سے مقرلہ (جس کیلئے اقرار کیا ہے) کو دے سکتا ہے کیونکہ اس مال کے ساتھ قرض خواہوں کا حق متعلق نہیں ہوا ہے۔

مفلس کا خرچ:

مفلس مال میں سے اس پر اور اس کی بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ اس کی ضرورت اصلیہ میں سے ہے اور ضرورت اصلیہ قرض سے مقدم ہوتی ہے اگر مفلس (دیوالیہ شخص) کے پاس کوئی مال موجود نہ ہو اور قرض خواہ اس کو قید کرنے کا مطالبہ کریں اور وہ یہ کہے کہ میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے کہ جس سے میں قرض ادا کر سکوں تو قاضی اس کو قید کرنے کا حکم دے سکتا ہے اور مفلس کی ہر اس دین کے معاملے میں تصدیق نہیں کی جائے گی جو اس کے پاس موجود مال کے بدلے اس پر لازم ہو گیا ہو۔ چنانچہ اس نے ایک مدت کیلئے ایک چیز خریدی پھر اس کو نقد مال کے عوض فروخت کر دیا یا ایک شخص سے نقدی رقم قرض کے طور پر وصول کی پھر اپنے مفلس ہونے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ میرے پاس کوئی مال نہیں ہے تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ مال خریدنا اور بیچنا اس کے پاس مال ہونے کی دلیل ہے اور قرض کی ادائیگی سے ٹال مٹول کرنے پر دلالت کرتا ہے جو کہ ظلم ہے۔ اسی طرح ہر اس دین کے متعلق اس کے اعلان مفلسی کی تصدیق نہیں کی جائے گی جو کسی معاہدے اور عقد کے نتیجے میں اس پر واجب ہو چکا تھا۔ مثلاً مہر، کفالہ وغیرہ کیونکہ ان امور کو بجا لانا اس کے پاس مال ہونے اور ادائیگی پر قادر ہونے کی دلیل ہے۔ ہاں اگر وہ کسی تاوان مالی یا جانی ادا کرنے کی وجہ سے دیوالیہ ہو گیا ہو اور اپنے پاس مال ہونے سے انکاری ہو اور قرض خواہ اس کو پکڑنے اور قید کرنے کا مطالبہ کر رہے ہوں تو عدالت اس کو قید نہیں کر سکتی اور اس کے محتاج اور مفلس ہونے کی تصدیق کی جائے گی اور اسے مفلس قرار دیا جائے گا لیکن اگر اس کے کہنے کے باوجود بینہ کے ذریعے اس کے پاس مال موجود ہونے کا ثبوت ملے تو قرض خواہوں کا

مطالبہ پورا کیا جائے گا۔

مفلس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

جب قرض خواہوں کے مطالبے پر قاضی نے اس کو قید کر دیا اور خفیہ طور پر اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے اور اس کے قریبی پڑوسیوں سے معلومات لینے کے بعد قاضی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو وہ ضرور اس کو ظاہر کرتا اور قاضی کو گمان غالب حاصل ہوا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو وہ اس کو آزاد کر دے گا اور اس کو پہلی فرصت میں قرض کی ادائیگی کا حکم دے گا۔ اگر قید کیے جانے کے بعد اس نے گواہوں کے ذریعے ثبوت پیش کیا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے وہ دیوالیہ ہو گیا ہے تو اس کے گواہوں کی گواہی کو قبول کر لیا جائے گا اور اس کو آزاد کر دیا جائے گا اور اگر قید کیے جانے سے پہلے ثبوت فراہم کرے تو اکثر مشائخ کی رائے کے مطابق اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ قاضی اس کو آزاد کرنے کے بعد اس کے اور اس کے قرض خواہوں کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔ قرض خواہ ہر وقت اس کا پیچھا کر سکتے ہیں اپنے قرض کی وصولی کیلئے ہر وقت اس کے دروازے پر بیٹھ سکتے ہیں تاکہ وہ چھپ نہ سکے۔ اس کی دلیل یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر اپنا قرض مانگا اور رسول اللہ ﷺ کیلئے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو مارنے کا ارادہ کیا تو سرکار عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**دعوہ فان لصاحب الحق مقالا**"[1] "اس کو چھوڑ دو اس لیے کہ حق دار کو بولنے کا حق ہے"۔ لیکن قرض خواہوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کو بیع اور تصرف سے روک لیں تاکہ وہ خرید وفروخت کے ذریعہ مال کمائے۔ قاضی اس کو قرضوں کے تناسب سے قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کرے گا۔

حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر عدالت نے اس کو مفلس (دیوالیہ) قرار دے کر آزاد کر دے تو قاضی درمیان میں حائل ہو سکتا ہے۔ قرض خواہ اس کا پیچھا کرنے کا مجاز نہیں ہوں گے الا یہ کہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس مال آ گیا ہے تو وہ قاضی کے پاس آ کر ثابت کر سکتے ہیں کہ اس کا افلاس ختم ہو گیا ہے۔

کیا فاسق کے تصرفات پر پابندی لگائی جا سکتی ہے؟

اگر فاسق درست طریقہ سے اپنا مال خرچ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو تو عدالت اس کے تصرف (خرید وفروخت) پر پابندی نہیں لگا سکتی ہے کیونکہ پابندی لگانے کی علت اسراف وتبذیر ہے

[1] [بخاری: ۱/۳۰۷]

اور وہ اس میں نہیں ہے۔ چاہے پہلے سے فاسق ہو یا بعد میں فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہو۔ بہر صورت اس کے تصرف پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

فوت شدہ شخص یا مفلس کے پاس دوسرے کا سامان موجود ہو تو کیا حکم ہے؟:

کوئی شخص مفلس قرار دیا گیا یا مر گیا اور اس شخص کا سامان موجود ہو جس سے اس نے خریداری کی تھی اور اس کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کی قیمت ابھی ادا نہیں کی تھی یا ساری ادا نہیں کی تھی اور دوسرے لوگوں کے قرض بھی اس کے ذمہ واجب الادا ہوں تو اس سامان میں تمام قرض خواہ برابر کے حقدار ہوں گے اس کا بائع دوسروں سے زیادہ حقدار نہیں ہے کیونکہ جب فروخت کرنے والے نے اس کو خریدنے والے کے سپرد کر دیا تو وہ اپنی چیز پر ملکیت کے سقوط سے راضی ہو گیا ہے پس وہ بھی دوسرے قرض خواہوں کی طرح ہو گیا۔ اگر بائع (فروخت کرنے والا) نے مبیع مشتری کے حوالہ نہ کی ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر قیمت موجل ہو تو یہی حکم ہے کیونکہ مشتری کے مرنے سے مدت ختم ہو گئی اور اگر ثمن (قیمت مبیع) معجل ہو تو اس صورت میں دوسرے قرض خواہوں کے مقابلے میں بائع بالاتفاق زیادہ حقدار ہوگا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں صورت میں سامان کا مالک (بائع) زیادہ حقدار اور مقدم ہوگا۔

مسئلہ: ایک شخص کا انتقال ہوا اس حال میں کہ مختلف لوگوں کا اس پر قرض ہے اور ترکہ اس کی ادائیگی کیلئے پورا نہیں ہوتا تو اس صورت میں ترکہ کو قرض خواہوں کے درمیان ان کے قرضوں کے تناسب سے تقسیم کر دیا جائے گا جس کا قرض کم ہے اس کو اس اعتبار سے کم اور جس کا کچھ زیادہ ہے اس کو اس تناسب سے کچھ زیادہ دیا جائے گا۔ مثلاً زید کا انتقال ہوا خالد کے اس کے ذمہ ایک لاکھ تھے ارشد کے اس کے ذمہ تیس ہزار امجد کے بیس ہزار اور صفدر کے دس ہزار روپے قرض تھے اور ترکہ چھوڑا کل چالیس ہزار روپے۔

﴿ کتاب الاقرار ﴾

اقرار کا لغوی معنی مضبوط کرنا اور ٹھہرانا ہے اس وادی کو اہل عرب قرار الوادی کہتے ہیں جس میں پانی ٹھہر جاتا ہو منی کے ایام کو ایام القر بھی اس لیے کہتے ہیں کہ ان دنوں میں لوگ وہاں ٹھہرتے اور سکونت اختیار کرتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں کسی کیلئے کوئی چیز اپنے ذمے ثابت ماننے کو اقرار کہا جاتا ہے۔ اور یہ حجت شرعیہ ہے اس کا حجت شرعیہ ہونا کتاب اللہ سنت اور اجماع وقیاس سے ثابت ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے: "وَكُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ" [النساء: ۱۳۵] "ہو جاؤ تم قائم رہنے والے ساتھ انصاف کے گواہی دینے والے واسطے اللہ کے اگر چہ اوپر جانوں اپنی کے ہو"۔ اپنے نفس کے خلاف گواہی دینا اقرار ہے اور دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: "وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ" [البقرۃ: ۲۸۲] "چاہیے کہ املاء کرائے وہ جس پر ادا کرنا لازمی ہے"۔ یہ اپنے نفس کے خلاف اقرار ہے۔

حدیث سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "واغد یا انیس الی مرأۃ ھذا فان اعترفت فارجمھا"[1] "اے انیس! اس کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اس کو سنگسار کردو"۔ اسی طرح حضور ﷺ نے غامدیہ اور حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو اقرار کی بناء پر رجم کرنے کا حکم دیا اور اسی پر اجماع ہے۔ قیاس سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اقرار ایک ایسی خبر ہے جو عدم تہمت کی وجہ سے سچائی کے ساتھ صادر ہوئی ہے لہذا دوسرے کیلئے اقرار کرنے کی تکذیب نہیں کی جائے گی اقرار حق کو ظاہر کرنے والی حجت اور دلیل ہے جب کہ وہ عاقل بالغ سے صادر ہو اور کسی متعین شخص کیلئے اقرار ہو اگر چہ وہ چیز جس کا اقرار کر رہا ہے مجہول ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جہالت صحت اقرار سے مانع نہیں ہے البتہ اس پر وضاحت کرنا لازم ہوگا کیونکہ اقرار در اصل کسی کے حق کے ثبوت کے بارے میں خبر دینا ہے۔

اقرار کی شرط:

شرط اس میں یہ ہے کہ جس چیز کا اقرار کر رہا ہے وہ چیز قیمت والی ہو لہذا اگر کسی بے قیمت چیز کا اقرار کرے گا تو وہ اس پر لازم نہیں ہوگی۔

---

[1] [illegible]

کیا اقرار میں گواہ شرط ہے:

اقرار میں گواہوں کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اقرار کرنے والا اقرار اس لیے کرتا ہے کہ وہ ذمے سے بری ہونا چاہتا ہے اس کے لئے گواہ بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی اقرار حقِ مقرلہ (جس کا اقرار کیا گیا ہو) کو واجب کرنے والا ہے حدود کے علاوہ دوسرے معاملات میں اقرار سے رجوع کا بھی اعتبار نہیں ہوگا۔

اقرار کی صورتیں:

اقرار اگر یوں کیا: فلاں کی مجھ پر کوئی چیز واجب ہے یا کہا کہ فلاں کا مجھ پر ایک حق ہے تو اس کی قیمت بیان کرنا اس پر لازم ہے اگر مقرلہ (جس کیلئے اقرار کیا گیا) نے اس کی تکذیب کی تو اس مقر (اقرار کرنے والے) کی بات اس کی قسم کے ساتھ مانی جائے گی اس لیے کہ وہ زیادت کا منکر ہے منکر کا قول اس کی قسم کے ساتھ معتبر ہوتا ہے۔ اگر کہا کہ فلاں کا مجھ پر واجب ہے تو یہ کہنا ہی دین کا اقرار کرنا ہے اور اگر اس قول کے ساتھ ہی کہا کہ "بطور امانت" تو اس کی بات مانی جائے گی کیونکہ یہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے اگر اس کو وقفہ کے بعد ذکر کیا تو تصدیق نہیں کی جائے گی کیونکہ فلاں کا مجھ پر واجب ہے کا لفظ دین (قرض) پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ فلاں کی چیز یا حق میرے پاس ہے" یہ کہنا امانت کا اقرار شمار ہوگا اور اگر مقرلہ کہہ دے کہ وہ قرض ہے امانت نہیں ہے تو بینہ (گواہ) کے ساتھ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اگر کہہ دے کہ فلاں کا ایک ہزار روپیہ شراب کی ضمانت میں سے مجھ پر واجب ہے تو ایک ہزار واجب مانا جائے گا اور اس کی تفسیر (شراب کی قیمت) امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں مانی جائے گی خواہ اس کو متصلاً کہے یا منفصل کیونکہ یہ غلط اقرار سے رجوع کرنا ہے اقرار سے رجوع کے علاوہ مقبول نہیں ہے اور یہ رجوع اس طرح ہے کہ اس کلام کا پہلا حصہ وجوب پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا حصہ شراب کی قیمت کہنے کی وجہ سے عدم وجوب پر دلالت کرتا ہے کیونکہ شراب کی قیمت مال نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان کے ذمہ واجب نہیں ہے اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں اگر کلام کا دوسرا حصہ (شراب کی قیمت) پہلے جملے کے ساتھ متصلاً کہہ دیا تو ایک ہزار واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس نے کلام کے آخری حصے سے یہ بتانا چاہا ہے کہ اس نے اس کا ارادہ نہیں کیا ہے۔

امام موصلیؒ نے امام نسفیؒ اور صدر الشریعۃؒ نے امام صاحبؒ کے قول پر اعتماد فرمایا ہے۔

مسئلہ۔ اگر یوں اقرار کیا کہ فلاں عورت کے پیٹ میں جو حمل ہے اس کا اتنا مال میرے

ذمہ واجب الادا ہے۔ اگر اس وجوب کی کوئی معقول وجہ بیان کی مثلاً یوں کہا کہ فلاں شخص نے اس کیلئے وصیت کی تھی یا کہہ دیا کہ اس کے والد کا انتقال ہوا اس کی میراث کا فلاں حصہ میرے پاس موجود ہے تو اس اقرار کو بالاتفاق درست مانا جائے گا۔ اور اگر اس مدت حمل میں بچہ پیدا ہوا تو ادا کرنا اس پر لازم ہوگا اور اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو یہ مال وصیت کرنے والے یا مورث کا ہوگا کیونکہ درحقیقت یہ ان کے مال کا اقرار ہے اور بچے کی طرف پیدائش کے بعد منتقل ہوتا ہے چونکہ وہ پیدائش کے وقت مردہ پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کی طرف منتقل نہیں ہوگا۔ اگر اس حمل سے دو جڑواں بچے پیدا ہونے تو مال ان کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا اور اگر کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی مثلاً کہا کہ اس (حمل) نے مجھ کو فروخت کیا تھا اور مجھے بطور قرض دیا تھا تو اقرار بالاتفاق باطل ہوگا اور اگر سبب بتائے بغیر مبہم رکھا تب بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ اقرار درست نہیں ہوگا۔ صاحب ''ینابیع'' نے کہا ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کے متعلق فرمایا اگر وجوب کی کوئی معقول وجہ بتائی مثلاً وراثت یا وصیت تو اقرار کی بنیاد پر اس پر واجب ہوگا۔

مرض الموت میں اقرار کرنا:

مرض الموت وہ مرض ہے کہ جس میں مریض زمانہ صحت کی طرح اپنی ضرورت وحاجت کو بیان نہ کر سکے اور مرض کی عدم کیفیت اس طرح ہو کہ اس جیسے مرض سے اکثر ہلاکت ہوتی ہو اور اس میں مریض مر بھی جائے۔ تو یہ تین صفات جس مرض میں ہوں وہ مرض الموت ہے اگر ان میں سے ایک صفت بھی مفقود ہو تو وہ مرض الوفات نہیں کہا جائے گا۔ یعنی اگر مرض اتنا سخت نہ ہو جو اپنی ضروریات انجام دینے میں رکاوٹ بنے بلکہ بآسانی ضروریات سرانجام دیتا ہو جیسا کہ عام صحت مند لوگ انجام دیتے ہیں یا مرض اس طرح ہو جس سے عام طور پر لوگ بچ جاتے ہوں یا مرض تو سخت تھا مگر اس میں مرا نہیں تو یہ مرض الموت شمار نہیں ہوگا۔ لہٰذا اگر وہ اس حالت میں تصرف کرے گا تو عام حالت صحت کے تصرف کی طرح درست ہوگا اور جو شخص مرض الموت میں ایسے دین کا اقرار کرے جو زمانہ صحت میں اس پر واجب ہو گیا تھا چاہے اس دین کے اسباب معلوم ہوں یا نہ ہوں یا ایسے دیون کا اقرار کرے جو مرض الموت میں اس پر واجب ہو گئے تھے اور اس کے وجوب کے اسباب بھی معلوم تھے مثلاً اپنی ضرورت کیلئے کوئی چیز خریدی اور اس کی قیمت ابھی تک ادا نہیں کی یا بیماری کی حالت میں کسی کی چیزیں تلف کیں جس کی وجہ سے ان اشیاء کی قیمت اس پر لازم ہو گئی تھی یا اس زمانے میں کسی عورت کے ساتھ نکاح کیا اور اس کا مہر اس کے ذمہ لازم ہو گیا تو وہ دیون جو صحت کے زمانے میں

واجب ہو گئے تھے ان کے اسباب معلوم ہوں یا نہ ہوں اور وہ دیون جن کے واجب ہونے کے اسباب معلوم ہوں اور مرض الموت میں واجب ہوں وہ مقدم ہوں گے ان دیون پر جن کا مرض الموت میں اقرار کیا تھا مگر ان کے اسباب معلوم نہ ہوں کیوں محض اقرار جس میں غیر کے حق کا ابطال لازم آتا ہو دلیل نہیں بن سکتا۔

زمانہ صحت کے دیون اور مرض الموت کے معلوم الاسباب دیون کی ادائیگی کے بعد کچھ مال بچ جائے تو زمانہ مرض کے ان دیون کو ادا کیا جائے گا جو معلوم الاسباب نہیں ہیں کیونکہ اقرار فی ذاتہ تو صحیح ہے مگر زمانہ صحت کے قرض خواہوں کی حق تلفی کے اندیشے سے ان کو مؤخر کیا جائے گا۔ جب ان کے حقوق ان کو مل گئے تو اقرار کا صحیح ہونا واضح ہو گیا۔ اگر صحت کے زمانے میں اس پر کوئی قرض نہیں تھا مرض الموت میں کسی کے قرض کا اقرار کیا تو اس کا یہ اقرار درست مانا جائے گا کیونکہ یہ اقرار کسی کے حق کے ابطال کا باعث نہیں ہے اور جس کیلئے اقرار کیا ہے اس کا حق ورثاء کے حقوق سے مقدم ہوگا کیونکہ ادائیگی دیون ضرورت اصلیہ میں شامل ہے اور ورثاء کا حق اس ترکہ کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جو دین سے خالی ہو۔ البتہ مرض الموت میں اپنے کسی وارث کیلئے دین کا اقرار کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے مرض الموت میں مبتلا ہونے پر ورثاء کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو چکے ہیں ان میں سے بعض کو مختص کرنا دوسروں کے حق کو باطل کرنا ہے۔ ہاں اگر دوسرے ورثاء بھی اس کی تصدیق کریں تو یہ اقرار درست مانا جائے گا کیونکہ اس اقرار کی صحت کی راہ میں دوسرے ورثاء کا حق مانع ہے لیکن جب وہ خود اس پر راضی ہیں اور اس کی تصدیق کر رہے ہیں تو مانع دور ہو گیا لہٰذا اقرار صحیح ہوگا۔

مرض الموت میں کسی اجنبی کیلئے اقرار کیا پھر کہا کہ وہ میرا بیٹا ہے اور عمر کے اعتبار سے وہ اس کا بیٹا بن سکتا ہے اور مقرلہ (جس کیلئے اقرار کیا ہے) نے بھی اس کی تصدیق کی تو اس کا نسب اس کے ساتھ ثابت ہوگا اور اقرار باطل ہوگا اس لیے کہ بیٹے ہونے کا دعویٰ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نسب حمل ٹھہرنے کے زمانے سے اس کے ساتھ ثابت ہوگا گویا اس نے اپنے بیٹے کیلئے اقرار کیا اور اپنے وارث کیلئے اقرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی اجنبی عورت کیلئے اقرار کیا پھر اس کے ساتھ نکاح کر لیا تو نکاح کرنے سے اقرار باطل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ زوجیت کا تعلق زمانہ نکاح کے ساتھ محدود ہے اور اجنبیہ کیلئے اقرار باقی ہے۔ جس شخص نے اپنی بیوی کو اس کے مطالبہ پر تین یا اس سے کم طلاقیں دیں پھر اس عورت کیلئے قرض کا اقرار کر دیا پھر وہ عورت کے عدت گزارنے کے زمانے میں انتقال کر گیا تو عورت کے لئے میراث اور اقرار (دین) میں سے جو بھی کم ہوگا اس کی وہ حقدار ہوگی کیونکہ دین اور میراث میں سے

جو کم ہو اس کے دینے میں اس پر کوئی تہمت کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہ اس وقت ہے کہ جب طلاق عورت کی رضامندی سے دی ہو یعنی اس کے مرض الوفات میں عورت نے اس سے طلاق کی درخواست کی ہو جس پر اس نے اس کو طلاق دے دی ہو۔

اور اگر طلاق عورت کی رضامندی کے بغیر دی ہو تو میراث ہی کی مستحق ہوگی خواہ وہ جتنی بھی ہو اگر اس کے مرنے سے قبل عدت پوری ہوگئی تو اقرار یعنی دین کی حقدار ہوگی میراث نہیں ملے گی۔ اگر وہ عورت ان لوگوں میں سے ہو جو وارث نہیں بن سکتی مثلاً ذمی (کافر) ہو تو اس کیلئے جمیع مال کا اقرار کرے تو درست ہے اور اگر اس کیلئے وصیت کرے تو ایک تہائی مال میں اس کی وصیت نافذ ہوگی۔

ایک شخص نے غیر معلوم النسب لڑکے کے بارے میں اقرار کیا کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور لڑکا اس کا بیٹا ہونا ممکن ہے اور لڑکے نے بھی اس کی تصدیق کی' چاہے اس کے مرنے سے پہلے تصدیق کی ہو یا بعد میں تو اس لڑکے کا نسب اس سے ثابت ہوگا اگرچہ وہ مرض الموت میں ہو اور وہ میراث میں دوسرے ورثاء کے ساتھ شریک ہوگا۔ معلوم النسب نہ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ معلوم النسب کا نسب دوسرے سے ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا کسی اور کا بیٹا ہونا پہلے سے معلوم ہے تو اسکا بیٹا ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ اور لڑکے کا اس کے اقرار کی تصدیق کرنا اس وقت ضروری ہے جب وہ سمجھدار ہو اگر وہ بالکل ناسمجھ ہو تو تصدیق کرنا ضروری نہیں۔ پھر مقر (اقرار کرنے والا) اگر مرد ہے تو اس کی عمر لڑکے سے کم از کم بارہ سال زیادہ ہو اگر عورت ہے تو کم از کم نو سال زیادہ ہونا لازمی ہے۔ کسی کے بارے میں اپنے والد یا والدہ یا بیوی ہونے کا اقرار کرنا صحیح ہے البتہ ان حضرات کا تصدیق کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے اقرار کا نافذ ہونا ان کی تصدیق پر موقوف ہے۔ اگر وہ اس کی تصدیق کریں تو اس کا اقرار معتبر ہے ورنہ نہیں۔ کسی شخص کی بیوی کا کسی کے لڑکے کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ میرا بیٹا ہے تو شوہر کی تصدیق کے بغیر اس کا دعویٰ صحیح نہیں ہوگا یا دائی جو اس کی پیدائش کے وقت اس کے پاس موجود ہو گواہی دے تو اس کا دعویٰ صحیح ہوگا۔ شوہر کی تصدیق اس لیے ضروری ہے کہ نسب اس سے ثابت ہوگا۔

والدین' اولاد اور زوج وزوجہ کے علاوہ دوسرے رشتوں کے نسب کا اقرار کرے مثلاً یوں کہے فلاں میرا چچا ہے یا کہے فلاں میرا بھائی یا دادا ہے یا کہے کہ میرا پوتا ہے تو اس کے اقرار کو قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ مقرلہ اس کی تصدیق بھی کر دے کیونکہ اس صورت میں دوسرے پر نسب کو محمول کرنا لازم آتا ہے۔ لہٰذا مقر (اقرار کرنے والا) کا کوئی وارث معروف النسب موجود ہو خواہ قریبی ہو یا دور کا

ہوتو وہ مقرلہ (جس کیلئے اقرار کیا) سے مقدم ہوگا۔ میراث کا حق دار وہی ہوگا۔ کیونکہ جب اس کا نسب اس سے ثابت نہیں تو وہ معروف النسب وارث کا مزاحم نہیں ہوسکتا اور اگر اس کا کوئی معروف النسب وارث موجود نہ ہو تو مقرلہ اس کا وارث بنے گا کیونکہ اقرار کرنے والے کیلئے اپنے مال میں تصرف کرنے کا حق ہے۔ جبکہ اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو پس مقرلہ جمیع مال کا مستحق ہوگا اگرچہ اس کا نسب ثابت نہ ہو۔

کسی کے والد کا انتقال ہوگیا اس نے کسی شخص (جو غیر معروف النسب ہو) کے بارے میں اقرار کیا کہ وہ میرا بھائی ہے اس کے اقرار سے اس کا نسب اس کے والد کے ساتھ ثابت تو نہیں ہوگا لیکن میراث میں اقرار کرنے والے کے ساتھ شریک ہوگا۔ کیونکہ اقرار کرنے والے کا اقرار دو چیزوں کو شامل ہے۔ نسب کو دوسرے پر محمول کرنا جبکہ اس پر سے ولدیت حاصل نہیں لہذا نسب ثابت نہ ہوگا۔ مال میں اشتراک اور اس میں اسے ولدیت حاصل ہے لہذا یہ ثابت ہوگا۔

﴿کتاب الصلح﴾

صلح کا لغوی معنی ہوتا ہے ٹھیک کرنا' درست کرنا اور شرعی معنی ہے مخالفت ومشاجرت کے بعد تنازع کو ختم کرنے کیلئے معاہدہ کرنا۔ ارشاد خداوندی ہے: "فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا" [الحجرات ۹] "ان کے درمیان صلح کراؤ"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" [النساء ۱۲۸] "اور صلح بہتر ہے"۔ ارشاد نبوی ہے: "الصلح جائز بين المسلمين الاصلحا حرم حلالاً او احل حراماً"[1] "مسلمانوں کے درمیان صلح کرنا جائز ہے مگر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی صلح جائز نہیں ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "ردوا الخصوم كي يصطلحوا" "جھگڑنے والوں کو واپس لوٹا دو تا کہ وہ آپس میں صلح کرلیں"۔

صلح کی قسمیں:

صلح کی تین صورتیں ہیں: (۱) مدعی علیہ کے اقرار کے ساتھ صلح ہو۔ (۲) مدعی علیہ کے سکوت کے ساتھ صلح ہو یعنی مدعی علیہ مدعی کیلئے نہ اقرار کرے نہ اس کے حق کا انکار کرے۔ (۳) مدعی علیہ کی طرف سے انکار کے ساتھ صلح ہو۔

ان تینوں صورتوں میں صلح جائز ہے۔ بدل صلح میں مدعی کیلئے ملکیت ثابت ہوگی اور مدعی علیہ کا حق استرداد منقطع ہو جائے گا اور یہی آپس کے جھگڑے اور تنازع کا سبب ہے جو شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "وَلَا تَنَازَعُوا" [الانفال ۴۶] "اور جھگڑا مت کرو"۔ اگر صلح مدعی علیہ کے سکوت کے ساتھ واقع ہو یعنی وہ مدعی کے دعوے کا نہ انکار کرے نہ اقرار لیکن مدعی نے اس کے ساتھ صلح کرلی محض خصومت کو ختم کرنے کیلئے بدل صلح بھی دے دیا کیونکہ وہ اپنے زعم میں خود کو اس چیز کا مالک خیال کرتا ہے جو اس کے قبضہ میں ہے پس بدل صلح اس کا عوض نہیں ہوگا لیکن جب خصومت اس پر لازم ہوگئی تو اس کیلئے فدیہ دے کر اس سے جان چھڑانا جائز ہوگیا۔ یہی حکم مدعی علیہ کے انکار کے ساتھ صلح کی صورت میں ہے۔ وہ صرف قسم کے فدیہ کے طور پر بدل صلح ادا کرتا ہے مدعی کے حق میں بدل صلح معاوضہ کے حکم میں ہے۔ کیونکہ اپنے زعم میں اپنے دعویٰ کو درست خیال کرتا ہے اور جو کچھ اس نے بدل صلح وصول کیا ہے وہ اس کے حق کے بدلے اور عوض میں آیا ہے پس مدعی اور

[1]: ترمذی ۲/ ۲۰۳]

مدعیٰ علیہ میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنے اپنے زعم کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

اگر مدعیٰ علیہ نے کسی کے متعلق جو اس کے پاس تھا اور مدعی نے اس پر دعویٰ کیا تھا صلح کر کے بدل صلح ادا کیا چاہے اس دعوے کے انکار کے ساتھ ہو یا خاموشی کے ساتھ تو اس گھر پر کوئی شفعہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ مدعیٰ علیہ کا خیال ہے کہ اس نے بدل صلح کے بدلے اس کو نہیں خریدا ہے بلکہ قسم کھانے سے بچنے یا منازعت سے جان چھڑانے کیلئے اس نے ایسا کیا ہے اور مدعی کا قول اس پر لاگو نہیں ہوگا اور زمین پر اس کی ملکیت پہلے سے ثابت ہے وہ بدل صلح ادا کرنے کے بعد گھر کا مالک نہیں بنا ہے۔ اگر مدعی کو بدل صلح کے طور پر گھر مل گیا تو اس پر شفیع حق شفعہ دائر کر سکتا ہے کیونکہ مدعی کی دانست میں یہ گھر اس کے حق کے عوض حاصل ہوا ہے تو اس پر شفع ہو سکتا ہے اور شفیع اس کو اس حق کی قیمت کے برابر قیمت ادا کرے مدعی سے لے لے گا۔

متنازعہ چیز میں استحقاق کا ثابت ہونا:

اگر صلح مدعیٰ علیہ کے اقرار کے ساتھ ہوئی تھی اور بدل صلح ادا کر دیا گیا تھا پھر مصالح عنہ (وہ چیز جس کے بارے صلح ہوتی تھی) کے کچھ حصہ میں مدعیٰ علیہ کا حق ثابت ہوگیا تو جتنے میں اس کا استحقاق ثابت ہوا اتنی مقدار میں بدل صلح میں سے مدعی سے واپس لے لے گا کیونکہ سابق میں گزرا ہے کہ صلح مع الاقرار بیع کی طرح ہے اور اگر صلح مدعیٰ علیہ کے سکوت یا اس کے انکار کے ساتھ واقع ہوئی تھی پھر مدعیٰ علیہ کا سارے متنازع فیہ میں استحقاق ثابت ہوا تو مدعی شخص سے خصومت کے ذریعہ واپس لے گا۔ مدعیٰ علیہ نے مدعی کے ساتھ صلح اس لیے کی تھی کہ اس کو خصومت نہ کرنی پڑے اور جب استحقاق ثابت ہو گیا تو خصومت ہی ختم ہوگئی لہٰذا مدعی کے ہاتھ بدل صلح بلا عوض رہ گیا لہٰذا واپس کرنا لازمی ہو گیا۔

ایک شخص نے ایک گھر کے غیر معین حصہ میں حق دار ہونے کا دعویٰ کیا جس کے قبضے میں گھر تھا اس نے مدعی کے ساتھ صلح کر لی اور کچھ مال اس کو دے کر خصومت کو ختم کر دیا۔ پھر گھر کے کچھ حصے کا کوئی مستحق نکل آیا۔ تو مدعیٰ علیہ مدعی سے صلح کے بدلے ادا کردہ مال کو واپس لوٹنے کا مطالبہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مدعی کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو جس کا ابھی کوئی مستحق نہیں نکل آیا۔ ہاں اگر پورے گھر کا مستحق نکل آیا تو اپنا بدل صلح واپس لے سکتا ہے کیونکہ اس صورت مدعی کے ہاتھ میں بدل صلح بلا عوض رہ گیا۔

کن امور میں صلح جائز اور کن میں ناجائز؟

اموال کے دعوے منافع، قتل عمد کی جنایت اور قتل خطاء کی دیت کے مطالبے میں صلح کرنا جائز ہے البتہ مقدار دیت سے زیادہ پر صلح درست نہیں ہے کیونکہ شرعی وہی مقدار مقصود ہے اس مقدار کو ختم کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی مقدار سے زیادہ لینے کا عدم جواز قتل خطاء کی دیت میں ہے البتہ قتل عمد میں اس مقدار سے زائد لینا بھی جائز ہے کیونکہ یہاں صلح مال کے بدلے نہیں بلکہ قصاص کے بدلے ہو رہی ہے اور قصاص مال نہیں ہے اس میں مقدار معاہدے میں طے کی جائے گی۔ کسی حد شرعی کے مطالبہ پر صلح کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ حقوق اللہ میں سے ہے۔ حقوق العباد میں سے نہیں کسی اور کے حق کا عوض لینا جائز نہیں ہے چاہے حد چوری کرنے کی وجہ سے لگ رہی ہو یا کسی پر تہمت لگانے کی پاداش میں یا زنا کرنے کی وجہ سے ہو زنا اور سرقہ (چوری) میں حد کا حقوق اللہ میں سے ہونا بلا خلاف ہے یعنی اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں اور حد قذف بھی ہمارے نزدیک حق اللہ ہے لہٰذا حد قذف میں صلح کی گئی مگر کسی عدالت میں جانے سے پہلے صلح کی گئی تو بدل صلح واجب نہیں ہوگی مگر حد بھی نہیں لگے گی کیونکہ صلح کی طرف آ کر اس نے گویا اپنے مطالبے سے اعتراض کیا لیکن عدالت میں جانے کے بعد صلح پر آمادہ ہوا تو بدل صلح جائز نہیں ہوگا۔ البتہ حد ساقط نہیں ہوگی اور عدالت اس پر حد جاری کرے گی۔

دعویٰ نکاح میں مرد وعورت میں مصالحت:

ایک شخص نے ایک عورت پر دعویٰ کیا کہ وہ اس کی بیوی ہے اور عورت نے انکار کیا' پھر اس نے اس سے دعویٰ واپس لینے پر مصالحت کر لی اور کچھ مال اس کو دے کر خاموش کر لیا تو یہ ظاہری اور دنیاوی اعتبار سے جائز ہے بظاہر یہ خلع کی طرح ہوگا اور اگر حقیقت میں وہ عورت اس کی بیوی نہ ہو تو اس شخص کیلئے صلح کیلئے عوض میں مال کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

کسی عورت نے کسی مرد کے متعلق دعویٰ کیا کہ وہ اس کا شوہر ہے اور اس مرد نے دعویٰ واپس لینے کیلئے عورت کو کچھ مال دے کر صلح کر لی تو یہ صلح درست نہیں ہے کیونکہ اس نے عورت کو ترک دعویٰ کے عوض مال دیا ہے دیکھنا یہ ہوگا کہ اگر ترک دعویٰ سے آپس میں فرقت ہوتی ہے تو فرقت پر شوہر کے ذمے کچھ واجب نہیں ہوتا اور اس کو فرقت (جدائی) قرار نہ دیا جائے تو عورت اس مال کو کسی چیز کے عوض وصول کرے گی یعنی بلا عوض مال اس کے قبضے میں جا رہا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ موصلی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاختیار'' میں لکھا ہے کہ یہ صلح جائز ہے اس عوض کو جو عورت وصول کرے گی مہر میں

اضافہ تصور کیا جائے گا لیکن صحیح قول پہلے والا ہے۔

صلح میں فضولی کا تصرف:

فضولی اس غیر متعلق شخص کو کہتے ہیں جو متعلقہ شخص کی اجازت کے بغیر کسی کام کو سرانجام دے۔ ایک شخص نے دوسرے شخص پر کسی چیز کا دعویٰ کیا پھر تیسرے شخص نے طرفدار بن کر مدعی کے ساتھ دعویٰ کرنے پر صلح کرلی اور اپنی طرف سے بدل صلح ادا کیا تو معاہدہ صحیح ہے۔ کیونکہ اس نے معاہدے کو اپنی طرف منسوب کیا البتہ جو کچھ اس نے مدعی کو صلح کے عوض دیا ہے اس کا وہ مدعیٰ علیہ سے مطالبہ نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اس کی طرف سے تبرع (احسان) ہے اور مدعیٰ علیہ کی جان خصومت سے چھوٹ جائے گی اس میں مدعیٰ علیہ کا کوئی نقصان نہیں تو یہ عقد صحیح ہے۔ گویا یہ مدیون کے حکم کے بغیر اس کے دین کی ادائیگی کی ذمہ داری لینے کی طرح ہے۔

فضولی نے مدعی سے کہا کہ میں نے اس رقم کے عوض تجھ سے صلح کرلی تو یہ درست ہے تو یہ رقم مشارالیہ کو ادا کرنا ضروری ہوگا یا اس طرح کہہ دے کہ میں نے فلاں کی طرف سے ایک ہزار روپے کے عوض تجھ سے صلح کرلی تو یہ بھی درست ہے اور ایک ہزار روپیہ مدعی کو ادا کردیا تو صلح صحیح ہوگی۔ اگر ایک ہزار روپیہ مدعی کے حوالہ نہیں کیا تو اس صورت میں معاہدے کی صحت مدعیٰ علیہ کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اگر مدعی مان جائے تو عقد صحیح ہے ورنہ یہ معاہدہ کالعدم ہوگا۔

قرض پر صلح کرنا:

ایک شخص کا دوسرے پر خریدے ہوئے سامان کی قیمت کا ایک ہزار روپیہ قرض ہے اس نے اس کے ساتھ اس بات پر مصالحت کی کہ فی الحال مجھے پانچ سو روپے ادا کرو یہ معاہدہ صحیح ہے اور اس کو معاوضہ پر محمول کیا جائے گا تاکہ سود کی صورت نہ بن جائے۔ اگر مدیون نے دین دینے والے سے کہا کہ تم اپنے دین کی ادائیگی کا وقت بڑھا دو یا اس میں کچھ کمی کرو ورنہ میں تیرے دین کا اقرار نہیں کروں گا تو قرض خواہ نے وقت میں تاخیر کردی یا قرض میں سے کچھ معاف کردیا تو یہ قضاءً صحیح ہے چنانچہ دائن کیلئے وقت سے پہلے یا معاف کی ہوئی مقدار کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

ایک ہزار موجل کے بدلے ایک ہزار معجل دین پر صلح کی تو یہ صحیح ہے۔ اور اگر ایک ہزار موجل ڈالر کے بدلے ایک ہزار معجل ریال پر صلح کرلی تو یہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ یہ بیع صرف ہوئی اور بیع صرف میں ثمن اور مبیع دونوں پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا ضروری ہے اور اس میں ادھار اس لیے جائز نہیں کہ یہ حق واجب کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اگر کسی نے اپنے مقروض سے کہا کہ میرے جو ایک

ہزار روپے تم نے بعد میں دینے ہیں اس میں سے پانچ سو روپے کل مجھے دے دو اور باقی میں تجھے معاف کرتا ہوں چنانچہ مقروض نے اگلے روز پانچ سو روپے اسے دے دیئے تو باقی قرض سے بری ہو جائے گا اور اگر اگلے روز پانچ سو ادا نہیں کیے تو دین اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا۔ یعنی بعد میں ایک ہزار ہی ادا کرنا ہوں گے۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جبکہ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باقی سے بری ہو گا بعد میں بھی پانچ سو ہی دینا لازم ہو گا ہزار نہیں۔

دین مشترک کا حکم:

دین مشترک کی مثال یہ ہے کہ دو آدمیوں نے برابر برابر مال دے کر ایک عقد میں ایک چیز خریدی' پھر اس کو تیسرے شخص کے ہاتھ ثمن مؤجل کے عوض فروخت کر دیا اب ان میں سے ایک نے اگر ثمن کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا تو دوسرا بھی اس حصے میں اس کے ساتھ شریک ہو گا۔ اگر ان میں سے ایک نے اپنے حصے کے بعد ثمن پر صلح کر کے مشتری سے کوئی سامان وغیرہ خرید لیا جو دین کی جنس کے علاوہ ہو تو دوسرے شریک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس سامان کے نصف حصے کو لے لے' کیونکہ صلح آدھے دین پر ہوئی ہے اور دین دونوں کا مشترک ہے۔ اور دین کو وصول کرنے سے پہلے تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا دوسرے شریک کا حق دین کے اس حصے کے ساتھ بھی متعلق ہے تو یہ صلح اس کی اجازت پر موقوف ہو گی اور نصف سامان کو وصول کرنا دلیل اجازت ہے پس یہ عقد صحیح مانا جائے گا۔ اور صلح کرنے والا شریک اگر سامان نہ دے تو اصل دین (ثمن مبیع) کے ایک چوتھائی حصے کا ضامن ہو گا۔ جو اپنے دوسرے شریک کو ادا کرے گا اس صورت میں پھر سامان میں اس دوسرے شریک کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ اور اگر ان میں سے ایک شریک نے صلح کے الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ اپنے نصف دین کے بدلے اس سے کوئی چیز خریدی تو دوسرا شریک اس نصف کے نصف یعنی کل دین کے ایک چوتھائی کا ضامن ہو گا اور شریک اس سے اس کو وصول کرے گا کیونکہ یہاں خریدنے کا لفظ استعمال ہوا ہے صلح کا نہیں ہے۔ صلح میں دوسرے شریک کو اختیار دیا جائے کیونکہ صلح کا معاملہ عفو و درگزر اور کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر وجود پذیر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صلح کی صورت میں شریک نے مشتری کو دین کا کچھ حصہ معاف کر کے سامان پر قبضہ کر لیا ہو لہٰذا دوسرے شریک کو اختیار نہ دینے کی صورت میں اس کو نقصان کا اندیشہ ہے۔

اگر ایک شریک نے اپنے حصے کا دین مدیون کو معاف کر دیا تو دوسرا شریک اس سے اس کے آدھے کا مطالبہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے اپنا حصہ معاف کیا ہے وصول کچھ نہیں کیا ہے۔

گر ایک شریک نے اپنے حصے کے نصف دین سے مدیون کو بری کیا تو وہ باقی نصف کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور دوسرا شریک اپنے پورے نصف کا مطالبہ کرنے کا حقدار ہوگا۔ صورت مسئلہ کی اس طرح ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کے اوپر دو آدمیوں کے بیس روپے قرض ہیں ان میں سے ایک نے اپنے حصے کا آدھا یعنی پانچ روپے معاف کر دیئے تو اس کے باقی پانچ روپے اور دوسرے شریک کے مکمل دس روپے اس کے ذمہ واجب الادا ہیں وہ اس سے مطالبہ وصولی کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی کی میت کے ترکہ کے کئی ورثاء ہیں ان میں سے ایک نے کسی خاص مال پر دوسرے ورثاء کے ساتھ صلح کر لی اور کہا کہ میں صرف یہ مال لوں گا۔ باقی میراث تم آپس میں تقسیم کرلو دوسرے ورثاء نے اس کو قبول کیا اور وہ خاص مال لے کر باقی میراث سے دستبردار ہو گیا تو یہ جائز ہے۔ ترکہ چاہے زمین ہو یا عام مال جو مال اس نے لے لیا چاہے وہ زیادہ ہو یا کم بہرصورت یہ صلح جائز ہے کیونکہ یہ بیع کی طرح ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بیوی کو صلح کے طور پر ان کے مال کے آٹھویں حصے کا ایک چوتھائی یعنی اسی ہزار دینار دے کر صلح کی تھی یہ سارا واقعہ حضرات صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا کسی نے بھی اس پر تنقید نہیں فرمائی۔ اگر ترکہ میں سونا تھا اور صلح کے طور پر اس کو سونا یا کچھ اور دے دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے البتہ مجلس صلح میں اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ بھی صرف کے حکم میں ہے اور بیع صرف میں مجلس میں قبضہ شرط ہے۔ ترکہ میں اگر دین بھی ہو یعنی میت کا کسی کے اوپر قرض ہو اور صلح میں صلح کرنے والے کو دین کے مال سے نکال دیا جائے اور کہہ دیں کہ دین کے مال میں سے صلح کرنے والے کو کچھ نہیں ملے گا تو دین اور عین دونوں میں صلح باطل ہوگی کیونکہ اس میں غیر مدیون کو دین کا مالک بنانا ہے جب اس کے حصہ دین میں صلح باطل ہے تو کل میں بھی باطل ہوگی کیونکہ دونوں (دین اور عین) میں ایک ہی معاہدے کے تحت صلح ہو رہی ہے۔ البتہ اس کو جائز کرنے کا ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ صلح کرنے والے کے دین میں اس کے حصہ کی بقدر اس کو قرض دے دیا جائے اور اس سے یہ مصالحت کی جائے کہ اس قرض کے بدلے وہ قرض وصول کیا جائے گا جو اس کے حصے کا قرض دوسرے شخص پر ہے گویا اس نے اپنے دین کی وصولی کا کام دوسرے ورثاء کی تحویل میں دے دیا۔

ابن سعد نے "طبقات" میں ابن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سات سو افراد دے کر شعبان ۶ ھ میں دومۃ الجندل کی طرف مبعوث فرمایا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ بار بار دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا اس کے بعد ان کے سردار اصبغ بن عمرو الکلبی نے اسلام قبول کیا۔ عبدالرحمن

بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بذریعہ خط فرمایا۔ اصبغ کی بیٹی تماضر کے ساتھ نکاح کرلو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ نکاح کرلیا اور اس کو لے کر مدینہ منورہ چلے آئے اس کے بطن سے صرف ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ابوسلمہ تھا۔

واقدی کی ایک روایت کے مطابق ان کے مزاج میں سختی تھی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس کو دو طلاقیں دے رکھی تھیں۔ مرض الموت میں تیسری طلاق بھی دے دی دوران عدت حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو وارثت میں شامل رکھا۔

کتاب الھبۃ

لغت میں ہبہ کسی کے ساتھ مہربانی اور تبرع کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ انسانی کمال اور اچھی صفات میں سے شمار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے ساتھ اپنی ذاتی گرامی کو موصوف فرمایا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ" [ص:۹] "کیا نزدیک ان کے ہیں خزانے در رحمت پروردگار تیرے غالب بخشنے والے"۔ جب انسان اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا تو وہ عظیم صفت کا مالک ہوگا کیونکہ اس سے وہ سخاوت جیسی عظیم صفت سے بہرہ ور ہوتا ہے اور نفس کا بخل دور ہوتا ہے نیز موھوب لہ (جس کو ہبہ کیا گیا) کے دل میں خوشیوں کی لہر دوڑتی ہے۔ اس سے آپس کے بغض وحسد کافور ہو جاتا ہے آپس کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "تہادوا تحابوا"۔ "ایک دوسرے کو ہدیہ دے کر آپس میں محبت پیدا کیا کرو"۔ ہبہ کی صفت سے متصف شخص نجات یافتہ لوگوں میں سے شمار ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" [الحشر:۹] "اور جو کوئی بچایا جاوے بخیلی جان اپنی کے سے بس یہ لوگ وہی ہیں فلاح پانے والے"۔ اور ہبہ کا شرعی معنی کسی کو بلا عوض کسی چیز کا مالک بنانا ہے۔

ہبہ کا ثبوت قرآن سے بھی ارشاد ہے: "فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا" [النساء:۴] "پس اگر خوشی سے دیں واسطے تمہارے کچھ چیز سے اس میں سے جی سے پس کھاؤ اس کو خوشی کے ساتھ"۔ ہبہ کا ثبوت حدیث سے بھی ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "لو اهدی الی کراع لقبلت"[1] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے۔[2]

ہبہ کا حکم:

حضرت امام ابو منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان پر جس طرح اپنے بچے کو توحید ایمان اور اخلاقیات کی تعلیم دینا فرض ہے اسی طرح ہبہ واحسان کی تربیت دینا بھی واجب ہے کیونکہ اس سے دنیا کی محبت دل سے نکلتی ہے دنیا کی محبت تو تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

ہبہ کرنا مندوب ومستحب ہے اس کو قبول کرنا سنت ہے۔ ہاں اگر قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو دوسری بات ہے مثلاً اسے معلوم ہو کہ جو چیز اس کو ہبہ میں مل رہی ہے وہ حرام ہے یا یہ

[1] الترمذی:۳/ص۶۲۳ [2] ابوداؤد:۳/۲۹۰

خطرہ ہو کہ ہبہ کرنے والا ہبہ کرکے احسان جتاتا پھرے گا تو قبول نہ کرنا خلاف سنت نہیں ہوگا۔

ہبہ کا رکن:

ہبہ کے دو رکن ہیں۔ ہبہ کرنے والے کی طرف سے ایجاب اور موہوب لہ کی طرف سے قبول۔ البتہ بعض دفعہ صرف واہب کے ایجاب سے بھی ہبہ درست ہو جاتا ہے۔ اور ہبہ کے مکمل ہونے کی شرط اس پر قبضہ کرنا ہے کیونکہ موہوب لہ کیلئے ملکیت کے ثابت ہونے کیلئے قبضہ ضروری ہے۔ کیونکہ ہبہ عقد تبرع ہے قبضہ سے پہلے واہب کو ہبہ سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے قبضہ سے پہلے موہوب لہ کو مالک بنانا ہبہ کرنے والے پر اس چیز کو لازم کرتا ہے جس کا اس نے التزام نہیں کیا ہے۔ قبضہ کے شرط ہونے کی دلیل ''ہبہ سے رجوع'' کی بحث میں آئیگی۔

ہبہ پر قبضہ:

اگر مجلس ہبہ میں موہوب لہ نے موہوب چیز پر ہبہ کرنے والے کے حکم کے بغیر قبضہ کرلیا اور ہبہ کرنے والے نے اس کو نہیں روکا تو یہ استحسانا جائز ہے کیونکہ ایجاب قبضہ کرنے کے حکم پر دلالت کرتا ہے لیکن مجلس برخاست ہونے کے بعد قبضہ کرے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ الا یہ کہ واہب اس کو قبضہ کرنے کیلئے کہدے اور اگر واہب قبضہ سے روکے تو قبضہ کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ قبضہ سے روکنا رجوع کرنے کی دلیل ہے اور اگر مال موہوب' موہوب لہ کے پاس پہلے سے بطور عاریۃ یا امانت کے یا کرایہ کے طور پر موجود تھا یا اس نے زبردستی اپنے پاس رکھا تھا تو صرف ہبہ کرنے سے ملکیت آجاتی ہے اور ہبہ تام ہو جاتا ہے کیونکہ اگر موہوب چیز امانت کے طور پر اس کے قبضے میں ہو تو وہ ہبہ کے قائم مقام ہوگی اور اگر کسی عوض کے تحت اس کے پاس موجود ہو تو وہ بطریق اولیٰ ہبہ کے قائم مقام ہوگی۔

اگر باپ اپنے چھوٹے بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کردے تو محض اس کے کہنے سے ہبہ تام ہو جاتا ہے قبضہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خود موہوب لہ (بیٹا) باپ کی زیر سرپرستی اور قبضے میں ہے لہٰذا ہبہ کے طور پر قبضہ کرنے کے حکم میں ہوگا چاہے وہ اس کے قبضے میں ہو یا اس کے سرپرست کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے کہ سرپرست کا قبضہ اس کا قبضہ شمار ہوتا ہے یہی حکم ہے جب والدہ اپنے چھوٹے بیٹے کیلئے ہبہ کرلے اور وہ اس کی سرپرست اور پرورش کرنے والی ماں ہی ہو اور باپ کا انتقال ہو گیا ہو اور باپ کا کوئی وصی بھی موجود نہ ہے اگر کسی اجنبی نے بچے کو کوئی چیز ہبہ کردی بچے کے باپ نے اس پر قبضہ کرلیا تو ہبہ تام ہوگا اس لیے کہ باپ اپنے بچے کے تمام امور کا مالک ہے حتیٰ کے بچے کے نفع ونقصان کا بھی وہی ذمہ دار ہے۔

کسی یتیم بچے کو ہبہ کیا گیا اس کے ولی (سرپرست) نے اس کو قبضہ میں لے لیا تو یہ جائز ہے اور ہبہ مکمل ہے۔ (ولی باپ یا اس کا وصی دادا اس کا ولی ہے) اگر وہ اپنی ماں کی سرپرستی میں ہے یا بھائی کے زیر پرورش ہے یا چچا اس کی سرپرستی کر رہا ہو تو ماں کا موہوب چیز پر قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ بھائی اور چچا پر اس کی اور اس کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اگر وہ بچہ کسی اجنبی کے زیر پرورش ہے تو پرورش کرنے والے کا اس موہوب چیز پر قبضہ کرنا درست ہے اگر بچہ خود موہوب چیز اپنے قبضہ میں لے لے تو درست ہے بشرطیکہ اس میں نفع ونقصان کی تمیز ہو کیونکہ وہ منافع میں محض بالغ کی طرح ہے حتیٰ کے باپ کی موجودگی میں بھی اس کا مالک بن سکتا ہے۔

دو آدمیوں نے ایک چیز کسی کو ہبہ کی تو یہ شرعی لحاظ سے صحیح ہے اور اگر ایک آدمی نے ایک گھر دو آدمیوں کو ہبہ کیا تو یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں گھر کا نصف حصہ دونوں میں مشترک ہوگا تو غیر متعین اشتراک لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے جبکہ پہلی صورت میں دونوں نے ایک گھر اکٹھے ایک ہی وقت میں ہبہ کیے اور اس نے بیک وقت اس پر قبضہ کر لیا جبکہ حضرات صاحبین کے نزدیک دوسری صورت بھی صحیح ہے کیونکہ یہاں بھی سارا گھر دونوں کیلئے ہبہ کیا گیا ہے تملیک چونکہ واحد ہے اس لیے شیوع (اشتراک) کی صورت نہیں ہوگی۔ ترجیح امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کو ہے۔

ہبہ سے رجوع کرنا:

اگر کوئی چیز اجنبی کیلئے ہبہ کی گئی اور موہوب لہ نے ہبہ پر قبضہ بھی کر لیا تو پھر بھی واہب کو رجوع کا حق حاصل ہے کیونکہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "من وهب هبة فهو احق بها مالم يثب منها"[1] "جو ہبہ کرے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے جب تک کہ اس پر عوض وصول نہ کرے"۔ لیکن ہبہ کر کے رجوع کرنا مکروہ ہے۔ پسندیدہ امر نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "العائد في هبة كالعائد في قيه"[2] "ہبہ کر کے رجوع کرنے والا ایسا ہے جس طرح قے کر کے چاٹنے والا"۔ ہبہ سے رجوع کرنا خساست اور کمینگی ہے۔

سوال: پہلی حدیث "من وهب هبة فهو احق بها"۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ سے رجوع کرنا جائز ہے جبکہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے ہبہ سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے کہ "لا يحل لرجل ان يعطي عطية او يهب هبة فيرجع فيها الا الوالد فيما يعطي ولده مثل الذي يعطي العطية ثم يرجع فيها كمثل الكلب ياكل

---

[1] [سنن بیہقی: ۱۸۱/۲] [2] [سنن ابوداؤد: ۲۹۱/۳]

فاذا شبع قاء ثم عاد فی قیہ "[1] "کسی کو عطیہ دے کر یا ہبہ کر کے رجوع کرنا حلال نہیں ہے مگر والد اپنے بیٹے کو کچھ عطاء کر کے واپس لے سکتا ہے۔ کسی کو کچھ عطاء کر کے یا ہبہ کر کے واپس لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو پیٹ بھر کر کھا کر اس کو قے کر لے اور اس قے کو چاٹے"۔

جواب: یعنی موہوب لہ کی رضامندی اور فیصلے کے بغیر ہبہ سے رجوع کرنا حلال نہیں ہے مگر والد کیلئے اپنی اولاد کو ہبہ کر کے واپس لینا جائز ہے اور ایسا ضرورت کے وقت جائز ہے۔ اور والد کے ہبہ سے رجوع کرنے کی مثال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل ہے جس کو سیدہ عائشہؓ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے باغ میں سے بیس وسق منتخب کھجوریں مجھے لینے کی اجازت زبانی مرحمت فرمائی تھی قبضہ نہیں دیا تھا۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو مجھ سے فرمایا کے اے میری لخت جگر! مجھے یہ بہت پسند ہے کہ میں تجھے خوش حال دیکھوں اور میرے بعد تیری محتاجی مجھ پر زیادہ باعث تکلیف ہوگی۔ میں نے بیس وسق کھجوریں ہر سال وصول کرنے کیلئے کہا تھا اب تک جو کچھ تم نے وصول کر لی ہیں وہ تو تیری ہیں لیکن اب یہ مال وراثت ہے تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں اور بھی ہیں کتاب اللہ کے حکم کے مطابق اس کو میراث میں تقسیم کرلو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا ابا جان! بات اگر ایسی ہے تو میں اس کو چھوڑ تی ہوں لیکن یہ بتایئے کہ میری بہن تو ایک "اسماء" ہے دوسری کون ہے؟ فرمایا "ذوبطن بنت خارجہ"[2] یعنی (باندی)۔

ہبہ بالعوض سے رجوع نہیں کیا جا سکتا:

اگر موہوب لہ نے واہب کو ہبہ کے عوض کچھ دے دیا اور واہب نے عوض پر قبضہ کر لیا اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ ہبہ کا عوض اور بدل ہے تو اب اس کو ہبہ سے رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "من وھب ھبۃ فھو احق بھا مالم یثب منھا" "جو ہبہ کرے وہی اس کا حقدار ہے جب تک کہ اس پر عوض وصول نہ کرے"۔

جب اس نے اس کے بدلے عوض وصول کر لیا تو اس نے اس کا بدل یعنی (ہبہ) کو اس کے حوالہ کر دیا اب اس کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا چاہے عوض قلیل ہو یا کثیر۔ موہوب چیز اس کی جنس میں سے ہو یا غیر جنس میں سے ہو البتہ واہب کو یہ معلوم ہونا شرط ہے کہ یہ ہبہ کا عوض ہے۔ یا اس کے بدلے میں مجھے ملا ہے لیکن اگر ایسی بات نہ ہو اور دینے والا اس کا تذکرہ بھی نہ کیا ہو اور نہ اسکے حاشیہ خیال میں آیا کہ یہ میرے ہبہ کا عوض ہے تو دونوں کو حق رجوع حاصل ہے۔

ہبہ کردہ مال میں اضافہ سے بھی رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے چنانچہ کسی کو گھر بطور ہبہ ملا

---

[1] ابوداؤد: ۲۹۱/۳ [2] ... ۱۴۵۰

گیا اس نے اس میں مزید تعمیرات کیں تو ہبہ کرنے والا رجوع نہیں کرسکتا کیونکہ ہبہ میں اضافہ کی وجہ سے رجوع کرنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن موہوب میں موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا گیا ہو) کے تصرف یا کسی اور وجہ سے کمی اور نقص پیدا ہونا حق رجوع کو ساقط نہیں کرتا ہے۔

موت سے بھی حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے:

اگر ہبہ کرنے والا یا وہ شخص جس کو ہبہ کیا گیا تھا فوت ہو گیا تو ہبہ کرنے والے کے ورثاء کو ہبہ واپس لینے کا حق ختم ہو گیا کیونکہ موہوب لہ کے مرنے سے ملکیت اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو گئی ہے اور واہب کے مرنے سے اس کے ورثاء ہبہ کے معاملہ میں بھی اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

موہوب چیز کا موہوب لہ کی ملکیت سے نکلنا بھی حق رجوع کو ساقط کرتا ہے:

اگر موہوب چیز موہوب لہ کی ملکیت سے فروخت کرنے کی وجہ سے یا کسی کو ہبہ کرنے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے خارج ہو جائے تو بھی واہب کیلئے ہبہ سے رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ موہوب لہ نے اس کو آگے ہبہ کر دو بارہ اس سے رجوع کر کے موہوب کو اپنے قبضے میں لے بھی لیا تب بھی واہب اول کیلئے رجوع کا حق نہیں رہتا۔

محرم رشتہ دار کو بھی ہبہ میں رجوع کا حق حاصل نہیں ہے اگر اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو ہبہ کیا اور موہوب لہ نے اس کو اپنے قبضے میں لے لیا تو اب ہبہ کرنے والے کیلئے ہبہ کو واپس لینا جائز نہیں ہے۔ ہاں قبضہ سے پہلے رجوع کرنے کا اسے اختیار حاصل ہے کیونکہ رشتہ دار کو ہبہ کرنے کا مقصد صلہ رحمی کو بڑھانا ہوتا ہے اور ہبہ کر کے واپس لینا اس صلہ رحمی میں رخنہ اندازی ہے۔ اس لیے یہ درست نہیں ہے لیکن رضاعی رشتہ دار یا بیوی کی طرف سے رشتے داروں کو ہبہ کرنے کے بعد اس سے رجوع کرنا جائز ہے۔

میاں بیوی کیلئے بھی ہبہ کرنے کے بعد اس سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں بھی ہبہ سے مقصود آپس میں کی محبت کو بڑھانا اور ہبہ کو واپس لینے میں الفت ختم اور نفرت بڑھتی ہے۔ بعض حضرات نے مانع رجوع کو یاد کرنے اور اسے آسان کرنے کیلئے یہ شعر کہا ہے:

"ومانع عن الرجوع فی الھبۃ　　　یا صاحبی حروف (دمع خزقۃ)"

یعنی انہوں نے "دمع خزقہ" میں موانع رجوع جمع کر دیے ہیں وہ اس طرح کہ دال سے

مراد موہوب چیز میں زیادتی' میم سے مراد موہوب لہ یا واہب کی موت عین سے عوض خاء سے موہوب چیز کا موہوب لہ کی ملکیت سے خارج ہونا' زاء سے زوجیت' قاف سے قرابت اور ہاء سے موہوب لہ کی ہلاکت مراد ہے۔

ہبہ میں رجوع کے صحیح ہونے کی شرائط:

واہب اور موہوب لہ کی رضامندی شرط ہے یا عدالت کا فیصلہ اگر آپس کی رضامندی سے واپس کیا ہو تو اس نے خود اپنے حق کو باطل کیا ہے۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ موہوب چیز واہب کو واپس دیدی جائے اگر عدالت کے فیصلے کے بعد واہب کو واپس کرنے سے قبل موہوب لہ کے پاس ہلاک ہو جائے تو موہوب لہ ضامن نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کے ہاتھ میں امانت ہے اور امانت کی ہلاکت سے ضمان نہیں آتا۔

عمر بھر کیلئے ہبہ کرنا:

عمر بھر کیلئے ہبہ کرنا درست ہے یعنی ہبہ صحیح ہوگا مگر تاحیات کی شرط ساقط ہو جائے گی جس کو تاحیات ہبہ کیا تھا اس کے انتقال سے موہوب تو واپس واہب کی طرف نہیں لوٹے گی بلکہ وہ بدستور موہوب لہ سے اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگی کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "**العمریٰ جائزة**" تاحیات ہبہ جائز ہے۔ دوسرا ارشاد ہے: "**العمریٰ میراث لا هلها**"۔ تاحیات ہبہ موہوب کے ورثاء کی میراث ہے۔ تیسرا ارشاد ہے: "**ایما رجل اعمر عمری له ولعقبه فانها للذی اعطیها لا ترجع الی الذی اعطا ها لا نه اعطی عطاء وقعت فیه المواریث**" [1] "جو چیز کسی کو تاحیات ہبہ کی گئی ہو وہ موہوب لہ کا حق ہے واہب کو واپس نہیں لوٹائی جائے گی اس لیے کہ اس نے ایسی چیز عطا کی ہے جس میں میراث جاری ہوتی ہے"۔ چنانچہ اگر کسی نے گھر کسی کو ہبہ کر کے کہا کہ یہ گھر تیری زندگی میں تیرا ہے اور تیرے مرنے کے بعد میں واپس لوں گا تو ہبہ صحیح ہے گھر موہوب لہ کا ہوگا مگر مرنے پر واپسی کی شرط باطل ہو جائے گی۔ اور ہبہ شرط باطل سے باطل نہیں ہوتا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**امسکو علیکم اموالکم ولا تفسدوها فانه من اعمر عمری فهی للذی اعمرها حیا ومیتا ولعقبه**" [2] "اپنے اموال کو اپنے پاس رکھو اس کو فاسد مت کرو جس کو عمر بھر کیلئے ہبہ کیا گیا وہ زندگی میں بھی اس کا ہے اور مرنے کے بعد بھی"۔ اسی طرح اگر ہبہ کر کے موہوب لہ سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر تو پہلے مر گیا

---

[1] مسلم: ۱۲۴۵/۳
[2] مسلم ۱۲۴۶/۳

تو یہ میرا ہوگا اور کہیں تم سے پہلے مر گیا تو مستقل طور پر تیری ملکیت ہوگی۔ اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''رقبیٰ'' کہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کے مرنے کا انتظار کرنا۔ امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے اس سے ہبہ نہیں ہوگا اگر گھر موہوب لہ کے حوالہ کر دیا تو اس کے ہاتھ میں مستعار (بطور عاریت) ہوگا موہوب لہ اس کا مالک نہیں بنے گا بلکہ مالک جب چاہے اس کو واپس لے سکتا ہے۔

اور امام ابو یوسف ؒ کے نزدیک یہ ہبہ ہے اور صحیح ہے کیونکہ واہب کا یہ کہنا کہ میرا یہ گھر تیرا ہے تملیک ہے۔ اور رقبیٰ کی شرط لگانا شرط فاسد ہے۔ یہ ہبہ صحیح ہوگا اور شرط کا اعتبار نہیں ہوگا دلیل اس کی حضرت جابر ؓ کی روایت ہے ارشاد نبوی ہے ''العمریٰ جائزۃ لمن ارقبھا''۔

صدقہ:

صدقہ قبضے کے بغیر تام نہیں ہوگا یہ بھی ہبہ کی طرح ایک تبرع (احسان) ہے قبضہ ہونے کے بعد اس کو واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ صدقہ کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دربار عالی سے ثواب کا حاصل کرنا ہے چاہے فقیر پہ صدقہ کرے چاہے غنی پر لیکن غنی کو صدقہ کرنے کے بعد رجوع کرنا قیاس کے خلاف نہیں ہے کیونکہ غنی کو صدقہ کرنا دنیاوی غرض سے ہوتا ہے لیکن فقہاء نے فرمایا رجوع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس کو صدقہ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔

صدقہ کرنے کی نذر ماننا:

جو شخص اپنے مال میں سے صدقہ کرنے کی نذر مانے اور کہے کہ ''میں اپنے مال میں سے صدقہ کرنے کی نذر مانتا ہوں'' تو جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کی جنس میں سے صدقہ کرنا استحساناً ضروری ہوگا۔ اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ سارے مال کا صدقہ لازم ہوگا استحسان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا کسی چیز کو اپنے اوپر واجب کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے پس بندے کا واجب کرنا گویا اللہ تعالیٰ کا واجب کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے زکوٰۃ واجب ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ کی مقدار کے مطابق مال واجب ہوگا۔ اس شخص کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فاضل مال کو صدقہ کرے گا اور وہ مال زکوٰۃ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ'' [التوبہ:۱۰۳] ''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیں جو ان کو پاک وصاف کرے گا''۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر یہ کہہ دے کہ میں مملوک مال کو صدقہ کرنے کی نذر مانتا ہوں تو سارے مال کو صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا مگر صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں بھی پہلی صورت کی طرح مقدار زکوٰۃ ہی واجب ہوگی۔

اگر کوئی شخص یوں کہہ دے کہ "میرا گھر مساکین کیلئے صدقہ ہے" تو اس کو صدقہ کرنا ضروری ہوگا اور اگر اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو صدقہ کیا تو یہ بھی جائز ہے۔ ایک شخص نے مزاح کے طور پر دوسرے شخص سے کہا کہ یار یہ چیز مجھے ہبہ کرو اس نے کہا میں نے تجھے ہبہ کردی۔ اس نے کہا کہ میں نے قبول کرلی پھر اس نے وہ چیز اس کے حوالہ کردی تو یہ ہبہ صحیح ہے اور جائز ہے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک کہیں جارہے تھے کہ راستہ میں دیکھا کہ کچھ لوگ دف بجارہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے ان سے فرمایا: یہ دف مجھے ہبہ کردو اور دیکھو کہ میں کس طرح دف بجاتا ہوں لوگوں نے دف ان کے حوالہ کردی انہوں نے دف کو زمین دے مارا اور اس کو توڑ دیا پھر لوگوں سے کہا: دیکھ لیا کس طرح میں نے دف بجائی؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ نے تو ہمارے ساتھ دھوکہ کیا۔ عبداللہ بن مبارک نے ہبہ کرنے کی درخواست ضمان سے بچنے کیلئے کی تھی۔

﴿کتاب الودیعۃ﴾

ودیعت کا لغوی معنی ترک کرنا ہے۔ اسی لیے لڑائی ترک کرنے کو اہل عرب موادعۃ الحرب کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "لینتهين اقوام عن ودعهم الجمعات اوليختمن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين" [1] "لوگ اگر جمعہ یا جماعت چھوڑنے سے باز نہیں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے پھر وہ غافلوں میں سے ہوں گے"۔ دوسرا معنی حفاظت کرنا ہے۔ حضور ﷺ سفر پر جانے والوں سے فرمایا کرتے تھے: "استودع الله دينك وامانتك وخواتيم عملك" [2] "میں تیرا دین، تیری امانت اور تیرے آخری عمل کو اللہ کی حفاظت میں دیتا ہوں"۔ اسی طرح امانت بھی مودع (جس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے) کے پاس حفاظت کیلئے چھوڑی جاتی ہے اس لیے اس کو "ودیعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ودیعت کا شرعی معنی: تسليط الغير على حفظ ماله یعنی کسی دوسرے کو اپنے مال کی حفاظت پر مقرر کرنا۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں تعریف کی جاتی ہے کہ جو شخص حفاظت کرنے کا اہل اس کے پاس اپنے مال کو حفاظت کیلئے رکھوانے کو ودیعت کہا جاتا ہے۔

امانت اور ودیعت میں فرق:

ودیعت قصداً حفاظت کیلئے کوئی چیز دینے کو کہتے ہیں اور امانت بلا قصد کسی کے پاس کوئی چیز آ جانے کو کہتے ہیں۔ اس لیے ودیعت عام طور پر اس آدمی کے پاس رکھوائی جاتی ہے جو امانت و دیانت میں معروف ہو۔ یہ مشروع عقد ہے اس میں مودع (جس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے) پر ہلاکت ودیعت کی صورت میں ضمان و تاوان نہیں آتا۔ اور یہ عقد بھی ایجاب و قبول سے منعقد ہوتا ہے۔ ودیعت رکھنے والے کی طرف سے یہ کہنا کہ میں اس کو آپ کے پاس بطور امانت رکھتا ہوں۔ ایجاب ہے اور مودع کا کہنا کہ "ٹھیک ہے" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ جو قبول پر دلالت کریں قبول کہلاتا ہے۔

قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن شعیب سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی مروی ہے: "ليس على المستودع غير المغل ضمان" [3] (مال مودع میں) زیادتی

---

[1] مسلم ۲/۵۹۱　[2] ترمذی ۵/۱۶۳

نہ کرنے والے مستودع پر کوئی تاوان نہیں ہے"۔

ودیعت کا حکم:

ودیعت مودع کے ہاتھ میں امانت ہے۔ اگر اس کی زیادتی یا تصرف کے بغیر ہلاک یا تلف ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ مودع کو اختیار ہے خود اس کی حفاظت کرے یا اپنے گھر والوں سے اس کی حفاظت کرائے اس لیے کہ اس مال کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح اس مال کی بھی حفاظت کرے گا۔ اور اس کو اپنے گھر والوں کے ذریعے حفاظت کرائے بغیر اس کیلئے کوئی چارہ کار نہیں کیونکہ وہ ہر وقت گھر میں نہیں رہ سکتا نہ ہی اس مال کو اپنے ساتھ لیے پھر سکتا ہے۔ اور محالہ گھر والے ہی حفاظت کرتے ہیں البتہ گھر والوں کے علاوہ کسی اور کو دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اور اگر ودیعت رکھوانے والے نے کہا کہ اس کو حفاظت کیلئے اپنی بیوی کے حوالہ نہ کرنا اور مودع نے وہ چیز اپنی بیوی کو دیدی اور وہ ہلاک ہوگئی تو ضامن نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کو دیئے بغیر اس کیلئے کوئی چارہ کار نہیں ہے کیونکہ جب وہ گھر سے نکلتا ہے تو سارا گھر بیوی کے حوالے ہوتا ہے۔ اور اگر اپنے گھر والوں کے علاوہ کسی اور کی حفاظت میں دیدیا یا کسی اور کے پاس بطور ودیعت رکھ دیا اور وہ ہلاک ہوگیا تو ضامن ہوگا۔ کیونکہ مالک اس کے ہاتھوں حفاظت کرنے پر رضامند تھا نہ کہ غیر کے ہاتھوں۔ کیونکہ امانت و دیانت میں لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ پس اس طرح مودع مالک کے حق میں اس کے وکیل یا مضارب کی طرح ہوگیا وکیل اور مضارب کسی اور کو وکیل یا کسی کو مضارب نہیں بنا سکتے۔

اگر مودع کے گھر میں ایسی حالت پیش آئی جس کے سبب سے ودیعت کے مال کی حفاظت مخدوش نظر آنے لگی جس کی وجہ سے اس نے بغرض حفاظت وہ چیز اپنے کسی پڑوسی کو دیدی اور پڑوسی کے ہاتھ سے وہ چیز کسی وجہ سے ہلاک ہوگئی یا اس نے اس میں کوئی ایسا تصرف کیا جس کے ذریعے اس کی حفاظت ہو مگر وہ چیز ہلاک ہوگئی تو مودع کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا اور اس پر تاوان نہیں آئے گا۔ بشرطیکہ وہ اپنے اس فعل پر گواہ پیش کرے کیونکہ وہ مدعی ہے اور تاوان نہ لگنے کا دعویٰ کر رہا ہے اور مدعی پر گواہ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کی عام تشہیر ہو جائے جس کی وجہ سے اس نے مال ودیعت دوسرے کے ہاتھ رکھوایا تھا تو تب گواہ پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔

اگر ودیعت رکھنے والے نے مودع سے اس کے گھر کے ایک مخصوص کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میرا سامان (ودیعت) اس کمرے میں رکھو۔ صاحب خانہ نے اس کو دوسرے کمرے میں رکھا اور وہ ہلاک ہوگیا تو ضامن نہیں ہوگا کیونکہ یہ شرط غیر ضروری اور غیر مفید ہے۔

کیونکہ حفاظت کے حوالے سے ایک گھر کے تمام کمرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ہاں اس گھر کے علاوہ کسی اور گھر میں رکھی اور وہ ہلاک ہوگئی تو ضامن ہوگا اس لیے کہ دو مختلف گھر تحفظ اور غیر محفوظ ہونے میں مختلف ہو سکتے ہیں۔

مودع کب ضامن ہوگا:

(۱) مودع نے ودیعت کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر حفاظت کی اور ودیعت اس کے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوگئی کہ فرق کرنا مشکل ہوگیا پھر سارا مال ہلاک ہوگیا تو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں مودع ضامن ہوگا۔

(۲) مودع نے مال ودیعت میں سے کچھ خرچ کر لیا پھر اپنے مال میں سے خرچ کردہ مال کو دوبارہ ودیعت میں شامل کر دیا اور وہ آپس میں مخلوط ہوگئے پھر وہ ہلاک ہوگیا تو اس صورت میں بھی مکمل ودیعت کا ضامن ہوگا کیونکہ پہلے اس نے اس میں تصرف کر کے اس میں سے کچھ مال اپنے مال کے ساتھ ملا دیا اور یہ ہلاک کرنے کی طرح ہے۔ تاوان کا نہ آنا ہلاک ہونے کی صورت میں ہے لیکن ہلاک کرنے کی صورت میں تاوان آئے گا۔

(۳) ودیعت کے مالک نے واپسی کا مطالبہ کیا اور مودع نے واپس کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود واپس نہیں کیا اور وہ مال اس کے پاس ہلاک ہوگیا تو ضامن ہوگا۔ کیونکہ اس نے واپس نہ کر کے اس پر زیادتی کی اور یہ مسئلہ غاصب کے حکم کی طرح ہے۔ لیکن اگر واپس نہ کرنا کسی معقول عذر کی وجہ سے ہو مثلاً واپس کرنے پر قادر نہ ہو یا اپنی جان کے تلف ہونے یا مال ودیعت کے تلف ہونے کا خطرہ ہو اور واپس نہ کر سکا اور پھر اس کے ہاں وہ ہلاک ہوگیا تو ضامن نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر صاحب ودیعت نے اس کا مطالبہ کیا اور مودع نے کہا کہ اس وقت میں اس کو واپس کرنے پر قادر نہیں ہوں اور مودع نے اس کو اس وقت چھوڑ دیا اور پھر وہ مال مودع کے پاس ہلاک ہوگیا تو پھر مودع ضامن نہیں ہوگا کیونکہ اس وقت اس کے پاس چھوڑنا گویا امانت رکھنا ہے۔ اگر صاحب مال نے واپسی کا مطالبہ کیا اور مودع نے کہا کہ کل طلب کر لینا اس نے کہا کہ ٹھیک ہے پھر کل آنے سے قبل وہ مال ہلاک ہوگیا تب بھی مودع پر تاوان نہیں پڑے گا۔

(۴) صاحب مال نے واپسی کا مطالبہ کیا مودع نے اس کا انکار کیا اور وہ ہلاک ہوگیا تو ضمان آئے گا کیونکہ اس نے ودیعت واپس کرنے کا مطالبہ کیا تو گویا اس نے اس مال کو اس کی

حفاظت سے الگ کر دیا اور اس نے اس کا انکار کر کے گویا اس پر ناجائز قبضہ کیا پس یہ غاصب کی طرح ہو گیا اور غاصب پر تاوان آتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر مودع نے مالک کے علاوہ کسی اور کے سامنے ودیعت کا انکار پھر وہ مودع کے پاس ہلاک ہو گیا تو ضامن نہیں ہو گا۔ صاحب مال نے مودع سے خفیہ طور پر کہا کہ جو شخص تیرے پاس آ کر اس کی فلاں علامت بتا دے تو یہ اس کو دے دینا پھر ایک شخص نے مودع کے پاس آ کر وہی علامت بتلا کر اس کا مطالبہ کیا۔ مودع نے مال ودیعت اس کو نہیں دیا پھر مال ودیعت ہلاک ہو گیا تب بھی وہ ضامن نہیں ہو گا اور اگر مودع یا اس کے وکیل کی موجودگی میں انکار کیا پھر حوالے کرنے سے قبل اس کے ہاتھ میں ہلاک ہو گیا تو ضامن ہو گا۔ اور اگر صاحب مال یا اس کے وکیل کے علاوہ کسی اور سامنے انکار کیا تو ضامن نہیں ہو گا۔ یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ہے کیونکہ بعض اوقات انسان حفاظت کی غرض سے بھی ودیعت کو چھپاتا ہے اور یہاں اس کا انکار کرنا بغرض حفاظت ہے کیونکہ اس میں لالچی لوگوں کی طمع کو ختم کرنا ہے۔

ایک آدمی کے پاس دو آدمیوں کے ودیعت رکھنے کا حکم:

دو افراد نے ایک شخص کے پاس کوئی موزونی (جس کا وزن کیا جاتا ہو) چیز ودیعت کے طور پر رکھ دی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے آ کر اپنے حصے کی چیز واپس کرنے کا مطالبہ کیا تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مودع اس کو یہ حصہ اس وقت تک نہ دینے کا مجاز ہو گا جب تک کہ وہ اپنے دوسرے شریک کو بھی حاضر نہ کر دے۔ کیونکہ وہ اپنے جدا حصے کا مطالبہ کر رہا ہے جبکہ اس کا حصہ مال مشاع میں ہے اور جدا تو تقسیم کے بعد ہی ہو گا اور وہ ابھی تک تقسیم نہیں ہوا۔ جب مودع کو دینا ممکن نہیں تو اس کو اس کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف، امام محمد) فرماتے ہیں کہ اس کا حصہ اس کے حوالے کر دے کیونکہ اس نے اپنا حصہ اس کے حوالے کیا ہے تو عند الطلب وہ اس کو واپس کرے۔ لیکن فتویٰ امام صاحب رحمہ اللہ کے قول ہے۔ اگر ایک شخص نے دو آدمیوں کے پاس کوئی قابل تقسیم چیز بطور ودیعت رکھی تو ان میں سے کوئی ایک سارا مال ودیعت اپنے پاس رکھنے کا مجاز نہیں ہو گا۔ ہاں اس کو تقسیم کر کے آدھا آدھا کر کے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ چیز قابل تقسیم ہو تو ایک کی اجازت سے دوسرا اس کی حفاظت کر سکتا ہے اس لیے کہ مالک ان میں سے ہر ایک کے پاس رکھنے پر رضامند ہے۔

کتاب العاریت

عاریت عریۃ سے مشتق ہے اور عریۃ عطیہ کو کہتے ہیں اور شرعی معنی "تملیک المنافع بغیر عوض" ہے۔ یعنی کسی چیز کے منافع کو بلاعوض کسی کی ملکیت میں دینا یہ احسان کی ایک نوع ہے۔ عاریت کے صحیح ہونے کی شرط عاریہ کا قابل انتفاع ہونا ہے ذات کے باقی رہنے کے ساتھ یہ معاہدہ بھی شرعاً جائز ہے۔ یہ بھی ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے۔ انسانی ضرورت کے پیش نظر شروع ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے: "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" (المائدہ ۲) "نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو"۔

کن الفاظ سے عاریت منعقد ہوتی ہے:

عاریت صحیح ہوتی ہے ان الفاظ سے۔ مثلاً کہا کہ میں نے یہ گاڑی تمہیں بطور عاریت دے دی' یا کہہ دے کہ اس گاڑی سے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو، یا کہہ دے کہ یہ گھر میں نے تمہیں رہنے کیلئے دیا' یا کہہ دے کہ جب تک تمہاری ضرورت ہے اسے اپنے استعمال میں لاؤ' یا کہہ دے کہ اس کو اپنی ضرورت میں استعمال کرو۔ یا اس جیسے دوسرے الفاظ سے منعقد ہوتا ہے۔

مستعار کی قسمیں:

جو چیز استعمال کیلئے کسی کو عاریۃً دی جاتی ہے اس کو مستعار کہتے ہیں ہے۔ یہ مستعار چیز دو قسموں پر ہوتی ہے (۱) وہ ہے جس کے انتفاع سے اس کی ذات ختم نہیں ہوتی' مثلاً گاڑی' کپڑے' گھر وغیرہ ان کو استعمال کرنے سے اس کی ذات ختم نہیں ہوتی لہٰذا ایسی اشیاء استعمال کیلئے کسی کو دینا عاریت حقیقیہ کہلاتا ہے۔ (۲) وہ چیز جس کی ذات کو ختم کیے بغیر اس سے فائدہ حاصل نہ کیا جاتا ہو مثلاً نقدی' انڈے کھانے پینے کی دیگر اشیاء کہ ان کو عاریۃ دینا عاریت مجازی کہلاتا ہے اور عاریت معناً قرض ہے۔

عاریت کا حکم:

عاریہ (مال مستعار) مستعیر (جس کو استعمال کیلئے دیا) کے پاس امانت ہوتا ہے اگر اس پر

زیادتی نہیں کی اور وہ ہلاک ہوگیا تو اس پر کوئی ضمان نہیں آئے گا۔ دلیل اس کی قاضی شریح کی روایت ہے جو سابق میں بھی گزری ہے کہ "لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان" یعنی مستعیر نے اگر زیادتی نہیں کی اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

دوسری وجہ ضمان نہ آنے کی یہ بھی ہے کہ جب اس نے مالک سے اس کو وصول کیا تھا تو ضمان دینے کی شرط پر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ عاریت کی تعریف اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ منافع کوئی عوض نہ ہو۔ لہٰذا تعدی (زیادتی) کے بغیر ہلاک ہوگیا تو ضمان نہیں ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے: "علی الید ما اخذت حتی تودی" قتادہ جو اس روایت کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ حسن بن سمرہ نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔ مذکورہ الفاظ بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا: "هو امینک لا ضمان علیه" امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بیان کر کے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[1]

نیز حضرت یعلیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اگر میرا نمائندہ تیرے پاس آجائے تو اس کو تیس زرہیں اور تیس اونٹ دے دینا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ: ضمان والی عاریت کے طور پر یا بلا ضمان عاریت کے طور پر۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا ضمان وتاوان کی شرط پر۔[2]

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت صفوان سے فرمایا: صفوان! کیا تمہارے پاس اسلحہ موجود ہے؟ عرض کیا: عاریتہ کے طور پر یا غصب کے طور پر؟ فرمایا نہیں بلکہ عاریت کے طور پر۔ تو صفوان نے حضور اقدس ﷺ کو تیس سے چالیس کے درمیان زرہیں بطور عاریت استعمال کیلئے دیدیں۔ حضور ﷺ نے انہیں غزوہ حنین میں استعمال میں لایا جب غزوہ ختم ہوا مشرکین کو شکست ہوگئی تو صفوان کی زرہوں کو جمع کیا گیا ان میں سے بعض ٹوٹ ہوگئیں تھیں حضور ﷺ نے صفوان سے فرمایا: ہم نے آپ کے بعض زرہوں کو توڑ دیا کیا اس کا تاوان تمہیں دیدیں؟ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! نہیں۔ کیونکہ آج جو بات میرے دل میں پیوست ہے وہ اس دن نہیں تھی۔[3]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ غزوہ حنین کے موقع پر حضور ﷺ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں عاریت کے طور پر طلب فرمائیں۔ صفوان نے کہا کہ کیا غصب کے طور پر لے رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں بلکہ قابل ضمان عاریت کے طور پر۔ بظاہر پچھلی روایت اور اس روایت میں تعارض معلوم ہوتا ہے دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی جس کو نصب الرایہ میں بھی بیان

---

[1] [ترمذی: ۲، ص ۳۶۹] [2] [ابوداؤد: ۲/۲۹۶] [3]: [ابوداؤد ۲، ص ۲۹۷]

کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے صفوان سے دو مرتبہ عاریت کے طور پر چیزیں لی ہیں۔ ایک مرتبہ ضمان دینے کی شرط پر اور دوسری مرتبہ بلا ضمان کے لی تھیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مستعار چیز مستعیر کے پاس ہلاک ہو جائے تو مستعیر ضامن نہیں ہوگا بشرطیکہ اس نے اس پر کوئی زیادتی نہ ہوئی۔ امام صاحب کی دلیل قاضی شریح کی روایت ہے۔ "لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان" "زیادتی نہ کرنے والے مستعیر پر تاوان نہیں"۔

کیا مستعیر عاریت کو آگے عاریۃً دے سکتا ہے؟

جب یہ ثابت ہے کہ عاریہ منافع کا بلاعوض کسی کو مالک بنانا ہے تو مستعیر اس مستعار چیز کے منافع کا مالک ہے۔ اور آگے استعمال کیلئے کسی کو دے سکتا ہے بشرطیکہ جس کو دے رہا ہے وہ اس کو استعمال مستعیر کی طرح کرے۔ اور اس کا استعمال مستعیر کے استعمال سے مختلف نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کیلئے اس پر اجرت وکرایہ لینا جائز نہیں ہوگا۔

مثلاً ایک شخص نے استعمال کیلئے بطور استعارہ گاڑی یا کپڑے یا گھر کسی سے لے لیا لیکن اس کیلئے کوئی وقت متعین نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ استعمال کون کرے گا؟ تو اس صورت میں مستعیر کیلئے جائز ہے کہ وہ کسی بھی وقت اس کو استعمال کرے اور سواری کیلئے کسی اور کو دے سکتا ہے کپڑے کو پہننے اور گھر کو رہنے کیلئے کسی اور کو دے سکتا ہے لیکن معیر (عاریت پر دینے والا) سے لینے کے بعد خود استعمال کرنا شروع کیا تو دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ اگر دے دیا اور وہ ہلاک ہو گیا تو ضامن ہوگا اس کا تاوان دینا پڑے گا اور اگر واپس کرنے کا وقت متعین کر کے لے لیا تھا اور وقت مقررہ کے بعد بھی واپس نہیں کیا اور ہلاک ہو گیا تو ضامن ہوگا تاوان دینا پڑے گا۔

کسی نے کار بطور عاریت کے لی اور استعمال کا وقت متعین نہیں کیا تو اس سے سامان برداری کا کام نہیں لے سکتا کیونکہ وہ سامان لادنے کیلئے نہیں بنائی گئی بلکہ بیٹھنے کیلئے ہے لہذا سامان لادنے کی صورت میں نقصان ہوا تو نقصان کا تاوان ہوگا۔ اسی طرح اس کو ایسا استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہوگا جس سے نقصان کا خطرہ ہو اگر ایسا استعمال کیا تب بھی نقصان کا تاوان دینا پڑے گا۔

"الخلاصہ" میں لکھا ہے کہ اگر معیر نے خاص وقت اور خاص کام میں استعمال کرنے کی شرط لگائی تو مستعیر کیلئے اس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔ اگر اس نے اس کے علاوہ بھی استعمال کیا اور نقصان ہوا تو نقصان کا ضامن ہوگا۔

کیا مستعیر شے مستعار کو بطور کرایہ کسی اور کو دے سکتا ہے:

مستعیر کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال مستعار کو کرایہ پر دے۔ اگر کرایہ پر دے دیا اور وہ ہلاک ہو گیا تو ضامن ہوگا کیونکہ وہ تعدی کرنے والا ہو گیا اور تعدی کرنے پر تاوان آتا ہے کیونکہ اس نے دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کیا اور یہی تعدی ہے۔

عاریت پر دے کر رجوع کرنا:

معیر کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنی چیز کو واپس لے سکتا ہے کیونکہ یہ عقد تبرع ہے۔ اسی طرح زمین مکان بنانے یا کاشت کرنے کیلئے عاریۃً لینا جائز ہے مگر مستعیر کو چاہیے کہ وہ اس بات کو ملحوظ نظر رکھے کہ معیر کسی بھی وقت اس کو واپس لے سکتا ہے۔

مستعیر پر لازم ہے کہ وہ عاریت کیلئے وقت مقرر کرے تاکہ کسی بھی وقت اکھاڑنے یا گرانے کے حکم سے بچ جائے۔ وقت کے عدم تعین کی صورت میں معیر کسی بھی وقت مکان گرانے کا حکم دے سکتا ہے اور اس کو یہ حق حاصل ہے البتہ اکھاڑنے میں زمین کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر اکھاڑنے کی صورت میں زمین کے خراب ہونے کا خطرہ ہو تو اس کو اپنی حالت پر رہنے دیا جائے گا اور معیر مکان کے ملبے کی قیمت دے گا یعنی عمارت کی قیمت نہیں بلکہ ملبے کی قیمت ادا کرے گا اور اگر وقت مقرر کیا تھا اور مقررہ وقت سے قبل اکھاڑنے کا حکم دیا تو ملبے کی قیمت نہیں بلکہ عمارت کی قیمت ادا کرے گا۔

اگر مستعیر نے کاشت کرنے کی غرض سے زمین عاریت پر لی تو فصل پکنے سے پہلے معیر واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ چاہے عاریت دیتے وقت وقت متعین کیا ہو یا نہ کیا ہو کیونکہ ہر کاشت کے پکنے کی انتہا معلوم و متعین ہوتی ہے۔

مال مستعار کو واپس کرنے کی اجرت مستعیر پر ہے کیونکہ واپس کرنا اس کی ذمہ داری ہے کیونکہ عاریت پر لینا اس کی منفعت کیلئے تھا اور اجرت واپس کرنے کی مونت ہے تو یہ مستعیر کی ذمہ داری ہوگی جس طرح مال مغصوبہ کو واپس کرنے کی اجرت غاصب پر ہوتی ہے۔

ودیعت اور عاریت کو واپس کرنے کے حکم میں فرق:

کسی نے جائے نماز استعارۃً کسی سے لی پھر نماز پڑھ کر اس کے گھر واپس بھجوا دی اور معیر کو واپس کرنے کا علم نہیں ہوا۔ پھر وہ اس کے گھر سے چوری ہو گئی تو مستعیر ضامن نہیں ہوگا کیونکہ

یہ اس کے گھر کے تمام سامان میں سے ہے لیکن اگر کوئی قیمتی چیز مثلاً جواہر وغیرہ جو ودیعت لے کر معیر کو دیئے بغیر اس کے گھر دے دیے اور وہ ہلاک ہوگئے یا چوری ہوگئے تو ضامن ہوگا۔ کیونکہ قیمتی اشیاء کو معیر کے ہی حوالے کیا جاتا ہے اس کے علم میں لائے بغیر کسی اور کو دینا درست نہیں ہے۔ اور ودیعت کا حکم یہ ہے کہ اگر ودیعت کو مودع کے علم میں لائے بغیر اس کے گھر میں دے دیا پھر وہاں سے چوری ہوگیا تو ضامن ہوگا کیونکہ اس پر لازم ہے کہ عقد کو ختم کرے اور عقد کو ختم کرنا مالک کو واپس کیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ دوسرے کے حوالے کرنے سے عقد ختم نہیں ہوگا۔ اور مالک مال ودیعت گھر والوں کو حوالے کرنے پر خوش نہیں ہے کیونکہ اگر وہ ان کے پاس رکھنے میں خوش ہوتا تو دوسرے کے حوالے نہ کرتا۔

کتاب الغصب

غصب کا لغوی معنی ہے کسی کی چیز کو زبردستی لینا' شرعی معنی ہیں کسی کے مال متقوم کو اس کی اجازت کے بغیر اس طرح اخذ کرنا جس سے اس کی ملکیت باطل ہو۔ غصب کرنا شرعاً حرام ہے کیونکہ کسی کے مال میں اس کی اجازت ورضامندی کے خلاف تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم" [النساء:۲۹] "مت کھاؤ مال اپنے آپس میں ساتھ ناحق کے مگر یہ کہ ہووے سوداگری رضامندی تمہاری سے"۔ اس کی حرمت کی عقلی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کا مال ان کی جان کی طرح محترم ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "فان دماء كم واموالكم واعراضكم عليكم حرام" [1] "بے شک تمہارے خون' تمہارے اموال' تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں"۔ غصب کے حرام و ناجائز ہونے میں تمام فقہاء اور امت کا اجماع ہے اور اس کی حرمت عقلاً بھی ثابت ہے۔

غصب کی قسمیں:

غصب کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ ہے جس کی وجہ سے گناہ نہیں ہوگا۔ مثلاً کسی کے مال کو عدم علم کی بناء پر تلف کرنا' مثلاً وہ اس کو اپنا مال سمجھ رہا تھا اور اس کو اپنا ہی مال سمجھ کر تلف کر دیا تو اس صورت میں وہ گناہ گار نہیں ہوگا لیکن ضائع شدہ مال کا تاوان دینا اس پر لازم ہوگا کیونکہ یہ صورۃ غصب ہے۔ گناہ نہ ہونے کی دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: "رفع عن امتى الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه" [2] "میری امت کو خطاء اور نسیان اور مجبوری پر گناہ نہیں ہوگا"۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

(۲) غصب کی دوسری قسم وہ جس کے ارتکاب سے انسان گناہ گار ہوتا ہے اور وہ ہے کسی کے مال کو زبردستی قبضہ کرنا' انسان اس سے گناہ گار ہوتا ہے۔ غصب کا اطلاق اشیاء منقولہ پر ہوگا یعنی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی ہوں اور غیر منقولہ اشیاء پر قبضہ کو غصب نہیں کہا جاتا کیونکہ غصب کیلئے عین مغصوب کو اٹھانا اور زمین و جائیداد اور گھر اٹھا کر منتقل نہیں

---

[1] [صحیح مسلم: ۱۳۰۶/۳]　[2] [الجامع الکبیر ص ۲۲۲]

کیے جا سکتے اور اگر کسی کی زمین پر قبضہ ہو بھی جائے تو مالک کی ملکیت زائل نہیں ہوتی اور مالک کو اس سے دور رکھنا یہ تصرف مالک میں ہے۔ حقیقت میں نہیں ہے۔ مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمین و جائیداد پر قبضے کو غصب کہا جائے گا۔ وہ غصب کے حکم میں ہوگا کہ قبضہ کرنا غصب کرنا ہے لہٰذا اگر کسی شخص نے کسی کی زمین پر قبضہ کرلیا اور وہ اس کے قبضے میں کسی آسمانی آفت کی وجہ سے ختم ہوگئی مثلاً دریا برد ہوگئی اور قابل استعمال نہ رہی تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا ضمان اور تاوان غاصب پر آئے گا اس کی قیمت ادا کرنا اس پر ضروری ہوگا مگر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قبضہ کرنے والا تاوان نہیں ادا کرے گا کیونکہ یہ غصب کے حکم میں نہیں ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ غیر وقف زمین میں امام کا قول اور وقف کردہ میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ ہے۔

تنبیہ: قبضہ کے بعد ہلاک اگر کسی آسمانی آفت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ قبضہ کرنے والے کے قول سے ہو تو سب کے نزدیک اس کا تاوان غاصب پر آئے گا۔

غاصب ضامن ہے:

جس نے کسی کی چیز غصب کر لی تو اس پر اس چیز کو اس مقام تک پہنچانا ضروری ہے جہاں سے اس نے اسے اٹھایا ہے جبکہ مال مغصوب اس کے پاس موجود ہو تو جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''علی الید ما اخذت حتی تؤدی''[1] ''قبضے کرنے والے پر اس کی ادائیگی تک ذمہ داری عائد ہے''۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''لا یاخذن احدکم متاع صاحبه لاعبا ولا جادا وان اخذ عصا صاحبه فلیردها علیه''۔[2] ''تم میں سے کوئی اپنے ساتھی کی چیز کو مذاقاً یا حقیقۃً نہ اٹھائے اگر لاٹھی بھی اٹھائی ہو تو واپس کردے''۔ اسی طرح ظلم کا رفع اس وقت ہی ہوسکتا ہے کہ جب مغصوب کو جائے غصب تک پہنچایا جائے کیونکہ اختلاف مقامات کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔

اگر مال مغصوب غاصب کے ہاتھ سے ہلاک ہوجائے اور اس کی مثل مارکیٹ میں موجود ہو تو مثل ادا کرنا ضروری ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد خداوندی ہے: ''فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ'' البقرہ ۱۹۴ ''پس زیادتی کرو تم اوپر اس کے مانند اس کے زیادتی کی اوپر تمہارے''۔

---

[1] ترمذی ج ۳ ص ۳۶۶ [2] الجامع الصغیر ج ۲ ص ۲۰۹

اگر مال مغصوب (کا مثل) مارکیٹ میں ملنا بند ہو جائے تو اس کی وہ قیمت ادا کرے جو اس وقت ہے۔ یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مارکیٹ میں ملنا جس دن بند ہو گیا تھا اس دن کی قیمت ادا کرنا غاصب پر لازم ہے۔ فتویٰ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے کیونکہ محض مارکیٹ سے غائب ہونے کی وجہ سے مثل کا واجب نہ ہونا اور حکم کا وجوب قیمت کی طرف منتقل ہونا لازم نہیں آتا بلکہ مثل کے ملنے کی امید میں اس کا انتظار کیا جا سکتا ہے بلکہ مثل سے قیمت کی طرف منتقل ہونا قاضی کے فیصلے سے ہوگا۔ اور اگر شے مغصوب ایسی ہو کہ اس کا مثل دینا ممکن نہ ہو مثلاً حیوان یا گن کر فروخت کیے جانے والی اشیاء اور کپڑے وغیرہ ہلاک ہونے کی صورت میں بالاتفاق غصب کے دن کی قیمت ادا کرنا لازم ہوگا کیونکہ جب تفاوت کی وجہ سے مثل صوری دنیا متعذر ہو جائے تو مثل معنوی ہی واجب ہوگا اور مثل معنوی قیمت اور اس کی مالیت ہے کیونکہ بقدر ضرور نقصان سے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔

اگر غاصب نے دعویٰ کیا کہ مال مغصوب ہلاک ہو گیا ہے تو محض اس کے کہنے کی وجہ سے اس کی بات نہیں مانی جائے گی بلکہ عدالت اس کو قید کرنے کا حکم دے گی اور اتنی مدت تک قید میں رکھا جائے گا کہ یقین ہو جائے کہ اگر مال مغصوب موجود ہوتا تو حاضر کر دیتا۔ قید کرنے کی وجہ یہی ہے کہ مالک کا حق اصل مال مغصوب کی ذات کے ساتھ متعلق ہے اور غاصب اس کا حق ذات سے ہٹا کر اس کی قیمت کی طرف لے جانا چاہتا ہے لہٰذا اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔

جب عدالت میں مال مغصوب کی ہلاکت ثابت ہو جائے تو عدالت اس کا مثل لانے کا حکم دے گی جبکہ وہ چیز مثلی ہو یعنی اس کی مثل موجود ہو اور اگر وہ مثلی نہ ہو بلکہ ذوات القیم میں سے ہو تو اس کی قیمت ادا کرنے کا حکم دے گی۔

اور اگر مال مغصوب میں کمی کر کے واپس کرے تو کمی کا تاوان اس پر لازم ہوگا لیکن اگر غصب کے وقت قیمت زیادہ ہو اور واپسی کے وقت قیمت کم ہو گئی تو ضمان نہیں آئے گا اور قیمت کے تعین میں قول غاصب کا معتبر ہوگا قسم کے ساتھ کیونکہ وہ قیمت کی زیادتی کا منکر ہے۔ ہاں اگر مالک کے پاس بینہ (گواہ) موجود ہو تو مالک کے قول کا اعتبار ہوگا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا کیونکہ بینہ ایسی حجت ہے جس سے مدعیٰ ثابت ہوگا۔ اگر غاصب کے خلاف مغصوب کی قیمت ادا کرنے کا فیصلہ ہو جائے تو وہ مال مغصوب وقت غصب سے مالک ہو جائے گا۔ کیونکہ مال مغصوب ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونے کے قابل ہے۔ مالک قیمت کا مالک بن گیا اور غاصب مال مغصوب کا مالک بنے گا۔ غاصب کو مالک نہ ماننے کی صورت میں ایک ہی ملک کے اندر مغصوب اور اس کی

قیمت کا جمع ہونا لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

مال مغصوب کا نقصان اور اس کا ہلاک ہونا:

اگر غاصب کے فعل سے جائیداد میں نقص واقع ہو گیا مثلاً عمارت کو گرانا یا مکان میں ایسی رہائش رکھنا جس سے مکان کو نقصان ہو تو اس نقصان کا تاوان تمام فقہاء کے نزدیک غاصب پر لازم ہے۔ کیونکہ یہ تلف کرنا ہے اور زمین کو تلف کرنے سے تاوان آتا ہے۔ اگر منقولہ مال مغصوب غاصب کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے غاصب کے فعل سے یا کسی اور کے فعل سے بہرحال اس پر ضمان آئے گا اور اصل کو واپس کرنے سے عاجز ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہوگا جیسا کہ اس سے پہلے گزرا۔

البتہ کسی اور نے ہلاک کیا ہو تو غاصب مالک کو قیمت یا اس کی مثل ادا کرنے کے بعد ہلاک کرنے والے سے اس کی قیمت وصول کرے گا۔ نقصان کی صورت میں تاوان دینے کی صورت یہ ہوگی کہ دیکھا جائے گا کہ جس دن اس نے غصب کیا تھا اس دن اس کی کیا قیمت تھی اور اب نقصان وکمی کی صورت میں کیا قیمت ہے؟ جتنی کمی ہوئی ہے اس کا تاوان ادا کرے گا اور یہ صورت غیر ربو اشیاء میں ہے جو اشیاء ربو ہیں ان میں اصل کو واپس کرنے کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس طرح یہ ربا ہو جائے گا۔

کسی نے کسی کی بکری یا گائے یا اور کوئی حلال جانور غصب کر کے ذبح کر دیا تو مالک کو اختیار ہے چاہے جانور کی قیمت اس سے وصول کرے اور گوشت غاصب لے لے کیونکہ اس نے اس جانور کے بعض منافع مثلاً بار برداری، دودھ اور نسل کشی کو ختم کر دیا اور چاہے گوشت لے لے اور نقصان کا تاوان غاصب سے وصول کر لے۔ اگر کسی کا گدھا یا گھوڑا غصب کر کے ذبح کر دیا تو تمام قیمت کا ضامن ہوگا۔

اگر کسی کے کپڑے غصب کر کے اس کو تھوڑا سا پھاڑ دیا تو کپڑے مالک کو واپس کرے گا اور نقصان کا تاوان ادا کرے گا اور اگر اتنا پھاڑ دیا جس کی وجہ سے انتفاع ممکن نہیں رہا تو پورے کی قیمت ادا کرے گا کیونکہ اس نے گویا اس کو مکمل طور پر ضائع کر دیا۔

غاصب کی طرف سے مغصوب میں تبدیلی کا حکم:

غاصب کے تصرف سے اگر مغصوب میں تبدیلی ہوئی حتیٰ کہ اس کا نام تک بدل گیا اور اس کے اکثر منافع ختم ہو گئے تو غاصب مغصوب کا مالک بنے گا اور مغصوب کی قیمت ادا کرے گا کیونکہ

اس نے گویا اس کو مکمل طور پر ضائع کر دیا ہے اس کی دلیل ایک حدیث ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازے سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں ایک صحابیہ کی طرف سے کھانے کی دعوت ملی آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے کھانا خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے کھانا شروع فرمایا تو دوسرے حضرات بھی کھانے لگے' راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لقمہ منہ میں ڈال کر اسے نگلا نہیں تھا کہ فرمایا: لگتا ہے کہ یہ گوشت ایسی بکری کا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر لائی گئی' ضیافت کرنے والی صحابیہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اصل بات یہ ہے کہ میں نے بکری خریدنے کیلئے بقیع کی طرف آدمی بھیجا تھا مگر وہاں سے نہیں ملی میرے ایک پڑوسی نے بکری خریدی تھی اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اس نے جتنی قیمت دے کر بکری خریدی ہے وہی قیمت میں اس کو ادا کروں گی بکری مجھے دے دو۔ وہ خود گھر میں موجود نہیں تھے ان کی بیوی نے بکری دیدی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اطعمیہ الاساری'' ''قیدیوں کو کھلاؤ''۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) مالک کی ملکیت کا زائل ہونا۔ (۲) مالک کی رضامندی سے قبل اس کے استعمال کا حرام ہونا۔ صاحب جوہرۃ نے کہا ہے امام نجم الدین النسفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ احناف کے محقق علماء کے نزدیک یہ ہے کہ غاصب مغصوب کا مالک اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ مندرجہ ذیل تین امور میں سے کوئی ایک امر نہ پایا جائے۔ (۱) تاوان ادا کرنا' (۲) تاوان دینے کا عدالتی فیصلہ (۳) تاوان پر دونوں (غاصب اور مالک) کی رضامندی۔

جب غاصب مغصوب کا مالک ہو جائے تو اس سے استفادہ کرنا اس کیلئے جائز ہو جائے گا کیونکہ مالک کا حق ادا ہو چکا ہے تاوان دینے کی صورت میں یا مالک کے معاف کرنے سے یا ضمان دے کر مالک کو رضامند کیے بغیر مغصوب سے انتفاع جائز نہیں ہے کیونکہ مالک کی رضامندی کے بغیر انتفاع کو جائز قرار دینا غصب کے دروازے کھولنا ہے اور جو امر استحساناً ہے اور قیاس کا تقاضا بھی ہے کہ جائز ہو کیونکہ وہ اس کا مالک ہو چکا ہے اور مالک ہونے کے بعد اپنی مملوکہ چیز سے استفادہ کر سکتا ہے۔

استحسان کی وجہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''اطعمیہ الاساری'' جو سابق میں گزرا ہے۔ اس گوشت کو آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے استعمال نہیں کیا بلکہ قیدیوں کو کھلانے کا حکم فرمایا۔

نقدی، سونا چاندی غصب کرنے کا حکم:

اگر نقدی غصب کی یا سونا چاندی اور دیگر اشیاء غصب کیں پھر نقدی کو دوسرے سکوں میں تبدیل کر دیا یا سونے سے کنگن یا انگوٹھی بنوائی تو مالک کی ملکیت زائل نہیں ہوگی۔ یہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مغصوب منہ (مالک) اس مال مغصوب کو جس حالت میں بھی ہو لے سکتا ہے اور غاصب کو کچھ بھی نہیں دے گا۔ البتہ انگوٹھی بنانے کی اجرت دینا اس پر لازم ہوگا۔ اور حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اس تبدیلی سے غاصب مالک بنے گا اور مالک اس کی مثل ادا کرے گا۔

زمین غصب کرنا:

کسی نے زمین غصب کر کے اس میں درخت لگا لیے یا اس پر عمارت بنائی، تو غاصب سے کہا جائے گا کہ درخت اکھاڑ کر لے جاؤ اور عمارت گرا دو اور زمین کو اصل حالت میں مالک کے حوالہ کر دو۔ کیونکہ درحقیقت زمین پر قبضہ کر کے اس میں تبدیلی کرنے سے زمین مالک کی ملکیت سے نہیں نکلتی۔ مالک کی ملکیت بہر صورت اس پر برقرار رہتی ہے اگر غاصب نے اس کی ملکیت کو مشغول کیا تو اس کو فارغ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اگرچہ درختوں اور عمارتوں کی قیمت زمین کی قیمت سے بڑھ بھی جائے تب بھی اکھاڑنے کا حکم دے سکتا ہے اور اگر درختوں کو اکھاڑنے یا عمارت کو گرانے کی وجہ سے زمین کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہو تو مالک کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو اکھاڑنے کا حکم دے چاہے تو درخت اور عمارت کے اکھڑنے کی حالت کی قیمت غاصب کو دے دے اور اس کو اپنے قبضے میں لے لے اور یہ قیمت اندازے سے لگائی جائے گی۔

روایت میں آتا ہے کہ دو آدمیوں کا معاملہ خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش ہوا۔ ایک نے دوسرے کی زمین میں کھجور کے درخت لگائے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین والے کے حق میں زمین کا فیصلہ فرمایا اور درخت والے کو فرمایا کہ زمین سے اپنے درخت اکھاڑ لے جاؤ۔[1] اس روایت کو بیان کرنے والے راوی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ کلہاڑی سے کھجور کے بڑے بڑے درختوں کو کاٹا جا رہا تھا۔

غصب کر کے چھپانا:

کسی نے کوئی چیز غصب کر کے چھپا دی اور مالک نے اس سے تاوان کا مطالبہ کیا اور

---

[1] ابوداؤد، ۹/۳۰ ـ ۱۱

غاصب نے اس کا تاوان ادا کر دیا۔ تو غاصب مال مغصوب کا مالک ہوگا۔ کیونکہ اصل مالک نے مال مغصوب کی مکمل قیمت وصول کر لی ہے اور مغصوبہ چیز کی ملکیت غاصب کی طرف منتقل ہو جائے گی کیونکہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں مغصوبہ چیز اور اس کی قیمت کا ایک ہی وقت میں ایک شخص کی ملکیت میں جمع ہونا لازم آئے گا جو کہ جائز نہیں ہے۔

اور اگر دونوں میں مال مغصوب کی قیمت کے تعین میں اختلاف ہو جائے تو قسم کے ساتھ غاصب کا قول مانا جائے گا کیونکہ وہ قیمت کی زیادتی کا انکار کر رہا ہے لیکن اگر اصل مالک دلیل اور گواہ کے ذریعے قیمت کے زیادہ ہونے کو ثابت کر دے تو اسی کا قول معتبر ہوگا۔

قیمت کی ادائیگی کے بعد اگر مغصوبہ چیز ظاہر ہوگئی اور وصول کردہ قیمت سے اصل مغصوب کی قیمت زیادہ بھی ہے اور اس کی قیمت کو مالک کے حکم سے بطور تاوان ادا کر دیا ہو یا مالک کی گواہی پیش کرنے پر یا غاصب نے قسم کھانے سے انکار کر کے قیمت دے چکا ہو تو اس صورت میں مالک اس کو واپس نہیں لے سکتا کیونکہ تاوان ادا کرنے کی صورت میں وہ مال مکمل اس کی ملکیت میں منتقل ہو گیا ہے اور اگر مالک نے غاصب کے کہنے پر ضمان (تاوان) لیا تھا تو ظاہر ہونے کی صورت میں مالک کو لینے کا اختیار ہوگا غاصب انکار نہیں کر سکتا۔

اور اگر مال مغصوب منظر عام پر آ گیا اور اس کی قیمت وصول کردہ تاوان کے برابر ہے یا اس سے کم ہے تب بھی مالک کو اختیار ہوگا چاہے تاوان واپس کر کے اپنی چیز لے لے یا ضمان پر اکتفاء کرے۔

مال مغصوب میں اضافے کا حکم:

کسی نے حاملہ بکری غصب کی' غاصب کے پاس اس نے بچہ دیا۔ یا لاغر و کمزور بکری یا اور کوئی جانور غصب کر کے اپنے پاس رکھ کر اس کو موٹا اور توانا کیا۔ یا باغ غصب کیا اور غصب کے وقت پھل نہیں تھے غاصب کے پاس پک کر پھل تیار ہو گئے تو بچہ اور پھل اسی طرح غصب کے دیگر منافع خواہ متصلہ ہوں یا منفصلہ جیسے دودھ وغیرہ غاصب کے پاس امانت کے حکم میں ہوں گے غصب کے حکم میں نہیں ہوں گے کیونکہ غصب کہتے ہیں کسی کے مال پر ایسا قبضہ کرنا جس سے مالک کا قبضہ ختم ہو جائے اور اگر ان اشیاء (دودھ' بچہ' پھل وغیرہ) پر مالک کا قبضہ ثابت نہیں تھا کہ غاصب کے فعل کے زائل ہو۔ چنانچہ بچہ ہلاک ہو جائے یا پھل ختم ہو جائے یا بکری کی صحت ختم ہو جائے اور لاغر ہو جائے یا بکری کے تھن سے دودھ سوکھ جائے تو غاصب پر ان کا کوئی تاوان نہیں آئے گا بشرطیکہ غاصب نے

اس پر کوئی ناجائز زیادتی نہ کی ہو مثلاً خود پھلوں کو تلف نہ کیا ہو یا بکری کے بچہ کو ذبح کر کے کھایا نہ ہو اگر ایسا کیا ہے تو ضرور ضامن ہوگا۔

کیا مغصوب کے منافع کا تاوان نہیں ہے:

مغصوب کے منافع کے سلسلے میں غاصب سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص گھر غصب کر کے اس میں رہنے لگا تو اس رہائش کی قیمت اس سے نہیں لی جائے گی کیونکہ یہ منافع غاصب کے ملک میں حاصل ہوئے اپنے ملک میں پیش ہونے والے کا ضمان نہیں ہوا کرتا۔ چاہے منافع سے فائدہ اٹھایا یا نہ اٹھایا ہو مگر تین مقام میں منافع کا تاوان بھر لیا جائے گا اور تاوان اجر مثل کی صورت میں ہوگا۔ ایک صورت یہ ہے کہ وقف زمین کو غصب کر لیا یا یتیم کے گھر کو غصب کر لیا یا قابل کاشت زمین کو غصب کر کے اس پر مکان بنایا۔ ان تمام صورتوں میں اتنی مدت کا کرایہ اس سے وصول کیا جائے گا۔

اگر کسی مسلمان نے ذمی (مسلمان ملک کا کافر باشندہ) کی شراب کو تلف کر لیا یا اس کے سور کو مار ڈالا تو تاوان دینا پڑے گا یعنی اس کی قیمت ادا کرے گا کیونکہ کافروں کیلئے شراب ایسی ہے جیسا ہمارے لیے سرکہ۔ اور خنزیر ان کیلئے ایسا ہے جیسا ہمارے لیے بکری اور ذمیوں کے اشیاء کی حفاظت اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اہل نجران کی زمینوں پر برقرار رکھ کر ان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے ضمن میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کے گرجے اور عبادت خانے نہیں گرائیں گے ان کے مذہبی پیشواؤں کو ملک بدر نہیں کریں گے اور ان کے دین کے بارے میں ان کو تنگ نہیں کریں گے جب تک کہ کوئی نئی چیز ایجاد نہ کریں اور سودی کاروبار نہ کریں[1]

اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کی شراب تلف کر دے یا اس کا خنزیر مار ڈالے تو ضامن نہیں ہوگا کیونکہ شراب اور خنزیر مسلمان کے ہاں مال نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی کافر ذمی مسلمان کی شراب یا خنزیر ضائع کر دے تو اس پر کوئی ضمان نہیں آئے گا کیونکہ مسلمان کے نزدیک مال متقوم نہیں ہے اور ان کو تلف کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگر کسی مسلمان کی سارنگی ڈھول یا باجے یا کوئی اور آلہ لہو ولعب توڑ دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا تاوان دینا پڑے گا کیونکہ ان اشیاء سے کھیل کود لہو ولعب کے علاوہ بھی کام لیا جاتا ہے لہٰذا یہ مال ہیں۔ اور حضرات صاحبین (امام ابو یوسف، امام محمدؒ) کے نزدیک ضمان نہیں آئے گا اور ان کے نزدیک ان اشیاء کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں کیونکہ یہ اشیاء تیار ہی معصیت کے کام کیلئے ہوتی ہیں۔ لہٰذا شراب کی طرح ان کی قیمت بھی باطل ہو جائے گی۔

---

[1] سنن ابی داؤد: ۳ ص ۱۶۸۔

متفرق مسائل:

ایک شخص نے ایک ہزار روپے غصب کر کے تجارت شروع کر دی پھر اس سے ہزاروں روپے کمائے پھر وہ اپنے کیے پر نادم ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا توبہ کی تو وہ ایک ہزار جس کو اس نے غصب کیا تھا اس کے مالک کو لوٹا دینا ضروری ہے۔ اور اس کے ذریعے کمائے ہوئے مال کو صدقہ کر دے یہ قول امام اعظم اور ان کے شاگرد امام محمد کا ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ یہی حکم ودیعت کا ہے چنانچہ ودیعت پر تصرف کر کے کاروبار کیا تو ودیعت مالک کے حوالے کرے گا جبکہ منافع کو صدقہ کرے گا۔

کسی کے بچے کو اٹھایا اور وہ بچہ غاصب کے پاس آ کر بیمار ہو کر مر گیا تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر کوئی ضمان نہیں آئے گا لیکن اگر بیمار تو نہیں ہوا کسی اور شخص نے غلطی سے اس کو قتل کر دیا تو بچے کے سرپرست غاصب اور قاتل میں سے کسی ایک سے دیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر دیت غاصب سے وصول کر لی تو غاصب قاتل کی طرف رجوع کرے گا اور یہ تاوان اور دیت قاتل کے عاقلہ پر ہوگی۔

اگر اس بچے کو کسی نے عمداً (جان بوجھ کر) قتل کر دیا ہو تو مقتول کے سرپرستوں کو اختیار ہے چاہے قاتل کو قصاص میں قتل کر دیں چاہے غاصب سے دیت وصول کریں اور غاصب قاتل کے عاقلہ سے اس کو وصول کرے گا اور اگر اٹھایا ہوا بچہ خودکشی کر لے تو غاصب پر کوئی تاوان اور ضمان نہیں آئے گا کیونکہ جنایت خود بچے کی طرف سے صادر ہوئی ہے۔

ایک شخص نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اس میں بند پرندے اڑ کر چلے گئے تو ضامن نہیں ہوگا اور اگر دروازہ کھلنے سے کوئی چیز اندر آ کر ان کو کھا گئی تو ضامن ہوگا۔ یہی حکم جانوروں کے باڑے کے دروازے کھولنے کا ہے کہ اگر دروازہ کھلنے سے جانور خود نکل کر چلے گئے تو ضامن نہیں ہوگا اور اگر اندر گھس کر کسی نے ان کو تلف کیا تو ضامن ہوگا۔

کسی کے کپڑے غصب کر کے ضائع کر دیے پھر مالک کو ان کی قیمت پیش کی مالک نے کہا کہ میں نہیں لیتا اور تجھے معاف بھی نہیں کرتا۔ چنانچہ معاملہ عدالت میں پیش ہوا عدالت قیمت لینے پر اس کو مجبور کرے گی کیونکہ ہلاک کرنے والے کی برأت بھی ضرورت ہے لیکن اگر معاملہ عدالت میں نہ لے گیا ہو بلکہ مالک کے انکار کے باوجود قیمت مالک کی گود میں ڈال کر چلا گیا تو ذمہ سے بری ہو جائے گا اور اگر اس کے سامنے رکھ کر چلا گیا تو بری نہیں ہوگا۔

ایک شخص کے ایک ہزار روپے دوسرے شخص کے دو ہزار کے ساتھ مل گئے اور امتیاز ناممکن ہو گیا پھر ان میں سے دو ہزار ضائع ہو گئے صرف ایک ہزار بچے مگر معلوم نہیں کہ کس کے کتنے ضائع ہو گئے؟ تو ایک ہزار کو آپس میں اس طرح تقسیم کریں گے کہ دو تہائی دو ہزار والے کو اور ایک تہائی ایک ہزار والے کو ملے گا۔

لقیط کا بیان

''لقط'' کا لغوی معنی ہوتا ہے زمین سے اٹھا لینا، اِدھر اُدھر سے جمع کرنا، پیوند لگانا، پرندے کا چونچ سے دانہ چگنا اور اصطلاح شریعت میں ''لقیط'' انسان کے اس (لاوارث) بچے کو کہتے ہیں جسے لوگوں نے فقر و محتاجی کے خوف یا تہمت زنا سے بچنے کے لیے پھینک دیا ہو۔

لقیط کا حکم

لقیط آزاد اور مسلمان تصور ہوتا ہے، اس پر تہمت لگانے والا قابل سزا ہوتا ہے اور وہ اس ملک کے تابع ہوگا جس میں پایا جائے اور مسلمانوں کی اولاد میں سے شمار ہوگا اور بلوغ کے بعد اس کی گواہی درست قرار دی جائے گی جبکہ وہ عادل ہو اور لقیط پر کسی کا جنایت کرنا یا خود لقیط کا کسی دوسرے پر جنایت کرنا ایسا ہی ہے جیسے آزاد شخص کا جرم ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لقیط کے متعلق آزاد ہونے کا فیصلہ کیا اور یہ آیت کریمہ پڑھی۔

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ﴾ [یوسف:۲۰]

''اور انہوں نے اس کو بہت ہی کم قیمت پر بیچ دیا یعنی گنتی کے چند درہموں کے عوض اور وہ اس کے قدر دان تو تھے ہی نہیں۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آیا لقیط کو فروخت کر دیا جائے، انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے منع کرتے ہیں، کیا تم سورہ یوسف نہیں پڑھتے۔[1]

اگر لقیط اہل ذمہ کے کسی گاؤں (علاقے) یا عیسائیوں کے گرجے میں پایا جائے تو وہ ذمی قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ مسئلہ کی چار نوعیتیں ہوئیں۔ (۱) کوئی مسلمان اس (لقیط) کو اسلام کے علاقے اور محلہ میں پائے تو وہ مسلمان شمار ہوگا (۲) کوئی ذمی اسے اپنے علاقے میں پائے تو وہ ذمی ہوگا۔ (۳) کوئی مسلمان اسے ان کے علاقے میں پائے تو وہ لقیط مسلمان شمار ہوگا۔ (۴)

---

[1] [سنن البیہقی ۶/۲۰۲]

کوئی ذمی اسے ہمارے (مسلمانوں) علاقے میں پائے تو وہ مسلمان ہی قرار دیا جائے گا۔

ملتقط (اٹھانے والا) کا اس لقیط پر خرچ کرنا، ایک احسان اور نفلی شمار ہوگا کیونکہ وہ اس کا ولی نہیں ہے۔ لیکن اگر قاضی نے اسے انفاق کا حکم دیا ہو تو اس کی تعمیل ضروری ہوگی اور وہ نفقہ اس بچہ پر قرض ہوگا کیونکہ قاضی کو عموم ولایت حاصل ہوتا ہے اور ملتقط کو اس کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ عطا کریں گے۔ اگر ملتقط کو یقین ہو کہ اگر اس نے اس بچے کو نہ اٹھایا تو وہ ہلاک ہو جائے گا جیسے وہ بچہ کسی جنگل بیابان میں پڑا ہوا یا کنوئیں میں گرا ہوا ہو یا ایسی جگہ پر ہو جہاں درندوں کے آنے کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اسے ہلاکت سے بچانے کیلئے اٹھالینا ضروری ہوگا اور اگر غالب گمان اس کی ہلاکت کا نہ ہو جیسے وہ بچہ کسی شہر یا گاؤں میں ملے تو ایسی صورت میں اس کا اٹھالینا مستحب ہوگا کیونکہ یہ ایک قابل احترام جان کے احیاء کی کوشش کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ [المائدة ۳۲]: "اور جس نے ایک جان کو زندگی دی تو گویا اس نے ساری انسانیت کو زندگی دی۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ملتقط سے فرمایا "جس طرح تم اس بچے کے ولی وارث ہوئے ہو اس طرح اگر میں اس کا ولی وارث ہوتا تو مجھے یہ بہت محبوب ہوتا۔" لیکن لقیط کا نفقہ مملکت اسلامیہ کے ذمہ ہوگا۔

سنین ابی جمیلہ، بنو سلیم کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اس نے کہیں ایک لاوارث بچہ پایا اور یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا تو وہ اس بچے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیوں اٹھایا؟ اس نے کہا کہ میں نے اسے ضائع ہوتے پایا تو اس کو اٹھالیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے میرے جان پہچان والے آدمی نے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ نیک شخص ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تحقیق کرنے کے بعد فرمایا: جاؤ، یہ بچہ آزاد ہے اور اس کا خرچ ہمارے ذمہ ہے۔[1] بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ ہے۔ "ولک ولاؤہ" یعنی اس کی ولاء تمہارے لئے ہوگی۔ لقیط کی میراث مسلمانوں کے بیت المال کے لیے ہوگی جیسا کہ اس کا نفقہ مسلمانوں کے بیت المال کے ذمہ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفع کے ساتھ نقصان اور ضمان کے ساتھ خراج بھی ہے۔ (یعنی جو فائدہ اٹھاتا ہے اسے ہی اس کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔) اسی طرح لقیط کی جنایت مملکت اسلامیہ کے ذمہ

---

[1] [سنن البیہقی ۶/۲۰۲]

ہوگی اور اس کی دیت بھی مملکت اسلامیہ کے لیے ہوگی۔

لقیط کے بالغ ہونے کے بعد ملتقط اپنا نفقہ واپس نہیں لے سکتا۔لیکن اگر قاضی نے اس (لقیط) کے امور کی ذمہ داری لازم قرار دے دی ہو اور نفقہ اس پر قرض قرار دیا ہو تو پھر واپس لے سکتا ہے۔

حق حفاظت

جب ایک آدمی یا عورت کسی لقیط کو اٹھائے تو کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس سے اس لقیط کو لے کیونکہ پہلے لینے کی وجہ سے حق حفاظت اس کے لیے ثابت ہو چکا ہے۔ اگر کوئی دعویدار یہ دعویٰ کر دے کہ وہ (لقیط) اس کا بیٹا ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی تو اس کا قول معتبر ہوگا کیونکہ اس میں بچے کا نفع ہے اور لوگ بھی نسب ہونے پر شرف وعزت محسوس کرتے ہیں اور نسب نہ ہونے پر الزام لگاتے ہیں۔ پس جب اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا۔ تو وہ بچہ اس کو دے دیا جائے گا اور ملتقط کا قبضہ (حق) باطل ہو جائے گا اور اس صورت میں خواہ ملتقط اس مدعی کی تصدیق کرے یا تردید کرے دونوں صورتوں میں اس کا دعویٰ ثابت ہوگا جب مدعی ذمی ہو تو اس بچہ کا نسب اسی سے ثابت ہوگا لیکن بچہ بہ حیثیت دار مسلمان قرار دیا جائے گا اور ایسا بطور استحسان ہوگا۔ اگر دو آدمی اس کا دعویٰ کریں اور ان سے ایک بچہ کی جسمانی علامت و نشانی بیان کر دے تو وہ اس بچہ کو لینے کا زیادہ حق دار ہوگا کیونکہ ظاہر حال اس کا شاہد ہے کہ نشانی اس کے کلام کے موافق ہے اور اگر نشانی نہ بتائے تو وہ ان دونوں کا بیٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ دونوں سبب میں برابر ہیں اور اگر ان میں سے ایک پہلے دعویٰ دائر کرے تو وہ اس کا بیٹا ہوگا کیونکہ اس کا حق ایسے وقت میں ثابت ہوا ہے جس وقت میں کوئی منازعت موجود نہیں ہے مگر یہ کہ جب دوسرا بھی بینہ قائم کر دے اس لیے کہ بینہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت اس لقیط کے بارے میں دعویٰ کرے کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو خاوند کی تصدیق کے بغیر اس کا دعویٰ کرنا درست نہ ہوگا یا پھر وہ بینہ قائم کرے کیونکہ اس میں دوسرے پر نسب کو محمول کرنا ہے۔ اگر دو عورتیں اس کے بارے میں دعویٰ کریں اور ہر ایک اپنے دعویٰ پر بینہ قائم کر دے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو ان دونوں کا بیٹا قرار دیا جائے گا۔ صاحبین کے نزدیک کسی کا بھی بیٹا قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ محال ہے کہ دو عورتیں ایک بچہ کو جنم دیں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ نسب کا اثبات ولادت کے اثبات کا تقاضہ نہیں کرتا اور اس سے دیگر احکام متعلق

ہوتے ہیں جیسے مصاہرت کی حرمت، حق حضانت اور وجوب ارث وغیرہ۔

لقیط کا مال

اگر لقیط کے ساتھ مال پایا جائے جو اس کے ساتھ بندھا ہوا ہو تو ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے وہ مال اسی کا ہوگا اور ملتقط (پانے والا) بحکم قاضی وہ مال اس کے لیے صرف کرے گا کیونکہ وہ مال بظاہر لقیط کا ہے اور ملتقط کو ولایت انفاق حاصل ہے۔ اور وہ اس کے لیے ضروری اشیاء جیسے خوراک، پوشاک وغیرہ خریدے کیونکہ یہ چیزیں بھی انفاق میں شامل ہے۔ ملتقط کے لیے جائز ہے کہ وہ اس لقیط کے لیے کسی کا ہبہ قبضہ کرے اور اس کے لیے جائز ہے کہ کسی پیشہ یا حرفت کے سیکھنے کے لیے اس کو کسی ادارے میں داخل کرائے۔ ملتقط کو شادی کرانے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ اس کی ولایت معدوم ہے بلکہ یہ کام قاضی کرے گا۔ اسی طرح ملتقط کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے مال میں تصرف کرے کیونکہ اس کی ولایت ضعیف ہے، جس طرح ماں کی ولایت ہوتی ہے اگر لقیط کسی کے لیے کام کرتا ہو تو ملتقط کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی اجرت میں تصرف کرے۔

لقطہ کے احکام

لقطہ کا لفظ قاف کے فتح اور سکون (جزم) کے ساتھ ہے اور لقط "لقط" سے ماخوذ ہے بمعنی اخذ ورفع (لینا اور اٹھانا) اور اصطلاح شریعت میں "لقطہ" ایسے مال کو کہتے ہیں جو غیر محفوظ ہو یا جس کا مالک معلوم نہ ہو یا جو مال ضائع پایا جائے اور گمشدہ جانور جو اپنے باڑے کا راستہ بھول جائیں۔ اور راستہ بھٹک جائیں چنانچہ حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے لقطہ کا حکم دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اعرف عفاصها و وكاءها ثم عرفها سنةً فان جاء صاحبها، والا فشانك بها" یعنی اس لقطہ (گری پڑی ہوئی چیز) کی تھیلی اور اس کے دھاگے کی نشانی یاد رکھو، پھر ایک سال تک اس کی تشہیر کرو اگر تو اس کا مالک آجائے تو ٹھیک ورنہ تم خود اس کو لے لو"۔ اس آدمی نے گمشدہ بکریوں کا حکم پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وہ تیری یا تیرے بھائی کی ہیں یا بھیڑیئے کی ہیں" اس نے کہا کہ پھر گمشدہ اونٹوں کا کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تمہارا ان اونٹوں سے کیا کام؟ ان اونٹوں کے پاس پانی بھی ہے اور پاؤں بھی، وہ خود ہی پانی والی جگہوں پر چلے جائیں گے اور درختوں (کے پتے وغیرہ) کھالیں گے، یہاں تک کہ ان کا مالک ان کو پالے گا"۔[1]

اگر ایک سال تک تعریف (تشہیر) کرنے کے بعد خود کھالے، پھر اس کا مالک آجائے تو اس کا تاوان اس کے ذمہ ہوگا۔

لقطہ کا اٹھا لینا افضل ہے تاکہ وہ کسی خیانت گر کے ہاتھ نہ لگ جائے لیکن اگر اس لقطہ کے بارے میں اپنی طمع اور تعریف اور حوالہ نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر اس کو چھوڑ دینا اولی اور بہتر ہے تاکہ وہ حرام کام میں مبتلا نہ ہو۔

لقطہ کا حکم

لقطہ، ملتقط کے پاس ایک امانت ہے۔ لہذا اگر ملتقط اس بات پر گواہ قائم کرے کہ

---

1 صحیح مسلم ۱۳۴۸/۳

اس نے یہ لقطہ حفاظت کے لیے اور مالک کے واپس کرنے کے ارادہ سے اٹھایا ہے تو ہلاک ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہ ہوگا۔

لقطہ کی تعریف وتشہیر کے لیے بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ لوگو! جس کو اپنی گمشدہ چیز تلاش کرتے ہوئے سنو تو اس کو میرے پاس بھیج دو، لقطہ کا ایک طریقہ سے اٹھالینا شرعاً ماذون (قابل اجازت) بلکہ اکثر علماء کے نزدیک افضل ہے اور لقطہ کے ضیاع کا خطرہ ہو تو علماء کے بقول اس کا اٹھانا واجب ہوگا۔

اگر ملتقط نے اقرار کیا کہ اس نے یہ لقطہ اپنے لیے اٹھایا ہے تو ہلاکت کی صورت میں بالاجماع ضامن ہوگا اور اگر اس نے گواہ قائم نہیں کیے بلکہ یہ کہا کہ اس نے یہ لقطہ مالک کے لیے اٹھالیا تھا اور اس کا جھوٹ واضح ہو جائے تو اس امانت کی ہلاکت پر وہ اس کا ضامن ہوگا اور یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے، امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ وہ ضامن نہیں ہوگا اور اس کا قول معتبر ہوگا، صحیح قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

تعریف کی مدت

تعریف لقطہ کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ صاحب ''الاختیار'' کا قول ہے کہ ملتقط اتنی مدت تک اس لقطہ کی تعریف وتشہیر کرتا رہے کہ اس کا غالب گمان یہ ہو جائے کہ اب اس کے بعد اس کا مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اور یہی قول مختار ہے۔ صاحب ''الاختیار'' نے اپنے اس قول کی تعلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ چیز مال کی قلت وکثرت کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔
حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''میں، اور زید بن صوحان اور سلمان بن ربیعہ ایک مہم پر روانہ ہوئے تو مجھے (راستہ میں) ایک کوڑا ملا، میں نے اس کو اٹھالیا، ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو، میں نے کہا کہ نہیں بلکہ میں اس کی تعریف (تشہیر) کروں گا اگر اس کا مالک آگیا تو ٹھیک ورنہ میں اسے خود استعمال کرلوں گا۔ (راوی) کہتے ہیں کہ جب ہم جہاد سے واپس آئے تو مدینہ منورہ میں میری ملاقات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے انہیں اس کوڑے کے بارے میں بتایا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کا بھی ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ عہد رسالت میں مجھے بھی ایک تھیلی ملی تھی جس میں سو دینار تھے، میں وہ تھیلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عرفها حولاً'' یعنی تم ایک سال تک اس کی تعریف کرو، پس میں نے ایک سال تک اس کی تعریف (تشہیر) کی لیکن میں نے اس تھیلی

کا کوئی جاننے والا نہیں پایا۔[1]

اس حدیث میں سو دینار کے ملنے پر ایک سال تک اس کی تعریف کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اگر اس لقطہ کی مقدار مثلاً ایک دینار یا دس دراہم ہو تو اس صورت میں مدت تعریف اس سے کم ہوگی جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما رو رہے ہیں، انہوں نے پوچھا کہ یہ کیوں رو رہے ہیں؟ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ بھوک ستا رہی ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بازار گئے اور ان کو وہاں ایک دینار ملا وہ وہ دینار لے کر آئے اور ایک یہودی کے پاس گئے اور اس سے آٹا خریدا، یہودی نے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کے داماد ہو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ قصاب کے پاس جا کر ایک درہم کا گوشت لے آؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے دینار اس کے پاس رہن رکھ کر ایک درہم کے عوض گوشت خرید کر لے آئے، پھر حضرت فاطمہؓ نے آٹا گوندھا اور ہنڈیا چڑھائی اور روٹیاں پکائیں، پھر اپنے والد محترم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کروایا کہ ہمارے لیے اس کا کھانا حلال ہے یا نہیں؟ ساری صورت حال ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ چنانچہ انہوں نے کھالیا، تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آدمی اپنا وہ دینار تلاش کرتا ہوا گزرا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلانے کا حکم دیا، جب وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: بازار میں میرا وہ دینار گر گیا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''اے علی رضی اللہ عنہ! اس قصاب کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ دینار مجھے بھیج دو، اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دینار بھیج دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دینار اس آدمی (مالک) کو دے دیا''۔[2]

اس حدیث میں اس امر کا احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال گزرنے سے پہلے ہی ان کے لیے خرچ کرنا اضطراری حالت پیش آنے کی بنا پر مباح کر دیا ہو۔

حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر لقطہ دس دراہم سے کم قیمت کا ہو تو اس کی تعریف چند ایام تک کرے گا اور اگر دس دراہم سے زیادہ کا ہو تو سال تک اس کی تعریف (اعلان و تشہیر) کرے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حکیمہ رحمہا اللہ روایت کرتی ہے کہ حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص معمولی قسم کا لقطہ اٹھائے جیسے رسی، درہم وغیرہ تو اس کی تعریف تین روز تک کرے۔''[3] اس زمانہ میں ایک

---

[1] صحیح مسلم ۱۳۵۰/۲ [2] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۹۴/۶ [3] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۹۵/۶

درہم تقریباً تیس ریال کے برابر ہے اور اگر لقطہ کی قیمت تیس ریال سے کم ہو تو اسی مقام پر اُسے صدقہ کر دے اور اگر خود حاجت مند ہو تو اسی جگہ پر اسے کھالے اور اگر اس کی قیمت دس سے زیادہ اور تقریباً دو سو ریال تک ہو تو ایک ماہ تک اس کی تعریف کرے اور اگر دو سو ریال اور اس سے زیادہ ہو تو پھر ایک سال تک اس کی تعریف کرے جیسا کہ پہلے بھی گزرا۔

فتویٰ اس پر ہے کہ اتنے عرصہ تک اس لقطہ کی تعریف کرے جتنے عرصہ تک تعریف کرنے کا مفہوم ثابت اور واقع ہو جائے لیکن اگر لقطہ ایسی معمولی چیز ہو کہ اسے معلوم (یقین) ہو کہ اس کا مالک اس کو تلاش نہ کرتا ہوگا تو ایسی صورت میں بغیر تعریف کے اس کا استعمال میں لانا مباح ہوگا۔

تعریف کا طریقہ

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں پر وہ چیز گری پڑی ملی ہے وہاں پر اور لوگوں کی اجتماع گاہوں جیسے مسجد وغیرہ اور جس بازار میں وہ لقطہ اٹھایا گیا اس بازار میں آس پاس کی جگہوں پر اعلان کرے کہ جس شخص کی کوئی چیز گم ہوئی ہو وہ اپنی چیز میرے پاس ڈھونڈے۔

مالک کے آنے کے بعد لقطہ کا حکم

اگر اس لقطہ کا مالک آکر اس پر بینہ قائم کر دے تو وہ لقطہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر مالک نہ آئے تو ملتقط اسے صدقہ کر کے اس کا ثواب اس کے اصل مالک کو پہنچا دے کیونکہ وہ لقطہ اس کا مال ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنے پاس اس کو رکھ لے، اس امید پر کہ شاید اس کا مالک آجائے۔ اگر لقطہ صدقہ کر دیا، پھر اس کا مالک ظاہر ہوا تو اسے اختیار ہے کہ اس صدقہ کو جائز قرار دے دے اور اس کا ثواب اسے ملے گا اور اگر چاہے تو ملتقط سے تاوان لے لے یا جس مسکین پر وہ لقطہ صدقہ کیا گیا تھا اس کو ضامن بنائے یا اس سے اپنی چیز لے لے جبکہ وہ لقطہ باقی ہو۔ اور ان دونوں میں سے جسے ضامن بنایا جائے گا وہ دوسرے سے رجوع نہیں کرے گا۔

لقطہ کا مصرف

لقطہ کے تصرف کے بارے میں اہل علم کے دو مذہب ہیں۔ (۱) ملتقط خواہ غنی اور مالدار کیوں نہ ہو اس لقطہ سے انتفاع کا استحقاق رکھتا ہے، احادیث میں اس پر تصریح موجود ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اپنی ''سنن'' میں فرماتے ہیں کہ صحابہؓ وتابعینؒ میں سے بعض اہل علم کا اسی پر عمل

ہے کہ جب ایک سال تک وہ لقطہ کی ملتقط تعریف کرے اور اس لقطہ کی جان پہچان والا نہ ملے تو وہ خود اس سے نفع اٹھائے۔ یہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اسحاقؒ کا قول ہے۔ (۲) ایک سال تک اس کی تعریف کرے گا، اگر اس کا مالک آجائے تو ٹھیک ورنہ اسے صدقہ کردے اور یہ بھی بعض صحابہؓ وتابعینؒ کا قول ہے اور یہ امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن المبارکؒ کا قول ہے۔

اور یہ حضرات ملتقط کے لیے مالدار ہونے کی صورت میں لقطہ سے استفاع کو جائز نہیں سمجھتے۔[1]

(۱) ان کا استدلال حدیث عامر بن شقیق بن جمرہ سے ہے کہ شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک باندی خریدی تو اس باندی کا مالک چلا گیا تو انہوں نے اس باندی کی قیمت صدقہ کردی اور فرمایا کہ اے اللہ! اس کا ثواب اس کے مالک کو پہنچا اور اس کا تاوان ونقصان میرے ذمہ ہے، پھر فرمایا کہ لقطہ کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔[2]

(۲) نیز وہ حضرات حدیث علی سے استدلال کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ مجھے سو یا اس کے قریب قریب دراہم ملے تھے، میں نے معمولی سی تعریف (اعلان) کی تھی اور میری خواہش یہ تھی کہ اس کی تعریف نہ ہو، میں نے ان دراہم سے سامان تیار کیا اور آج میں مالدار ہوگیا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم ان دراہم کا اعلان کرو، اگر اس کا مالک ان دراہم کو پہچان لے تو وہ دراہم اس کو دے دو ورنہ وہ دراہم صدقہ کردو، پس اگر اس کا مالک آجائے اور یہ چاہے کہ اس کو اس صدقہ کا اجر حاصل ہو تو اسے حاصل ہوگا ورنہ تم اس کا تاوان دو گے اور صدقہ کرنے کا اجر تمہیں ملے گا۔[3]

(۳) نیز ان کا استدلال روایت عبدالعزیز بن رفیع رحمہ اللہ سے ہے کہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھے دس دینار ملے تو میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے اس کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک سال تک پتھر پر کھڑے ہو کر اس کی تشہیر کرو، اگر مالک معلوم نہ ہو تو اسے صدقہ کردو، پھر اگر اس کا مالک آگیا تو اس کو اجر اور تاوان میں سے کسی ایک کا اختیار دلا دو۔[4]

(۴) نیز ان حضرات کی روایت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہے کہ ان سے ایک آدمی نے کہا کہ میں نے (راستہ سے) ایک دینار اٹھایا ہے، میں اس کا کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کی

---

[1] [سنن الترمذی ۳/۶۵۵]
[2] [ہامش سنن البیہقی ۶/۱۸۸]
[3] [ہامش سنن البیہقی ۶/۱۸۸]
[4] [ہامش سنن البیہقی ۶/۱۸۸]

تعریف (اعلان کرو)، اگر تو اس کا مالک آجائے تو اس کو دے دو ورنہ اسے صدقہ کر دو۔[1]

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے صدقہ کرنے کا حکم حضرت سعید بن المسیب اور امام شعبیؒ سے نقل کیا ہے اور امام عبد الرزاقؒ نے صدقہ کرنے کا حکم حضرت طاؤسؒ اور عکرمہؒ سے نقل کیا ہے۔

جو ائمہ کرام اس بات کے قائل ہیں کہ لقطہ کی ایک سال تک تعریف و تشہیر کی جائے پھر اسے صدقہ کیا جائے اور صدقہ کرنے کے بعد مالک آجائے تو اسے اختیار ہوگا کہ صدقہ کا اجر حاصل کر لے یا اس سے تاوان لے لے، ان ائمہ عظام میں امام مالک رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔[2]

اگر صاحب لقطہ فقیر (نادار) ہو تو دیگر فقراء کی طرح وہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے اور اپنے گھر والوں (بیوی بچوں) کو دے سکتا ہے۔

گمشدہ جانوروں کا حکم

اگر راہ و جنگل بکری، گائے اور اونٹ کے تلف اور ضیاع کا اندیشہ ہو جیسے وہ ایسے راستہ پر ہوں جہاں کسی درندے کے کھا جانے یا چوروں کے چوری کرنے کا خطرہ ہو تو ان کا لقطہ (پکڑنا) جائز ہوگا اور اگر ان کے تلف و ضیاع کا خطرہ نہ ہو تو ان کو نہ پکڑے۔ بکری کے لقطہ پر دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

﴿خذها فانما هي لك، او لاخيك أو للذئب﴾ ''یعنی بکری کو پکڑ لو، وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ہے یا بھیڑیے کی ہے۔''[3]

اور اونٹ کے لقطہ پر دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے

﴿مالك ولها؟ دعها، فان معها حذاءها وسقاءها ......﴾ ''یعنی تیرا اس سے کیا تعلق؟ اس کو چھوڑ دو کیونکہ اس کے ساتھ اس کے پاؤں اور پانی موجود ہے۔ وہ خود ہی پانی کی جگہوں پر آ جائے گا اور درختوں (کے پتے) کھائے گا، یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پالے گا۔''[4]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ میں یہ طاقت موجود ہوتی ہے کہ وہ خود ہی پانی کی جگہوں پر آ سکتا ہے اور ایک دن میں اتنا پانی پی لیتا ہے جو کئی دنوں کے لیے اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ جب اونٹ کی جان معرض

---

1. ایضاً
2. [حاشیہ سنن البیہقی: ۶/۱۸۹]
3. [حاشیہ سنن البیہقی ۶/۱۸۹]
4. [صحیح مسلم ۳/۱۳۴۹]

خطرہ میں ہو تو اس کا لقطہ (پکڑ لینا) جائز ہے۔

اگر ملتقط حاکم کی اجازت (حکم) کے بغیر اس لقطہ پر خرچ کرے تو وہ اس کی طرف سے احسان شمار ہوگا اور اگر اس کا خرچ کرنا اس کے حکم سے ہو تو وہ لقطہ کے مالک پر قرض ہوگا، اس لیے کہ قاضی کو غائب شخص کے مال میں اس کی رعایت کی غرض سے ولایت حاصل ہوتی ہے۔

جب ملتقط اس لقطہ جانور کو حاکم کے سامنے پیش کر دے تو قاضی (سربراہ) اسے دیکھے، پس اگر اس جانور کا کوئی فائدہ ہو تو اسے کرایہ پر دے دے اور اس کرایہ سے اس جانور پر خرچ کرے کیونکہ اس میں مالک کا مال عین اس کی ملکیت پر باقی ہے بغیر لزوم قرضہ کے یعنی دریں صورت مالک پر قرض لازم کیے بغیر اس کے عین مال پر ملکیت قائم رہے گی۔ اور اگر لقطہ جانور غیر مفید ہے اور نفقہ پر اٹھنے والے اخراجات اس کی قیمت کے برابر ہیں تو اس صورت میں مال (لقطہ جانور) کو فروخت کیا جائے گا اور بعد از فروخت حاصل شدہ رقم بحفاظت رکھ دی جائے گی کیونکہ عدم نفقہ کے باعث عین مال کا باقی رکھنا دشوار ہوتا ہے جبکہ اس کی اصل مالیت کا باقی رکھنا دشوار نہیں ہوتا بشرطیکہ اس کا بیچنا بہتر ہو۔

اگر قاضی مناسب جانے کہ اس لقطہ جانور پر خرچ کیا جائے تو اس کی اجازت ملتقط کو دے اور نفقہ کو اس جانور کے مالک پر قرض قرار دے۔ اگر بعد از حکم قاضی لقطہ جانور کا مالک حاضر ہو گیا تو اس صورت میں ملتقط لقطہ جانور کو روکنے کا مجاز ہے تاوقتیکہ لقطہ جانور کا مالک نفقہ پر جمع قرض ادا نہ کرے۔ اگر لقطہ روکنے سے پہلے لقطہ کا جانور ہلاک ہو گیا تو مالک پر سے قرضہ ساقط نہ ہوگا۔ اگر لقطہ کا جانور روکنے کے بعد ملتقط کے قبضہ سے وہ ہلاک ہو گیا تو اس صورت میں مالک پر سے قرض ساقط ہو جائے گا۔

حرم مکہ کے لقطہ کا حکم

حل اور حرم مکہ کا لقطہ برابر ہے کیونکہ یہ بھی ایک لقطہ ہے اور لقطہ کی شناخت کرائی جاتی ہے خواہ وہ حرم کا لقطہ ہو یا کسی اور جگہ کا۔ یہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی مروی ہے لیکن ان کا مشہور مذہب یہ ہے کہ حرم مکہ کا لقطہ اسی صورت میں اٹھانا حلال ہے جب اسے مالک کو واپس کرنے کی غرض سے اٹھایا گیا ہو۔ اور جو حرم مکہ کی کوئی چیز اٹھائے اس پر واجب ہے کہ اس کی اتنی شناخت کرائے کہ اس لقطہ کا مالک آجائے اور اس کام (تشہیر و اعلان) کے لیے اس پر مکہ میں قیام کرنا

لازم ہوگا اگر مکہ سے باہر جانے کا ارادہ ہو تو وہ لقطہ حاکم کے حوالے کر دے۔ مدت خواہ طویل ہو یا کم۔ علماء لکھتے ہیں کہ اس میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کو تمام لوگوں کے لیے مقام عبادت وثواب بنایا۔ لوگ وہاں یکے بعد دیگرے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ لقطہ کا مالک یا اس کا فرستادہ واپس آ کر اسے تلاش کرے۔ امام شافعیؒ کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

﴿لایعضد عضاهها ولا ینفر صیدها ولاتحل لقطتها الا لمنشد﴾[511 الحدیث]: ''یعنی حرم کے درخت نہ کاٹے جائیں اور اس کا شکار نہ بھگایا جائے اور اس کا لقطہ حلال نہیں مگر یہ کہ اس کی شناخت کرائے۔''[1]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

﴿ولاتحل ساقطتها الا لمنشد﴾: ''یعنی حرم مکہ کا لقطہ شناخت کرانے کے ماسوا اس کو اٹھانا حلال نہیں ہے۔''

آئمہ ثلاثہ نے حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس نے لقطہ کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اعرف عفاصها ووکاءها ثم عرفها سنة﴾: ''یعنی تم اس لقطہ کا ظرف (تھیلی وغیرہ) اور بندھن (سربند) محفوظ کر لے، پھر ایک سال اس کی تشہیر کر۔''[2]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مطلق اور بلا تفصیل ہے یعنی اس حدیث میں حل وحرم کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حل وحرم دونوں کا لقطہ حکم میں یکساں ہے، نیز مدت تعریف کے گزر جانے کے بعد اس لقطہ کو صدقہ کرنے میں ایک اعتبار سے مالک کی ملکیت کو باقی رکھنا ہے کہ اسے اس صدقہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کی مستدل حدیث ملتقط ومشتہر کے اپنی ذات کے لیے لقطہ حرم اٹھانے کی عدم حلت پر محمول ہے اور حرم مکہ کی تخصیص اس وہم کو دور کرنے کے لیے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر یہ چیز (لقطہ) مسافروں کی ہے جو متفرق ہو گئے ہیں لہٰذا تشہیر کا کوئی فائدہ نہیں، یعنی یہ حدیث سقوط تشہیر کے واہمہ کو دور کرنے پر

---

1. صحیح بخاری ۳۲۵، صحیح مسلم ۱/۳۳۷، ابو داؤد ۱/۲۸۳
2. [صحیح بخاری ۱/۲۹، صحیح مسلم ۲/۷۸، ابو داؤد ۱/۲۳۳، ترمذی ۱/۱۶۳]

محمول ہوگی حضور اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمان عالی لایحل ساقطتھا الاالمنشد کے ذریعہ اس وہم کا ازالہ کر دیا اور اس سے مقصد یہ بتانا ہے کہ حرم مکہ کا حکم بھی دیگر بلاد کی طرح ہے۔
واللہ اعلم

لقطہ پر ملکیت کی لازمی شرط

اگر کسی نے ملتقط کے پاس آکر لقطہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا تو ملتقط کو چاہیے کہ وہ لقطہ مدعی کے حوالہ نہ کرے تاوقتیکہ وہ گواہ قائم نہ کرے۔ اگر مدعی نے لقطہ کی ملکیت کے حوالہ سے اس (لقطہ) کی صحیح طور پر علامت بیان کردی تو ملتقط کے لیے جائز ہے کہ وہ مدعی کو لقطہ حوالہ کردے لیکن قاضی ملتقط کو لقطہ حوالہ کرنے پر مجبور کرنے کا مجاز نہیں ہے کیونکہ ملکیت کی طرح قبضہ میں ایک حق مقصود ہے جبکہ مدعی بلا دلیل اس (حق مقصود) کا حقدار نہیں ہے اور دلیل بقیاس ملکیت قیام شہادت پر مبنی ہے لہٰذا شہادت لقطہ مدعی کے حوالے کرنا مستلزم نہیں ہے۔ البتہ صحیح طور پر لقطہ کی علامت بیان کرنے پر لقطہ مدعی کے حوالہ کرنا جائز ہے۔ پس دو حدیثوں کو جمع کرنے کی غرض سے "حوالہ کرنے کا حکم" ہم نے اباحت پر محمول کیا ہے۔ ایک حدیث تو یہ ہے

﴿البینة علی المدعی﴾: "یعنی گواہ مدعی پر لازم ہیں۔"

اور دوسری حدیث یہ ہے

﴿فان جاء صاحبها ......﴾: "یعنی اگر لقطہ کا مالک آکر اس کی علامت بیان کردے تو اس کے حوالہ کردو۔"

پس ثابت ہوا کہ لقطہ حوالہ کرنے کی لازمی شرط "مدعی کا گواہ قائم کرنا" ہے۔ اس لیے کہ قیام شہادت دیگر دلائل کے مقابلہ میں زیادہ قوی دلیل ہوتی ہے۔

اگر ملتقط نے مدعی کی تصدیق کردی اور بغیر فیصلہ کے لقطہ اس کے حوالہ کر دیا، پھر کوئی دوسرا شخص آگیا اور اس نے اپنے دعویٰ پر گواہ قائم کر دیئے تو اسے اختیار ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے جس کو چاہے ضامن بنائے (یعنی اس سے تاوان حاصل کرے) اور قابض دینے والے سے رجوع نہیں کرے گا اور اگر قضاء اور فیصلہ سے لقطہ اس کے حوالہ کیا ہے تو وہ مجبور ہے لہٰذا صرف قابض سے رجوع کرے گا۔

﴿خنثیٰ کا بیان﴾

خنثیٰ کا لفظ تخنث سے مشتق ہے جس کا معنی ہوتا ہے موڑنا، جھکانا جیسا کہ کہا جاتا ہے:
طوی الثوب علی اخناثه یعنی اس نے کپڑے کو اس کی سابقہ تہوں پر لپیٹا۔ خنثیٰ کو اس لیے خنثیٰ کہتے ہیں کہ اس کا حال مردوں سے ناقص اور عورتوں سے فائق ہوتا ہے کیونکہ یا تو اس کے دونوں آلے ہوتے ہیں یا کوئی آلہ (عضو مخصوص) نہیں ہوتا اور اس کی حدث اس کی دبر یا ناف سے خارج ہوتی ہے۔

اگر اس نومولود کی فرج اور ذکر دونوں ہوں تو خنثیٰ ہے، پھر اگر وہ ذکر سے پیشاب کرتا ہو تو وہ مذکر شمار ہوگا اور اگر فرج سے پیشاب کرتا ہوں تو مؤنث قرار دیئے جائے گا جیسا کہ حسن بن کثیر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خنثیٰ کے بارے فرمایا:

﴿انظروا مسيل البول فورثوه منه﴾ ''یعنی اس کی پیشاب گاہ کو دیکھو اور اس کے مطابق اس کو وارث بناؤ۔''[1]

حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے خنثیٰ کے بارے میں پوچھا گیا کہ اسے وراثت کس طرح دی جائے؟ انہوں نے فرمایا کہ دیوار کے قریب کھڑے ہو کر پیشاب کرے، اگر تو اس کا پیشاب دیوار کو پہنچے تو وہ مذکر شمار ہوگا اور اگر پیشاب اس کی رانوں کے درمیان میں بہہ جائے تو وہ مؤنث ہے۔[2]

جس جگہ سے پیشاب کرے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس آلہ سے پیشاب خارج ہو رہا ہے وہی عضو اصلی ہے اور دوسرے عضو میں عیب ہے۔ دور جاہلیت میں اسی طرح ہوتا تھا۔ اسلام نے اس کو برقرار رکھا ہے۔

اگر دونوں جگہوں سے پیشاب کرتا ہو تو جس جگہ سے پہلے پیشاب کرے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ عضو اصلی کی دلیل ہے اور دوسری نالی میں پیشاب کسی علت اور بیماری کے باعث چلا جاتا ہے۔ اگر پہلے نکلنے میں دونوں جگہیں برابر ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کثرت بول کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ اسے کثرت بول کی طرف

---

[1] السنن البیہقی ۶/۲۶۱　　[2] ایضاً

منسوب کریں گے کیونکہ پیشاب کی کثرت اس پر دال ہے کہ یہی اصل پیشاب گاہ ہے اور قاعدہ ہے کہ للاکثر حکم الکل یعنی اکثر پر کل کا حکم لگایا جاتا ہے لہٰذا کثرت کی بنا پر ترجیح دی جائے گی۔

اگر مقدار میں برابر ہو تو وہ مرجح نہ ہونے کی بنا پر بالاجماع خنثیٰ مشکل ہوگا۔ بلوغ تک اس کا انتظار کیا جائے گا۔ بالغ ہونے کے بعد اگر اس کی داڑھی نکل آئی یا مردوں کی طرح اسے احتلام ہوا یا اس کی چھاتی برابر ہوئی یا وہ عورتوں کی جانب میلان کرنے لگا تو وہ مذکر ہوگا اور اگر عورتوں والی علامات ظاہر ہوئیں تو وہ مؤنث ہوگا جب کہ عورتوں جیسے پستان ظاہر ہوئے یا اسے حیض یا حمل ہوا یا فرج کی طرف سے اس سے صحبت کرنا ممکن ہو تو وہ مؤنث ہوگا کیونکہ ایسی علامات عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اگر ایسی کوئی علامت ظاہر نہ ہو یا علامتیں متعارف ہوں تو وہ خنثیٰ مشکل ہوگا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اشکال بلوغ سے پہلے ہے، بالغ ہونے کے بعد کوئی اشکال (خنثیٰ کا مشکل ہونا) نہیں ہوتا۔

خنثیٰ کے احکام

جب اس پر خنثیٰ مشکل ہونے کا حکم لگا دیا جائے تو دین کے امور میں اس کے متعلق احتیاط برتی جائے گی۔ پس جس امر کے ثبوت میں شک واقع ہو اس پر ثبوت کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور حرام کو مباح پر ترجیح دی جائے گی۔

اس خنثیٰ کو مردوں اور عورتوں کی صفوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا، اس لئے کہ احتمال ہے کہ وہ عورت ہو، پس جب مردوں کی صف میں کھڑا ہوگا تو ان کی نماز فاسد ہوگی، اس طرح احتمال ہے کہ وہ مرد ہو، پس جب وہ عورتوں کی صف میں کھڑا ہوگا تو ان کی نماز خراب ہوگی، اس لیے دونوں باتوں سے بچنے کے لیے اس کو درمیان میں کھڑا ہونے کا حکم دیا جائے گا۔

اگر وہ عورتوں کی صف میں کھڑا ہوگیا تو وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے گا کیونکہ اس کے مرد ہونے کا احتمال ہے اور اگر وہ مردوں کی صف میں کھڑا ہوگیا تو اس کی نماز تو مکمل ہے لیکن جو لوگ اس کے دائیں، بائیں اور پیچھے سیدھ میں ہوں گے وہ اپنی نماز کا احتیاطاً اعادہ کریں گے کیونکہ اس کے عورت ہونے کا احتمال موجود ہے۔ ایسا خنثیٰ اوڑھنی لے کر نماز پڑھے گا کیونکہ اس کے بارے میں احتمال ہے کہ وہ عورت ہو اور وہ اس طرح بیٹھے گا جس طرح عورت بیٹھتی ہے۔ پس اگر اس نے بغیر دوپٹہ کے نماز پڑھی تو استحباباً اسے اعادہ صلوٰۃ کا حکم دیا جائے گا کیونکہ اس کا عورت ہونا محتمل ہے۔

خنثیٰ کے لیے مکروہ ہے کہ وہ کسی مرد محرم کے بغیر سفر کرے اگر اس نے حج کا احرام باندھا اور وہ قریب البلوغ ہو چکا تھا تو امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے لباس کا علم نہیں ہے، اس لیے کہ اگر وہ مذکر ہو تو اس کے لیے سلا ہوا لباس پہننا مکروہ ہے اور اگر وہ مؤنث ہو تو اس کے لیے سلا ہوا کپڑا نہ پہننا مکروہ ہوگا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ عورتوں والا لباس پہنے گا کیونکہ بالغ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی اور عورت ہونے کی صورت میں سلا ہوا لباس نہ پہننا مرد ہونے کی صورت میں سلا ہوا لباس پہننے سے افحش ہے اور بالغ ہونے کے بعد بھی یہی حکم ہے کیونکہ اس کا عورت ہونا محتمل ہے۔ پس اس کا ستر اس کے کشف سے زیادہ بہتر ہوگا۔ امام محمدؒ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ اس پر احتیاطاً دم واجب ہوگا کیونکہ اس کے مرد ہونے کا احتمال ہے۔ خنثیٰ کے لیے ریشم اور سونے کا پہننا اور مردوں اور عورتوں کے سامنے برہنہ ہونا مکروہ ہوگا اور بغیر محرم کے اس کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا بھی مکروہ ہوگا اور اگر وہ چھوٹا بچہ ہو کہ شہوت نہ ہوتی ہو تو پھر جائز ہے۔ اگر اسے شادی کی خواہش پیدا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی عورت سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ پس اگر وہ مرد ہو تو نکاح درست ہوگا اور عورت کے لیے اپنے شوہر کی شرمگاہ دیکھنا جائز ہوگا اور اگر وہ عورت ہو تو پھر نکاح درست نہیں ہوگا لیکن عورت کے لیے عورت کی شرمگاہ ضرورۃً دیکھنا جائز ہوگا۔ اگر خنثیٰ مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے گا، اگر کسی پر تہمت لگائے تو تہمت پر اسے حد لگائی جائے گی اور اگر اس پر تہمت لگائی گئی تو تہمت لگانے والے پر حد جاری نہ ہوگی۔ اس لیے کہ وہ اگر مذکر ہے تو وہ بمنزلہ مجبوب ہوگا اور اگر عورت ہے تو رتقاء کی مانند ہوگا اور اس پر تہمت لگانے والے قابل حد نہیں ہوتا۔

اگر کسی نے وصیت کی کہ فلاں عورت اگر لڑکا جنے تو ایک ہزار اور لڑکی جنے تو پانچ سو دیئے جائیں، اگر اس نے خنثیٰ کو جنم دیا تو احتیاطاً اسے پانچ سو دیئے جائیں گے۔ الا یہ کہ وہ اس کے علاوہ کو بیان کرے، اگر اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے پہلا بچہ لڑکی کی صورت میں جنا تو تجھے طلاق ہے، پھر اس نے خنثیٰ کو جنم دیا تو وہ حانث نہیں ہوگا، جب تک کہ اس کا امر واضح نہ ہو۔

مفقود کا بیان

مفقود وہ ہے جو کسی طرف نکلا ہو پھر ایسا لاپتہ ہو جائے کہ اس کا ٹھکانہ بھی معلوم نہ ہو سکے اور جہت بھی نامعلوم ہو اور نہ ہی اس کے زندہ ہونے کا پتہ ہو اور نہ مرنے کی کوئی خبر ہو۔ یا دشمن نے اسے گرفتار کر لیا ہو اور اس کی زندگی اور موت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو اور نہ ہی اس کے قتل ہونے کا علم ہو۔

مفقود کا حکم

مفقود اپنے حق میں زندہ اور دوسرے کے حق میں مردہ شمار ہوتا ہے لہٰذا اس کی بیوی کا کسی کے ساتھ نکاح نہیں کیا جائے گا اور اس کا مال تقسیم نہ کیا جائے گا اور اس کا اجارہ فسخ نہ کیا جائے گا کیونکہ اس کی ملکیت اس کے مال اور زوجہ اور منافع میں ثابت ہے۔

مفقود الخبر کا غائب ہونا زوجین کے درمیان جدائیگی کا موجب نہیں ہے اور موت ایک امر محتمل ہے لہٰذا جو چیز یقین سے ثابت ہے وہ صرف احتمال کی بنیاد پر زائل نہیں ہوگی۔ پس نکاح جو دونوں کے درمیان بالیقین قائم ہے صرف شک کی وجہ سے زائل نہیں ہوگا۔ اسی طرح مال کی ملکیت جو یقینی طور پر اس کے لیے ثابت ہے اس سے شک کی بنا زائل نہیں ہوگی۔ اور مفقود دوسروں کے حق میں مردہ کی طرح ہے لہٰذا اس کی غیوبت کے زمانہ میں جو شخص فوت ہوگا وہ اس کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اپنے مورث کی موت سے پہلے ہی مر چکا ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ مفقود اپنے حق میں مردے کی طرح اور دوسروں کے حق میں زندوں کی طرح ہے یعنی قول اول کے برعکس۔ اپنے حق میں مردہ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسرے کا وارث نہیں ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اپنے مورث سے پہلے ہی فوت ہو چکا ہے لہٰذا شک کی بنا پر وارث قرار نہیں پائے گا اور دوسروں کے حق میں زندہ ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا کوئی وارث نہیں ہوگا اور اس سے اس کی املاک کا ازالہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کے زندہ ہونے کا احتمال موجود ہے۔

مفقود کے معاملات کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوتی ہے

قاضی ایک ایسے شخص کا انتظام کرے گا جو مفقود الخبر کے مال کی حفاظت کرے اور اس

کے امور اور معاملات کو بحسن وخوبی چلا سکے جبکہ اس کا کوئی وکیل نہ ہو اور وہ (شخص) اس کے وہ اموال جن کے تلف ہونے کا خدشہ ہو انہیں فروخت کرے گا اور ان اموال کو بغیر قضاء کے ان پر خرچ کرے گا جن پر خرچ کرنا اس مفقود الخبر پر اس کی موجودگی کے وقت واجب تھا جیسے اس کی بیوی، نابالغ اولاد اور بالغ لڑکیاں اور بالغ لڑکیوں میں سے اپاہج اور معذور بچے وغیرہ۔ اور وہ (مقررہ آدمی) اس مفقود الخبر کے اس قرض کو وصول کرے گا جس کا اقرار کیا گیا ہو۔ کوئی مخاصمہ یا شکایت نہیں کرے گا کیونکہ وہ صرف وکیل بالقبض ہے اور بالاجماع خصومت کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ قاضی صرف حفاظت کا متولی اور ذمہ دار ہے اور جن اسباب کے تلف ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو قاضی ان کو فروخت نہیں کروائے گا نہ نفقہ میں اور نہ کسی اور کام میں جیسے مکانات، زمینیں اور حیوانات وغیرہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مفقود الخبر کے باپ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف منقولہ جائیداد نفقہ میں فروخت کر دے۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ وہ بھی کچھ فروخت نہیں کر سکتا۔

اور وہ اخراجات جو صرف مفقود کی موجودگی میں ہی قضاء قاضی سے اس پر لازم ہوتے ہیں جیسے بہن بھائی ماموں ممانی وغیرہ پر خرچ کرنا، تو وہ اس کے مال پر خرچ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسے نفقات قضاء قاضی سے ہی واجب ہوتے ہیں اور غائب شخص کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ممنوع ہے۔ اگر قرض دار یا مودع مال کا انکار کرے یا وہ دونوں زوجیت اور نسب کا انکار کریں تو نفقہ کے مستحقین میں سے کوئی شخص اس معاملہ میں بطور خصم کھڑا نہیں ہوگا۔

اور مال سے مراد سونا چاندی اور آج کے دور میں اس کے قائم مقام سکے اور کرنسیاں ہیں۔

اس لیے کہ ارباب نفقہ کھانے پینے اور لباس کے مستحق ہیں، پس اگر اس کے پاس اس جنس کا مال ہو جس کے وہ مستحق ہیں تو وہ ان کو دیا جائے گا اور اگر اس کا مال کسی کے پاس بطور قرض یا ودیعت کے ہوں۔ اور مقروض مال کا معترف ہو اور مودع ودیعت کا اور زوج زوجیت و نسب کا اقراری ہو تو اس مال سے ان پر خرچ کیا جائے گا۔ اور اگر یہ چیز قاضی کے پاس ثابت ہو تو ان کے اعتراف کی کوئی حاجت نہیں ہوگی۔ اگر مقروض یا مودع نے قاضی کے اذن کے بغیر خرچ کیا تو وہ ضامن ہوں گے کیونکہ انہوں نے مالک یا اس کے نائب تک حق کو نہیں پہنچایا۔

مفقود الخبر کی موت کا حکم کب لگایا جائے گا؟

اگر مفقود الخبر آدمی کی اتنی عمر گزر جائے جتنی عمر کے گزرنے پر اس کے ہم عصر زندہ نہ

رہتے ہوں تو اس کے مرنے کا حکم لگا دیا جائے گا' اور یہ امام صاحب کے قول کے زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ زمانوں کے اختلاف سے عمروں میں بھی اختلاف ہوتا جاتا ہے۔ نیز امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کے لیے ایک سو بیس سال کی مدت مقرر کی ہے۔ امام ابو یوسفؒ سے سو سال اور بعض آئمہ سے نوے سال کی مدت منقول ہے اور یہ عموماً ان کے زمانہ کے لوگوں کی انتہائی عمریں تھیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿امرأة المفقود امرأته حتى يأتيها الخبر﴾: "مفقود الخبر کی بیوی اسی کی بیوی ہوگی، یہاں تک کہ اس کے پاس خبر آ جائے۔"[1]

یہ حدیث ضعیف ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں

﴿انها لا تتزوج﴾: "یعنی وہ (بیوی) شادی نہیں کرے گی۔"[2]

امام شافعیؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ "مفقود الخبر خاوند جب واپس آ جائے اور اس کی بیوی نے شادی کر لی ہو تو وہ اسی کی بیوی ہوگی، چاہے تو اسے طلاق دے دے اور چاہے تو روک رکھے اور اس عورت کو اختیار نہیں دیا جائے گا۔"[3]

نیز حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفقود الخبر کی بیوی کے متعلق جو بات فرمائی وہ کچھ نہیں ہے، وہ غائب ہی کی بیوی ہے یہاں تک کہ اس کی موت کا یقینی طور پر علم ہو جائے یا اس عورت کی طلاق کا علم نہ ہو جائے اور اس عورت کو مہر ملے گا اور اس کا نکاح باطل ہے۔[4]

نیز امام ابن ابی شیبہؒ نے ابوقلابہؒ، جابر بن زیدؒ، شعبیؒ اور نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ تمام حضرات کہتے ہیں کہ عورت کے لیے شادی کرنا جائز نہیں تاوقتیکہ اس کے شوہر (مفقود الخبر) کی موت کا علم نہ ہو جائے۔[5]

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ عورت چار سال تک انتظار کرے گی جیسا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جس عورت کا خاوند مفقود الخبر ہو جائے، اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے تو وہ چار سال تک انتظار کرے گی، پھر چار ماہ دس دن (عدت کے طور پر) انتظار کرے گی۔[6]

---

[1] سنن الدارقطنی ۳/۳۱۲ [2] سنن البیہقی ۷/۴۴۵ [3] ایضاً
[4] ایضاً [5] نصب الرایہ ۳/۴۷۳ [6] سنن البیہقی ۷/۴۴۵

مفقود الخبر پر مرتب ہونے والے احکام

جب قاضی زمانہ گزرنے کے بعد مفقود الخبر کی موت کا فیصلہ کر دے تو اس کی بیوی پر موت کے فیصلہ کے وقت سے عدت وفات گزارنا واجب ہوگا اور جو ورثاء اس وقت موجود ہوں گے ان میں اس کا مال تقسیم کر دیا جائے گا۔ گویا کہ وہ اس وقت ہی فوت ہوا ہے۔

مفقود الخبر کے جو والدین یا اولاد اس سے پہلے فوت ہو چکے ہوں وہ اس کے وارث قرار نہیں پائیں گے، اس لیے کہ اس کی موت کا فیصلہ کرنے سے قبل وہ (مفقود) اپنی حیات پر باقی ہے۔ جو شخص مفقود الخبر کی فقدان کی حالت میں فوت ہوا ہو مفقود اس کا وارث نہیں ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مفقود دوسرے کے حق میں میت کی طرح ہوتا ہے لہٰذا وہ دوسرے کے حق کا میت ہونے کی حالت میں وارث نہیں ہوگا بلکہ اس کا حصہ موقوف کر دیا جائے گا اور اسے صرف نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر حقوق لازم ہیں۔ اسی طرح جب اس کے لیے وصیت کی جائے تو وہ بھی موقوف ہوگی کیونکہ میت ہونے کے احتمال پر اس کیلئے وصیت درست نہیں ہونی چاہیے اور زندہ ہونے کے احتمال پر درست ہونی چاہیے، اس لیے ہم نے کہا کہ اس کیلئے وصیت موقوف ہوگی۔

﴿تقسیم کے احکام﴾

قسمت کا لغوی معنی ہوتا ہے تقسیم کرنا اور اصطلاح شرع میں قسمت کی تعریف یہ ہے:

جمع نصیب شائع فی مکان مخصوص یعنی مخصوص طریقہ سے شائع وذائع حصہ کو جمع کرنا۔

قسمت کا سبب تمام شرکاء یا بعض شرکاء کا اپنی ملکیت سے خاص طریقہ پر انتفاع ہے بشرطیکہ اس قسمت سے منفعت حاصل ہو۔

قسمت میں مبادلہ کا معنی ومفہوم پایا جاتا ہے کیونکہ تقسیم کے بعد جو کچھ جمع ہوتا ہے اس کا ایک حصہ ایک شریک کے لیے ہوتا ہے اور کچھ حصہ دوسرے شریک کے لیے ہوتا ہے۔ قسمت ایک اعتبار سے مبادلہ ہے اور ایک اعتبار سے افراد ہے کیونکہ جب مقسوم مشترک ایک جنس سے ہو تو قاضی شریک کو قسمت پر مجبور کرے گا جبکہ اس کا دوسرا شریک اس کا مطالبہ کرے کیونکہ مقاصد میں اتحاد ہے اور اگر مقسوم مشترک مختلف اجناس سے ہو تو قاضی اس کی تقسیم پر مجبور نہیں کر سکتا البتہ اگر وہ اس پر باہم رضامند ہوں تو جائز ہے کیونکہ حق ان کا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے مغانم اور مواریث میں قسمت (تقسیم) کا معاملہ کیا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر ایک بیٹی اور ایک پوتی اور ایک بہن ہو تو ان میں وراثت کس طرح تقسیم ہوگی۔ انہوں نے فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف ملے گا اور فرمایا کہ تم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے بھی پوچھو، پھر میرے پاس آکر مجھے بتانا، چنانچہ اس نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مسئلہ پوچھا اور حضرت ابوموسیٰ کی بات بھی بیان کی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں بھی وہی بات کہوں تو میں راہ سے بھٹک جاؤں گا اور راہ راست پر چلنے والوں میں سے نہ ہوں گا۔ میں تو حضور اقدس ﷺ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر فرمایا کہ بیٹی کو نصف ملے گا اور پوتی کو سدس تاکہ دوتہائی مکمل ہو اور باقی ماندہ حصہ بہن کو ملے گا۔ پھر وہ شخص حضرت ابوموسیٰ شعری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے بارے میں بتایا تو ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ جب تک یہ عظیم عالم تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ دریافت نہ کرو۔[1]

حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دیباج کے چند جبے ہدیہ میں بھیجے گئے جن میں سونے کی تاریں لگی ہوئی تھیں تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں انہیں تقسیم کر دیا۔[2]

تقسیم کون کرے گا؟

حاکم وقت کو چاہیے کہ ایک تقسیم کنندہ مقرر کرے جو اجرت لیے بغیر لوگوں کے درمیان تقسیم کرے، اس لیے کہ تقسیم بھی عمل قضاۃ میں سے ہے۔ اگر حاکم اسے اجرت نہ دے تو شرکاء اجرت دیں گے کیونکہ نفع ان ہی کے لیے ہے۔ قسمت، من کل الوجوہ قضاء کی مانند نہیں ہے، اس لیے شرکاء سے اجرت لینا تقسیم کنندہ کے لیے جائز ہے۔ البتہ افضل یہ ہے کہ اس کی تنخواہ حاکم کی جانب سے مقرر ہو کیونکہ اس میں لوگوں کے ساتھ آسانی بھی ہے اور تہمت سے بھی بچاؤ ہے۔ اگر شرکاء باہم متفق ہو کر تقسیم کا عمل کریں تو جائز ہے لیکن اگر ان میں کوئی نابالغ بچہ ہو تو اس صورت میں قاضی کے امر کی ضرورت ہوگی کیونکہ ان کو اس بچہ پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔

تقسیم کنندہ کی صفات

تقسیم کنندہ کا عادل، امین اور تقسیم کے عمل سے واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ قسمت

---

[1] صحیح البخاری ۱۳۱۲ [2] الحدیث۔ صحیح بخاری ۶۳۵

بھی عمل قضاۃ کے جنس میں سے ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں۔ اگر تقسیم کنندہ عادل نہ ہو تو صغائر وکبائر کا ارتکاب کرے گا اور اپنے آپ پر ظلم کرے گا جب اپنے آپ پر ظلم کرے گا تو دوسرے لوگوں پر بطریق اولیٰ ظلم کرے گا اور جب وہ امین نہ ہوگا تو اس کا قول غیر معتبر ہوگا اور اس سے ظلم کے سوا اور کچھ ظاہر نہ ہوگیا۔ اور جب وہ قسمت کے مسائل اور طریقہ سے ناواقف ہوگا تو اس عمل پر کرنے سے عاجز ہوگا کیونکہ جو شخص قسمت سے واقف نہ ہوگا وہ اس پر قدرت بھی رکھنے والا نہ ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ظلم اور ناانصافی کرے گا۔

حاکم وقت پر لازم ہے کہ وہ ایک قاسم (تقسیم کنندہ) پر لوگوں کو مجبور نہ کرے کہ وہ اس کو اجرت پر لیں کیونکہ عقود (معاملات) میں جبر نہیں ہے اور اگر وہ کسی کو متعین کر دے تو اجر مثل سے زیادہ کا فیصلہ کرے جیسا کہ اس پر لازم ہے کہ وہ قاسمین کو اشتراک کا اختیار نہ دے بلکہ ان کے کام میں مداخلت کرے تا کہ وہ (قاسمین) حد سے زیادہ اجرت پر باہم اتفاق نہ کرلیں، اس سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے گا۔

اجرت کیسے تقسیم کی جائے؟

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تقسیم کی اجرت عدد روس کے مطابق ہوگی، اس لیے کہ اجرت تمیز کے مقابل ہے اور تمیز میں تفاوت نہیں ہوتا نیز کم حصہ داروں اور زیادہ حصہ داروں کا کام برابر ہوتا ہے۔ بسا اوقات قلیل تقسیم کے لحاظ سے حساب دشوار بھی ہو جاتا ہے۔ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تقسیم کی اجرت سہام (حصص) کے مطابق ہوگی کیونکہ یہ ملک کی مشقت ہے لہٰذا اس کے بقدر مقرر ہوگی، امام صاحب کے قول پر فتویٰ ہے۔

تقسیم کب کی جائے:

جب شرکاء قاضی کے پاس حاضر ہوں اور ان کے زیر قبضہ زمین یا مکان وغیرہ ہو اور وہ یہ دعویٰ کریں کہ ان کو یہ اشیاء اپنے باپ سے بطور وراثت حاصل ہوئی ہیں اور وہ اس جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کریں تو قاضی اسے تقسیم نہ کرے تاوقتیکہ وہ شرکاء مورث کے انتقال پر ثبوت قائم نہ کریں اور اس مورث کے ورثاء کی تعداد پر بھی بینہ قائم نہ کردیں۔ یہ امام صاحبؒ کے نزدیک ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تقسیم درحقیقت اس میت (مورث) پر فیصلہ کا عمل ہے۔ اس لیے وہ پہلے اس کے انتقال کا ثبوت فراہم کریں گے پس جب اس کی وفات ثابت ہو جائے تو اگر اس میت پر قرض ہے تو مال ترکہ سے اس کے قرض کی ادائیگی کی جائے گی اور اس کی

وصیتیں اسی مال سے نافذ کی جائیں گی۔ اگر قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ سے قبل ہی مال تقسیم کر دیا گیا تو ترکہ سے اس کا حق منقطع ہو جائے گا۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ شرکاء کے اعتراف پر تقسیم کر دی جائے گی کیونکہ جس چیز کی تقسیم مقصود ہے وہ چیز ان کے زیر قبضہ ہے جو کہ ملکیت کی دلیل ہے لہٰذا قاسم اس کو تقسیم کر دے گا اور تقسیم کے عقد میں یہ بات ملحوظ رکھی جائے گی کہ ان شرکاء کے قول پر اسے تقسیم کیا گیا تھا تا کہ ان ہی پر اکتفاء کیا جائے اور ان کے کسی دوسرے شریک کے خلاف فیصلہ نہ ہو۔

اگر مال مشترک منقولہ ہو اور وہ دعویٰ کریں کہ یہ مال بطور وراثت کے ان کو حاصل ہوا ہے اور اس کی تقسیم کا مطالبہ بھی کریں تو اس صورت میں بھی اسے ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر چند شرکاء غیر منقولہ جائیداد کے بارے میں یہ دعویٰ کریں کہ انہوں نے اسے خریدا ہے اور اس کی تقسیم کا مطالبہ کریں تو اسے بھی ان کے مابین تقسیم کر دیا جائے کیونکہ اس تقسیم میں قضاء علی الغیر نہیں ہے۔ اگر مطلق ملک والی غیر منقولہ جائیداد کے بارے دعویٰ کریں اور وہ انتقال کی کیفیت نہ بتائیں تو قاضی اسے تسلیم نہ کرے جب تک کہ اس بات پر ثبوت فراہم نہ کر دیں کہ یہ جائیداد ان کی ہے۔

تقسیم اور ناقابل تقسیم صورتیں:

شرکاء کے درمیان تقسیم کا عمل اس وقت مؤکد ہوتا ہے جب ہر شریک تقسیم کے بعد اپنے اپنے حصہ سے نفع حاصل کرتا ہو کیونکہ تقسیم سے منفعت مکمل ہوتی ہے لیکن اگر تقسیم سے سب کو ہی نفع کے نقصان ہوتا ہو تو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ شرکاء اس کا مطالبہ کریں۔ ایک روایت یہ ہے کہ قاضی شرکاء کی باہمی رضامندی پر تقسیم کر دے گا۔

اگر ایک شریک کو حصہ زیادہ ہونے کی وجہ سے نفع ہوتا ہو اور دوسرے کو نقصان پہنچتا ہو تو اگر بڑے حصہ والا تقسیم کا مطالبہ کرے تو اس کے لیے تقسیم کر دے تا کہ وہ اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس صورت میں اس کا مطالبہ معتبر ہوگا، قاعدہ ہے کہ دوسرے کے ضرر اور نقصان کی صورت میں کسی کا حق باطل نہیں ہوتا اور اگر کم حصہ والا شریک تقسیم کا مطالبہ کرے تو اس کے لیے تقسیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اسے اس تقسیم سے نقصان ہوگا، اور وہ اس تقسیم کے معاملہ میں اپنا نقصان کر رہا ہے لہٰذا اس کا مطالبہ غیر معتبر ہوگا جیسا کہ چھوٹے گھر اور موتی کی تقسیم کا حکم ہے۔ قاضی اس تقسیم سے باز رہے گا کیونکہ قاضی تو لوگوں کے مصالح کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا گیا

ہے کہ وہ عامۃ الناس کے منافع کا خیال رکھے اور نقصانات کا دفعیہ کرے لہٰذا اس کے لیے نقصان والا کام کرنا جائز نہ ہوگا۔

امام جصاصؒ نے سابقہ مسئلہ برعکس ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بڑے حصہ والا شریک دوسرے شریک کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کر رہا ہے اور دوسرا شریک اپنے نقصان پہ راضی ہے۔ حاکم شہیدؒ نے اپنی مختصر میں ذکر کیا ہے کہ ان دونوں میں سے جو بھی تقسیم کا مطالبہ کرے تو قاضی اس کے لیے تقسیم کر دے۔

سامان کی تقسیم

اگر اسباب ایک ہی قسم کے ہوں تو انہیں تقسیم کر دیا جائے گا اور یہ کپڑوں اور جانوروں کی طرح ہے اور مختلف الجنس اسباب کو شرکاء کی رضامندی سے تقسیم کیا جائے گا۔ اور انسان میں مذکر اور مؤنث دو جنسیں ہیں اور حیوانات میں ایک ہی جنس ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ متفاوت قسم کے جواہرات جیسے لولو اور یاقوت، انہیں تقسیم نہ کیا جائے کیونکہ یہ مختلف اجناس ہیں، بعض بعض میں منقسم نہیں ہوتے، البتہ جب ان میں سے ایک جنس الگ کر لی جائے اور اس میں تعدیل ممکن ہو تو اس کی تقسیم جائز ہے۔

اموال کی تقسیم

اموال سے مراد نقدی، سونا اور چاندی ہے اور یہ اجناس مختلفہ ہیں۔ چنانچہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے اموال کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی کیونکہ تقسیم تو مشترک مال میں ہوتی ہے اور اموال میں شرکت نہیں ہوتی لیکن جب وہ خود ہی راضی ہوں تو جائز ہے۔

اگر دو وارثوں نے مورث کی موت اور ورثہ کی تعداد پر گواہ قائم کیے اور زمین ان ہی دو کے قبضہ میں ہے اور ان کے ساتھ ایک اور وارث ہے جو غائب ہے اور حاضرین ورثہ نے تقسیم کا مطالبہ کیا تو زمین تقسیم کر دی جائے گی اور وارث غائب کے لیے ایک وکیل مقرر کر دیا جائے گا جو اس کے حصہ پر قبضہ کرے گا تا کہ اس کی حق تلفی نہ ہو اور اگر طالبان تقسیم خریدار ہوں یعنی ان کی شرکت بطریق میراث نہ ہو بلکہ بذریعہ خرید ثابت ہوئی ہو اور ان کا ایک شریک غائب ہو تو حاضرین کی طلب پر تقسیم نہ ہوگی کیونکہ جو ملک بذریعہ خرید ثابت ہوتی ہے وہ ملک جدید ہے پس شریک حاضر شریک غائب کی جانب سے خصم نہیں ہو سکتا۔ بخلاف وراثت کے کہ اس میں ملک نہیں ہوتی بلکہ مورث کی طرف سے ملک نیابت ہوتی ہے۔ جب جائیداد وارث

غائب کے قبضہ میں ہو تو اسے تقسیم نہ کیا جائے گا، یہ حکم جب ہے جب چھوٹے بچے یا مودع کے قبضہ میں کوئی چیز ہو کیونکہ یہ تقسیم علی الغائب والصغیر ہے اور ان دونوں کی طرف سے کوئی خصم بھی موجود نہیں ہے اور مودع خصم کا امین ہے اور خصم کا امین اس کی طرف سے خصم نہیں ہوسکتا اور بغیر خصم کے فیصلہ کرانا جائز نہیں ہے اور اس صورت میں بینہ قائم کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وھو الصحیح

اگر ایک وارث حاضر ہو تو قاسم تقسیم نہ کرے گا، اگرچہ وہ بینہ قائم کردے کیونکہ دو خصموں کی موجودگی ضروری ہے، ایک ہی شخص مخاصِم اور مخاصَم نہیں ہوسکتا۔ اس طرح ایک ہی شخص مقاسِم اور مقاسَم (دونوں) نہیں ہوسکتا۔ بخلاف اس صورت کے کہ دو شخص حاضر اور موجود ہوں جیسا کہ اس سے پہلے وضاحت ہوچکی ہے۔

اگر بڑا وارث قاسم کے پاس حاضر ہو اور ایسا شخص بھی آجائے جس کے لیے اس میں ثلث کی وصیت کی گئی ہو اور وہ دونوں تقسیم کا مطالبہ کریں اور میراث اور وصیت پر بینہ بھی قائم کردیں تو قاسم اسے تقسیم کردے گا کیونکہ دو خصم موجود ہیں، بڑا میت کی جانب سے اور موصیٰ لہ اپنی ذات کی طرف سے بچے کے وصی کا بھی یہی حکم ہے گویا کہ وہ خود بوغ کے بعد حاضر ہوا ہے کیونکہ وہ اس کا قائم مقام ہے۔

ایک ہی شہر میں مشترک مکانات کی تقسیم

جب میت ایک ہی علاقہ (شہر) میں اپنے ورثاء کے لیے چند مکانات چھوڑ کر جائے اور وہ مکانات (گھر) ان کے درمیان مشترک تھے تو ہر گھر علیحدہ علیحدہ ان میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مکانات اجناس مختلفہ ہیں کہ اپنے محل وقوع، بازاروں کے قرب اور بعد پڑوسیوں کے مختلف ہونے کی بنا پر ان کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں اور یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے اور ایک ہی عمارت (بلڈنگ) میں مختلف فلیٹ ایک ہی تقسیم کے اعتبار سے تقسیم ہوں گے جبکہ ان فلیٹ پیمائش میں برابر ہوں، اگر مختلف ہوں تو رضامندی کے بغیر تقسیم نہ کیا جائے گا ورنہ ہر گھر علیحدہ علیحدہ تقسیم کیا جائے گا کیونکہ قاضی ایسے فعل کا مامور ہے جو ان کے لیے زیادہ مفید ہو اور اس کے ساتھ ان کے حقوق بھی محفوظ ہوں۔

اگر وہ مکانات مختلف شہروں میں ہوں تو صاحبینؒ کے نزدیک تقسیم میں ان کو جمع نہیں کیا جائے گا اگر میت نے ایک گھر اور ایک کھیت یا ایک کوچہ اور ایک دکان ترکہ میں چھوڑی تو اختلاف جنس کی وجہ سے ایک کو مطلقاً علیحدہ علیحدہ تقسیم کیا جائے گا۔

طریق تقسیم

قاسم ایک کاغذ پر مکان یا زمین کا جس کو وہ تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کا نقشہ بنالے اور سہام قسمت پر برابر تقسیم کرے، پس سب سے کمتر سہم (حصہ) کو لے کر مقسوم کو اسی پر جاری کرے مثلاً اگر بقل سہام ثلث ہو تو تقسیم بطریق اثلاث ہوگی اور سدس ہو تو بطریق اسداس تاکہ تقسیم کا عمل ممکن ہو اور زمین کی پیمائش اور عمارت کی قیمت لگانے کے بعد ہر حصہ دار کا حصہ نوٹ کرلے کہ فلاں کو اتنا دیا اور فلاں کو اتنا دیا۔ اس لیے کہ بسا اوقات اسے آخر میں اس کی احتیاج ہوتی۔ اور ہر ایک کا حصہ دوسرے سے بالکل علیحدہ کردے تاکہ ایک کے حصہ کا دوسرے کے حصہ سے کوئی تعلق باقی نہ رہے اور تمیز کا مفہوم پوری طرح ثابت ہو، پھر حصوں کو اول، ثانی، ثالث وغیرہ کا نام دے۔ کاغذ کے ٹکڑوں پر متقاسمین کے نام لکھ لے اور اسے فائل وغیرہ میں رکھ کر قاضی کو بھیج دے تاکہ وہ خود ان کے درمیان قرعہ اندازی کا کام سرانجام دے سکے۔ پھر وہ کاغذ کے ان ٹکڑوں میں سے جن میں متقاسمین کے نام مرقوم ہیں، ایک ٹکڑا نکالے گا، پس جس کا نام پہلے نکلے اس کے لیے پہلا حصہ ہے یعنی وہ حصہ جس کا اس نے اول کے ساتھ نام رکھا تھا اور جس کا نام دوسرے نمبر پر نکلے اس کے لیے دوسرا حصہ ہے۔ اسی طرح چلتا جائے، یہ سب اس صورت میں ہے جب حصوں میں اتحاد ہو اگر حصے مختلف ہوں مثلاً ایک شریک کے لیے دس حصے، دوسرے کے لیے پانچ حصے اور تیسرے کے لیے ایک حصہ ہو تو اسے سولہ حصوں میں تقسیم کریں گے اور ان تینوں کے نام لکھ لے گا، پس اگر دس حصوں والے کا نام پہلے نکلا تو وہ اسے پہلا حصہ اور اس سے متصل نو حصے دے گا تاکہ اس کا حصہ متصل ہو پورا ہونے تک اسی طرح کرے گا۔ قرعہ اندازی کا عمل محض ان کی دلداری اور جانبداری کے ازالہ کے لیے ہے حتیٰ کہ اگر بغیر قرعہ اندازی کے ہر ایک کا حصہ متعین ہو جائے تو جائز ہے کیونکہ یہ بھی قضاء کے معنی میں ہے۔ قاسم کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ قسمت کے اس عمل میں مال اور نقدی کو شامل کرے اگر اس نے ایسا کرلیا تو جائز ہے لیکن ایسا نہ کرنا بہتر ہے، یہ اس وقت ہے کہ جب نقدی کے بغیر تقسیم ممکن ہو، اگر ممکن نہ ہو تو سب سے کمزور حصہ کا نقدی سے معادلہ کرے اور اس تقسیم میں نقدی کا شمول باہمی رضامندی سے ہو۔ قاضی کے جبر سے نہ ہو۔ الا یہ کہ جب کوئی دشواری پیش آجائے تو اس صورت میں قاضی کو اختیار ہے۔

ایک گھر چند آدمیوں کے درمیان مشترک ہو اور وہ اس کی تقسیم کا ارادہ کریں اور اگر

ایک جانب عمارت زیادہ ہو اور ان میں سے ایک یہ چاہے کہ اس عمارت کے عوض میں نقدی دے اور دوسرا یہ چاہے کہ اس کے لیے عوض زمین دے تو اس کا عوض زمین ہی سے دیا جائے گا اور جس کے حصہ میں وہ عمارت واقع ہے اسے اپنے مقابل کو پیسہ واپس کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ہاں البتہ خوشی سے ہو تو جائز ہے کیونکہ قسمت میں بھی مبادلہ کا معنی پایا جاتا ہے۔ پس اگر ان کے درمیان وہ گھر تقسیم کر دیا گیا اور ایک کا راستہ دوسرے کی ملک میں آتا ہو تو اگر ممکن ہو تو اس سے اپنا راستہ پھیر لے، پھر اس کے لیے جائز نہیں کہ دوسرے کے حصہ میں راستہ بنائے کیونکہ بغیر ضرر کے تقسیم کا تحقق ممکن ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس قسمت کو فسخ کر دیا جائے گا، اس لیے کہ اختلاط باقی ہونے کی وجہ سے وہ مختلف ہے لہذا از سر نو قسمت ہوگی۔

دو منزلہ مکانوں کی تقسیم

ایک نیچے والا مکان دو آدمیوں میں مشترک ہے اور اوپر والا کسی اور کا ہے یا اوپر والا دو میں مشترک ہے اور نیچے والا کسی اور کا ہے یا نیچے اوپر کا ایک مکان دو میں مشترک ہے تو امام محمدؒ کے نزدیک ایسے مشترک مکانوں کی تقسیم علیحدہ علیحدہ قیمت لگا کر ہوگی۔ شیخینؒ کے نزدیک پیمائش سے ہوگی کیونکہ تقسیم میں اصل یہی ہے نیز شرکاء کی شرکت مذروع میں ہے نہ کہ قیمت میں لیکن فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے کیونکہ نیچے والے مکان میں کنواں کھودنا، تہہ خانہ اور اصطبل بنانا وغیرہ امور کی صلاحیت ہوتی ہے اور اوپر والے میں نہیں ہوتی، پس دونوں مکان بمنزلہ دو جنسوں کے ہوئے، اس لیے شرکاء کے حصوں میں برابری قیمت ہی کے اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ اگر تقسیم ہو چکنے کے بعد کسی شریک نے کہا کہ مجھے میرا حق نہیں ملا اور دو قاسموں نے گواہی دی کہ وہ پورا حق لے چکا ہے تو شیخینؒ کے نزدیک ان کی گواہی مقبول ہوگی۔ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مقبول نہ ہوگی کیونکہ ان کی یہ گواہی خود اپنے فعل پر ہے جس میں تہمت کا امکان موجود ہے۔ شیخینؒ فرماتے ہیں کہ ان کا فعل تقسیم کرنا ہے اور گواہی استیفائے حق پر ہے جو دوسرے کا فعل ہے۔

اگر کسی شریک نے یہ کہا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے اور میرا کچھ حصہ دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں ہے حالانکہ وہ پہلے اپنا حصہ وصول کر لینے کا اقرار کر چکا ہے تو گواہی کے بغیر اس کی تصدیق نہ ہوگی کیونکہ وہ تمامیت قسمت کے بعد اس کے فسخ کا مدعی ہے۔ فلا یصدق الا ببینة

اگر ایک حصہ دار اپنا پورا حصہ لینے کا اقرار کرنے سے پہلے یہ کہے کہ میرا حصہ فلاں جگہ تک ہے اور وہاں تک میرے حصہ دار نے مجھے نہیں دیا اور دوسرا حصہ دار اس کی تکذیب

کرے تو اس پر وہ دونوں قسم کھائیں گے اور قسمت فسخ ہو جائے گی کیونکہ مقدار ما حصل میں اختلاف ہونے کی وجہ سے عقد تام نہیں ہوا۔

اگر تقسیم کے بعد ایک شریک کا کچھ حصہ کسی دوسرے مستحق کا نکل آیا تو طرفینؒ کے نزدیک اس کو اختیار ہے، چاہے تو بقدر مستحق اپنے شریک سے لے اور چاہے تو باقی ماندہ کو واپس کرکے دوبارہ تقسیم کرا لے۔ امام ابو یوسف کے ہاں تقسیم دوبارہ ہوگی کیونکہ اب تیسرا شریک نکل آیا اور وہ راضی نہیں، طرفین یہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک شریک کے حصے میں سے اجزاء شائع کے مستحق نکل آنے سے معنی افراد معدوم نہیں ہوتے۔ اس لیے اس کو اختیار ہوگا۔

باہمی رضامندی سے معاہدہ

کسی معاملہ میں باہمی رضامندی اور موافقت کرنا استحساناً جائز ہے۔ اگرچہ قیاس اس کے جواز کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ منفعت کا اس جیسی منفعت کے ساتھ مبادلہ کرتا ہے جو اس سے متاثر ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے بطور استحسان جائز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ (الشعراء: ۱۵۵)

نیز ایک ہی وقت میں انتفاع پر جمع ہونا متعذر ہے۔

اور باہمی رضامندی کا حکم قسمت جیسا ہے جس طرح قسمت اعیان میں جائز ہے، منافع میں بھی جائز ہے البتہ منفعت کے حصول میں قسمت، مہایات سے زیادہ قوی ہے۔ اس لیے کہ قسمت کہتے ہیں ایک ہی وقت میں منافع کو جمع کرنا اور مہایات کو طلب کرے تو قاضی تقسیم کرے گا کیونکہ تکمیل منفعت اس میں زیادہ ہے۔ اگر محتمل قسمت صورت میں مہایات واقع ہو جائے، پھر ایک شریک قسمت کو طلب کرے تو قاسم تقسیم کرے گا اور مہایات باطل ہوگی۔

مہایات (باہمی رضامندی) کسی ایک کی موت یا دونوں کی موت سے باطل نہیں ہوتی۔ کیونکہ مہایات ٹوٹ جائے تو حاکم از سر نو کر سکتا ہے اور مہایات میں قاضی کا جبر جاری ہوتا ہے۔

اگر وہ شخص ایک گھر میں مہایات (باہمی اتفاق) کریں کہ ان میں سے ایک اس کی اوپر والی منزل میں سکونت اختیار کرے گا اور دوسرا نیچے والی منزل میں رہے گا تو جائز ہے اس لیے کہ اس صورت میں مہایات تمام حصص کا افراز ہے۔ اس میں مبادلہ نہیں ہے اور ہر ایک کے لیے جائز ہے کہ اس مہایات سے ہونے والا نفع حاصل کرنے، عقد میں اس کی شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو۔ اسی طرح ہر ایک کے لیے جائز ہے کہ اپنے حصہ کو اجارہ پر دے کر اس کا نفع حاصل

کرے کیونکہ یہ منافع کی تقسیم ہے اور وہ اس کا مالک ہو چکا ہے لہٰذا اس کا نفع حاصل کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔ اگر دو آدمی دو گھروں کے بارے میں باہم اتفاق کرلیں کہ ہر دن میں ایک ایک گھر میں ٹھہرے گا تو جائز ہے اور اس پر قاضی مجبور کرسکتا ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک تو یہ ظاہر ہے کہ وہ اصل کی تقسیم پر اس کو قیاس کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ایک قول یہ ہے کہ قسمت کی طرح قاضی جبر نہیں کرے گا اور ایک قول میں بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بیع السکنیٰ بالسکنیٰ ہے۔ بخلاف قسمت کے کہ وہ ان میں ایک کے حصہ کا دوسرے کے حصہ کے بدلے بیچنا ہے اور وہ جائز ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے کیونکہ منافع میں تفاوت کم ہوتا ہے اور یہ افراز ہوگا۔

دو گھروں میں آمدنی پر باہمی اتفاق جائز ہے اگر ایک گھر کی آمدنی زیادہ ہو جائے تو وہ دونوں اس میں شریک نہ ہوں گے۔ بخلاف ایک گھر کے، ان میں وجہ فرق یہ ہے کہ دو گھروں میں تمیز کا معنی موجود ہے اور افراز راجح ہے کیونکہ استیفاء کا زمانہ ایک ہے جبکہ ایک گھر میں وصول منفعت کے متعاقب ہے لہٰذا اسے قرض پر قیاس کریں گے اور ہر ایک کو اس کی باری میں لگائیں گے جیسے وکیل ہوتا ہے، اس لیے اس کا زائد حصہ اس پر لوٹا دیا جائے گا۔

اگر دو آدمیوں میں کھجور کے درخت، یا مطلق درخت یا بکریاں مشترک ہوں اور وہ دونوں باہم اتفاق کرلیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک ان کا ایک حصہ لے کر اس درخت کا پھل حاصل کرے گا یا ان بکریوں کو چرائے گا اور ان بکریوں کا دودھ پیے گا تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ منافع میں مہایات اس ضرورت کے پیش نظر ہوتی ہے کہ وہ باقی نہیں رہتے جس سے اس کی تقسیم دشوار ہو جاتی ہے جبکہ یہ اعیان ہیں جو باقی رہنے والے ہیں جن کے حصول کی صورت میں ان کی تقسیم لازم آتی ہے۔

وقف کے احکام

وقف لغۃً بمعنی حبس ہے یعنی روکنا، چنانچہ موقف الحساب اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ قیامت کے روز حساب کتاب کے لیے روکے جائیں گے۔ اصطلاح شرع میں وقف اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو واقف اپنی ملک میں روکے رکھے اور اس کے منافع خیرات کردے اور یہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی بنا پر ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک وقف یہ ہے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملک پر روک لے اور اس کا نفع جس پر چاہے وقف کردے۔ امام صاحبؒ کے ہاں واقف کی ملک کا زوال بلا حکم حاکم نہ ہوگا کیونکہ جن مسائل میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے ان میں حاکم

کے حکم کی ضرورت ہوتی ہے یا واقف اسے مرنے پر معلق کردے یعنی یہ کہلائے کہ جب میں مر جاؤں تو میرا مکان اتنے آدمیوں کے لیے وقف ہے اور یہ وقف بمنزلہ وصیت کے ہے اس لیے ہبہ کی طرح ثلث مال سے ہوگا اور موت سے ہی اس کا لزوم ہوگا۔ اس سے پہلے نہیں ہوگا۔

امام صاحبؒ کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لا حبس عن فرائض الله عزو جل﴾: ''اللہ تعالیٰ کے فرائض سے کوئی چیز حبس نہیں ہے۔''[1]

یعنی ہر چیز میراث کے موافق بفرائض الٰہی تقسیم ہو جائے گی۔ نیز حضرت ابن عباس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے سورۃ النساء کے نازل ہونے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

﴿لا حبس بعد سورة النساء﴾[2]: ''یعنی سورۃ النساء کے نزول کے بعد کوئی مال وقف نہ ہوگا اور نہ ہی وارث سے روکا جائے گا۔''

گویا کہ دور جاہلیت کے افعال کی طرف اشارہ ہے کہ وہ میت کا مال روک لیتے اور جب بدصورتی یا مال کی کمی کی وجہ سے عورتوں سے کراہت کرتے تو انہیں ازواج سے روک لیتے، ان کے نزدیک میت کے اولیاء ان عورتوں کے زیادہ حق دار ہوتے تھے۔

امام صاحبؒ کی دلیل قاضی شریحؒ کا بھی قول ہے کہ

﴿جاء محمد بمنع الحبس﴾[3]: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر حبس کو روکا۔''

اب یہاں ظاہری الفاظ اگرچہ وقف کی اجازت نہیں دیتے مگر امام صاحبؒ کے نزدیک اصح یہ ہے کہ یہ جائز ہے البتہ یہ لازم نہیں ہوتا، وقف کا جواز حضرت جویریہ بنت حارث کے بھائی حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت نہ درہم چھوڑا نہ دینار اور نہ کوئی غلام اور نہ باندی اور نہ کچھ اور مگر سفید رنگ کا خچر اور ہتھیار اور ایک زمین جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کر دیا تھا۔[4]

حضرت مسروقؒ حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں اپنے سات باغ بنو عبدالمطلب اور بنو ہاشم پر صدقہ کیے۔[5]

---

[1] [سنن الدار قطنی ۳/ ۶۸، طبرانی]　[2] ایضاً

[3] [سنن البیہقی ۶/ ۱۶۳]　[4] [صحیح البخاری ۵۵۴]　[5] [سنن البیہقی ۶/ ۱۶۰]

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی وقف کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ، حضرت حکیم بن حزامؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت انسؓ وغیرہ ہیں۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف کے معنی ہیں مال عین کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر روکنا چنانچہ واقف کی ملکیت اس چیز سے اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح لوٹے گی جیسے اس کا منافع بندوں کی طرف لوٹتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف کرتے ہی اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی۔ خواہ وہ قابل تقسیم میں ہو یا نہ ہو، متولی کے حوالہ کرے یا نہ کرے اور جہت وقف ذکر کرے یا نہ کرے اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ واقف کی ملکیت اس چیز سے زائل نہیں ہوتی تاوقتیکہ چار شرائط پائی نہ جائیں۔

(۱) وقف کے لیے متولی مقرر کر کے اس کے حوالہ کرے۔ (۲) وقف مفرز ہو۔ (۳) منافع وقف میں سے کسی چیز کی اپنے لیے شرط نہ لگائے۔ (۴) وہ وقف ابدی (ہمیشہ کے لیے) ہو جیسا کہ حضرت عثمان حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صدقہ جائز نہیں یہاں تک کہ اس پر قبضہ ہو جائے۔[۱]

حضرت معاذ بن جبل اور قاضی شریح سے بھی مروی ہے کہ وہ اسے جائز قرار نہیں دیتے تھے تاوقتیکہ اس پر قبضہ نہ ہو۔[۲] اس سے معلوم ہوا ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک وقف کے لیے واجب ہے کہ وہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور تملیک سے آزاد ہو تاکہ اس کے صاحب کو اس کا دائمی طور پر نفع حاصل ہو اور بندوں کے لیے اس چیز کا وقف جاری رہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک ضرورت وقف کے لزوم کی ہے تاکہ دائمی طور پر اس کا ثواب اس کو ملتا رہے اور یہ کہ وقف، واقف کی ملکیت کو ساقط کر کے ممکن ہے اور اسے مسجد کی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے کر دے۔ امام ابو یوسف پہلے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو لیتے تھے لیکن جب بغداد آئے اور یہاں انہوں نے حدیث عمر کو سنا تو انہوں نے اس لیے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ اگر یہ حدیث ابوحنیفہ کو پہنچتی تو وہ ضرور اپنے قول سے رجوع کر لیتے اور اس روایت کو محمد بن الحسنؒ نے صخر بن جویریہ سے اور انہوں نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے اس روایت کو ابوسعید سے، انہوں نے صخر سے اور انہوں نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنا مال

---

[۱] سنن البیہقی ۶/۱۷۰ [۲] ایضاً

صدقہ کیا ہے اور اس مال کو ثمغ کہہ جاتا تھا وہ کھجور کے درخت تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایک مال حاصل ہوا ہے جو میری نظر میں بڑا قیمتی ہے۔ میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کا اصل صدقہ کردو کہ نہ فروخت کیا جائے گا، نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ ہی وراثت میں دیا جائے گا لیکن اس کا پھل خرچ کیا جائے گا۔" چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے صدقہ کیا کہ ان کا یہ صدقہ اللہ کی راہ میں، غلاموں کی آزادی، مساکین، مہمانوں، مسافروں اور قرابت داروں کے لیے ہوگا اور اس کے متولی کو اس میں سے معروف طریقہ سے کچھ کھا لینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ وہ اپنے دوست کو کھلائے لیکن اس کے ذریعہ اس کو متمول نہ بنائے گا۔[1]

لیکن وقف کے جواز میں صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ ہے، بعض فقہاء کرام نے لوگوں میں وقف کی ترغیب پیدا کرنے کے لیے امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کیا ہے اور بعض فقہاء نے امام محمدؒ کے قول کو اخذ کیا ہے کیونکہ وہ موافقت آثار کے زیادہ قریب ہے۔

وقف مشاع کا حکم

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قابل تقسیم مشاع کا وقف جائز ہے کیونکہ تقسیم کرنا قبضہ ہونے کا تتمہ ہے اور ان کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے، پس ایسے ہی اس قبضہ کے تتمہ کا حکم ہے اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف مشاع جائز نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں اصل قبضہ شرط ہے چنانچہ یہی حکم اس چیز کا ہے جس سے قبضہ تام ہوا ہو اور یہ اختلاف ان جائیداد میں ہے جو تقسیم کے قابل ہے جو چیز تقسیم کے قابل نہیں تو امام محمدؒ کے ہاں وقف مشاع کے باوجود اس کا وقف بھی جائز ہے کیونکہ امام محمدؒ وقف مشاع کو ہبہ اور صدقہ پر قیاس کرتے ہیں کہ جو سپرد کیا گیا ہے مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسجد و قبرہ مستثنیٰ ہے، یہی دو (مسجد، مقبرہ) وقف مشاع کے باوجود امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بقاء شرکت خالصاً لوجہ اللہ سے مانع ہے اور اس لیے بھی کہ ان دونوں (مسجد، مقبرہ) سے باری باری فائدہ اٹھانے کا معاہدہ کرنا نہایت قبیح ہے۔ یعنی طور کہ ایک سال اس وقف مشاع میں مردے دفن کیے جائیں اور ایک سال زراعت کی جائے یا ایک وقت میں نماز پڑھی جائے اور ایک وقت میں اصطبل بنایا جائے جبکہ تقسیم کے قابل نہیں ہے، بخلاف وقف (مسجد، مقبرہ) کے (دوسرے طور پر وقف جائز ہے) کیونکہ یہ ممکن ہے کہ (زراعت وغیرہ سے) اس کی حاصلات سے گزارہ کرلیا جائے اور کرائی

---

[1] صحیح البخاری ۱/۵۶۱

نے ایک ٹکڑا (زمین کا) مکمل وقف کیا پھر کسی جزء کا کوئی شخص مستحق ثابت ہوا تو امام محمدؒ کے نزدیک وقف کا بقیہ بھی باطل ہو جائے گا کیونکہ بوقت وقف مشاع تھا جیسا کہ ہبہ میں ہے، بخلاف اس کے کہ جب (ہبہ کے وقت مشاع نہ ہو) ہبہ کرنے والے نے بعض میں رجوع کیا یا مریض نے حالت مرض میں ہبہ یا وقف کیا اور وارث نے بعد از موت دو تہائی پھیر لیا اور ان کی وراثت میں آگئی ہے (شی اس کے سوا اور کوئی ترکہ نہیں ہے) کیونکہ شیوع (وقف مشاع) پیچھے سے عارض ہوا ہے اور اگر وہ جزء جس کا استحقاق ثابت ہوا ہے متعین ممیز ہے عدم شیوع کی وجہ سے باقی (کالنصف) باطل نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں وہ باقی وقف جائز تھا اور اسی حالت پر ہبہ اور صدقہ مملوکہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وقف، تام (پورا) نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کے آخر میں صرف کی ایسی جہت ہو جو کبھی منقطع نہ ہو جیسے کہ وہ یوں کہے کہ میں نے اپنی یہ زمین فلاں کی اولاد و نسل کے لیے بطور صدقہ وقف کردی، ان کے بعد اس زمین کا نفع مساکین کے لیے ہوگا تو اس کا وقف درست ہوگا۔ کیونکہ مساکین کا نشان کبھی منقطع نہیں ہوتا اور اگر ایسا نہ کہے تو وقف درست نہ ہوگا اگر اس نے ذمی پر وقف کیا تو جائز ہے اس لیے کہ وہ زکوٰۃ کے سوا دوسری قربت کا محل ہے، اس لیے اس پر صدقہ کرنا جائز ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾ ممتحنہ ۸: "اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑے اور جنھوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔"

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جب اس صرف میں وہ جہت منقطع ہو جائے تو پھر بھی وقف جائز ہے اور اس انقطاع جہت کے بعد وہ (وقف) فقراء کے لیے ہو جائے گا، خواہ فقراء کا نام نہ لیا ہو جیسے کہ وہ یوں کہے کہ میں نے اپنی زمین صدقہ کردی یہ ہمیشہ وقف رہے گی۔ فقراء اور مساکین کا ذکر نہ بھی کرے، اس لیے کہ جب اس نے وہ زمین اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کردی تو اس کو ابدی طور پر وقف کر دیا کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے وہ مساکین کی طرف ہی پھیری جاتی ہے، پس یہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے ان (مساکین) کا نام لے لیا۔

وقف کی بعض صورتیں

اگر کہے کہ میں نے اپنی یہ زمین ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی اولاد پر صدقہ کر دی اور ان کے بعد وہ زمین مساکین پر صدقہ ہے تو اس زمین کی آمدن اس کی صلبی مذکر اور مؤنث اولاد اور خنثیٰ کے لیے ہوگی۔ خزانۃ الاکمل میں ہے کہ اس میں مذکر اور مؤنث برابر ہیں اور وقف کے دن جو اولاد موجود ہوگی ان پر وقف ہوگا۔ اور ہر اس اولاد پر جو اس کے بعد پیدا ہوگی تو اگر وہ بچہ آمدن آنے کے دن سے چھ ماہ سے کم عرصہ میں پیدا ہوا ہو تو وہ وقف میں داخل ہوگا۔ جب اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے اس سے قبل کہ اس کی آمدن آئے تو اس کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا اور جو آمدن آنے کے بعد فوت ہوا ہو تو اس کا حصہ ہوگا، اس سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا اور وصیتیں نافذ کی جائیں گی اور باقی مال اس کے ورثہ کو ملے گا۔

اگر اپنی اولاد کی اولاد پر وقف کرے تو اس میں بنین اور بنات دونوں کی اولاد داخل ہوگی، خواہ وہ قریب کے ہوں یا بعید کے ہوں کیونکہ تمام اس کی نسل و اولاد میں سے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ﴾ [الانعام: ۸۴] اور اللہ تعالیٰ نے بعد کے باوجود سب کو ان کی ذریت میں شمار کیا ہے۔

صاحب ''الاختیار'' فرماتے ہیں کہ جب اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد پر وقف کرے تو اس میں اس کی صلبی اولاد داخل ہوگی اور وقف کے دن اور اس کے بعد جو اولاد کی اولاد موجود ہوگی وہ بھی داخل ہوگی اور آمدن میں دو پیٹ شریک ہوں گے اور جو ان دو پیٹوں سے نیچے کے ہوں وہ اس میں داخل نہ ہوں گے کیونکہ اس نے ان دونوں کو خاص طور سے ذکر کیا ہے نیز وہ فرماتے ہیں کہ جب اپنی اولاد پر وقف کرے گا تو اس میں تمام پیٹ داخل ہوں گے کیونکہ اولاد کا لفظ عام ہے۔ البتہ بطن اول کو مقدم کیا جائے گا جب وہ ختم ہو جائے تو پھر بطن ثانی کا حق ہوگا، پھر جو ان کے بعد ہوں گے ان کا حق ہوگا اس میں تمام بطون برابر طور پر شریک ہوں گے خواہ ان کے قریب ہوں یا بعید کے ہوں کیونکہ اس کا مقصد اس کی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہے۔

چنانچہ حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما سامنے سے ہویدا ہوئے، سرخ رنگ کے کرتے ان کے بدن پر زیبا تھے اور گرتے پڑتے آ رہے تھے، جب

آنحضور ﷺ نے انہیں دیکھا تو منبر سے نیچے اتر آئے اور ان کو پکڑا اور منبر پر چڑھ گئے اور ان کو اپنی گود میں بٹھا لیا، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ تمہارے مال اور اولاد ایک آزمائش ہیں، میں نے ان کو دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا یہاں تک کہ میں نے ان کو اٹھا لیا۔[1]

اگر اس نے ان پر وقف کیا جن کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو اس میں بنات کی اولاد داخل نہ ہوں گی کیونکہ وہ اولاد اس کی طرف منسوب نہیں ہوتی۔

اگر بنین پر وقف کیا تو اس میں خنثیٰ داخل نہ ہوں گے، اسی طرح اگر بنات پر وقف کرے تو اس صورت میں بھی خنثیٰ اس میں داخل نہ ہوں گے لیکن اگر بنین اور بنات دونوں پر وقف کرے تو اس میں خنثیٰ داخل ہوں گے کیونکہ وہ یا تو بیٹا ہوگا یا بیٹی بعض کے نزدیک خنثیٰ داخل نہ ہوں گے۔ اگر کہے کہ اگر میں اپنی اس بیماری میں مر گیا تو میں اپنی زمین یا عمارت (بلڈنگ) وقف کرتا ہوں تو یہ درست نہیں ہے۔ خواہ اس مرض سے شفاء پائے یا فوت ہو کیونکہ اس نے وقف کو شرط کے ساتھ معلق کر دیا حالانکہ وقف کو شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں ہے۔

اگر کہتا ہے کہ اگر میں اپنے اس مرض میں فوت ہو گیا تو تم میری زمین کو وقف کر دینا تو یہ جائز ہے، ان میں وجہ فرق یہ ہے کہ یہ توکیل کو شرط کے ساتھ معلق کرنا ہے جو کہ جائز صورت ہے۔ صرف اغنیاء پر وقف کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ قربت نہیں ہے اور یہ چیز ثواب کا باعث بھی نہیں ہے اور یہ صدقہ کی مانند ہو جائے گی۔ اگر اغنیاء پر وقف کرے اور وہ محدود ہوں پھر ان کے بعد فقراء پر وقف ہو تو جائز ہے اگر کہتا ہے کہ میری یہ عمارت صدقہ ہے اور فقراء پر وقف شدہ ہے تو اس کے رشتہ داروں اور اولاد میں جو فقراء ہوں گے وہ بھی اس میں داخل ہوں گے بلکہ ان پر اس کی آمدنی کا صرف کرنا دوسروں پر صرف کرنے سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔

اس کے بعد اپنی اولاد پر آمدنی کا صرف کرنا افضل ہے کیونکہ اس کے حق میں صلہ رحمی زیادہ لازم ہے، پھر اپنے قرابت داروں پر اس کو صرف کرے، اس کے بعد اپنے پڑوسیوں پر صرف کرے، پھر اپنے اہل شہر میں سے جو اس وقف کے زیادہ قریب ہو اس پر صرف کرے۔

مناسب یہ ہے کہ مختلف اوقات میں سب کو دے کیونکہ جب وہ دائمی طور پر تمام صرف کرے گا تو کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ لوگ اسے اپنا بادشاہ بنا لیں گے جو فقیر قرابت دار ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے گواہوں سے اپنی قرابت اور فقر کو ثابت کرے

[1] (سنن البیہقی ۱۶۵/۶)

بصورت دیگر وقف میں اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا ہاں البتہ اگر وہ اپنا فقر ثابت کرے تو صرف فقر کے لحاظ سے اس کا حصہ ہوگا۔

اگر اپنے قرابت دار فقراء پر وقف کرے تو وقف سے انتفاع میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے جو قضاء سے ہی نفقہ کے مستحق ہوتے ہیں جیسے بھائی وغیرہ۔

اگر اپنے سب سے قریبی قرابت داروں پر وقف کرے تو نواسی کی بیٹی سگی بہن سے زیادہ حق دار ہوگی کیونکہ وہ اس کی صلبی ہے اور بہن اس کے باپ کی صلب میں سے ہے اور وراثت کا اعتبار نہیں ہے۔

اشیاء منقولہ کے وقف کا حکم

اگر کوئی شخص منقولہ مال میں سے کوئی چیز وقف کرنا چاہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واقف منقولہ جائیداد یا مال کو وقف کرنے کا مجاز نہ ہوگا کیونکہ منقولہ اشیاء کا وقف ہلاکت کے اندیشہ کی وجہ سے ابدی نہیں ہوتا لہذا مقصودی طور پر منقولہ اشیاء کا وقف صحیح نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کھیت بمع بیلوں اور کاشت کاروں کے وقف کرے جو اس (واقف) کے غلام ہوں تو وقف جائز ہے اور اسی طرح دیگر تمام زرعی آلات کا وقف بھی جائز ہے کیونکہ حصول مقصود (غلہ وغیرہ) میں یہ زمین کے تابع ہیں اور کبھی ایک چیز مستقل طور پر ارادہ کرکے وقف میں ثابت نہیں ہوتی بلکہ بالتبع ثابت ہو جاتی ہے اور منقولہ چیز صرف گھوڑے یا ہتھیار ہوں تو نص کی وجہ سے جائز ہے جس کا ذکر آرہا ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑوں اور ہتھیاروں کا حبس (روکنا) یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کرنا جائز ہے اور جن منقولات میں تعامل جاری ہے ان میں وقف جائز ہے جیسے کلہاڑا، بڑی کدال، بسولا اور تابوت بمع کپڑوں کے اور آلات زراعت دتجارت، کپڑے، دیگیں اور مصحف اور کتب اور امام ابو یوسف کے نزدیک یہ (منقولات کا وقف) جائز نہیں ہے کیونکہ یہ خلاف قیاس ہے اور قیاس اس وقت ترک کیا جاتا ہے جب نص وارد ہو اور نص گھوڑے اور ہتھیار میں وارد ہے، پس وہیں تک نص محدود رہے گی۔ شہروں کے اکثر فقہاء کرام امام محمدؒ کے قول پر عمل پیرا ہیں، ان کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صدقات پر مامور کیا اور ابن جمیل، خالد بن ولید اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے صدقہ دینے سے انکار کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن جمیل کو کیا بات ناگوار گزرتی ہے

ما سوائے اس کے کہ وہ فقیر تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے مالدار بنادیا، رہا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تو تم اس پر ظلم کرتے ہو اس نے اپنی زرہیں اور سامان جنگ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں وقف کیا ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زکوۃ مجھ پر ہے۔[1]

وقف شدہ چیز کی بیع

جب کسی شخص نے کوئی چیز صحیح طور پر وقف کی تو اسے فروخت کرنا یا ملکیت میں لانا جائز نہ ہوگا کیونکہ وقف شدہ چیز واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے۔ البتہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف مشاع (مشترکہ جائیداد) میں کوئی شریک اسے تقسیم کرنا چاہتا ہے تو یہ تقسیم بھی جائز ہوگی کیونکہ تقسیم علیحدگی کے معنی کو متحقق کرتی ہے۔

پھر اگر اس شریک نے مشترکہ عقار میں اپنا حصہ وقف کیا تو وہ خود ہی اپنے شریک سے تقسیم کا مجاز ہوگا کیونکہ یہ تمیز اور افراز (علیحدہ کرنا) ہے۔ تملیک اور مبادلہ نہیں ہے لہذا تقسیم کا عمل اپنے شریک کے ساتھ کرے گا اور اس کی موت کے بعد اس کا وصی متولی ہے۔

اگر اس نے اپنی خالص عقار سے نصف حصہ وقف کیا تو قاضی اسے تقسیم کرے گا یا یہ کہ باقی حصہ کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرے پھر خریدار اس کے ساتھ تقسیم کرے، پھر مشتری اپنا خریدا ہوا حصہ از خود خریدے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ ایک ہی شخص مقاسم اور مقتسم نہیں ہو سکتا۔

اگر تقسیم میں کسی حصہ کے اندر کچھ درہم لگانے کی ضرورت پیش آئے تو اگر واقف کو یہ درہم دیئے گئے تو جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وقف فروخت کرنا ممنوع ہے اور اگر وقف کرنے والے نے یہ درہم دیئے ہیں تو جائز ہیں اور بقدر درہم وقف میں اس واقف کا خریدنا قرار دیا جائے گا۔

وقف کی اصلاح و درستگی

امر واجب یہ ہے کہ حاصلات وقف میں سے اس وقف کی تعمیر میں خرچ کیا جائے خواہ واقف نے وقف کی تعمیر کو مشروط کیا ہو یا نہ کیا ہو کیونکہ واقف کا مقصد یہ ہے کہ ہمیشہ اس وقف کی حاصلات (منافع) اس کے مستحقین تک پہنچتی رہیں اور ہمیشہ اس وقف کی بقا ممکن نہیں ہے الا یہ کہ اس وقف کی تعمیر مرمت کی جائے چنانچہ تعمیر کی شرط اس اقتضے سے ثابت ہے۔ پس اگر کسی نے اپنا گھر اپنی اولاد کی رہائش پر وقف کیا تو اس کی تعمیر و مرمت اس شخص پر ہوگی جس کی رہائش

---

[1] [صحیح مسلم ج ۲، ۱۶۷]

ہوگی کیونکہ (حدیث میں وارد ہے کہ) خراج تاوان کے ساتھ ہے۔

اگر اس (جس پر وقف ہوا) نے وقف کی تعمیر ومرمت سے انکار کر دیا یا وہ (جس پر وقف ہوا) فقیر ہے تو حاکم اس (وقف شدہ مکان) کا کرایہ ادا کرے اور اس کرایہ سے اس کی مرمت کرے اور جب اس مکان کی تعمیر ہو جائے تو اسے لوٹا دے جس کے لیے رہائش محقق ہے کیونکہ ایسا کرنے میں وقف کرنے والے اور رہائش پذیر دونوں کے حق کی رعایت ہے۔

اور اس موقوف علیہ پر تعمیر کی زبردستی نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ اس میں اس کا مال تلف کرنا لازم آتا ہے چنانچہ اس کا انکار بوجہ بطلان حق کے رضامندی نہیں ہے اور رہائش پذیر کا کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ وہ (رہائشی) مالک نہیں ہے۔

اگر وقف منہدم ہو جائے یا اس کے اسباب وآلات ٹوٹ پھوٹ جائیں تو اس صورت میں حاکم کو چاہیے کہ وہ اشیائے وقف میں تصرف کرتے ہوئے "وقف" کی تعمیر ومرمت پر خرچ کرے تاکہ قیام وقف اور مقصود وقف کے دوام سے وقف کا مقصود باطل نہ ہو، اگر وقف تعمیر و مرمت سے بے نیاز ہو تو بوقت ضرورت کام آنے کے لیے اشیائے وقف کو محفوظ کرلے اور وقف کی ناقص اشیاء مستحقین وقف میں تقسیم کرنے کا شرعاً جواز نہیں ہے اور نہ ہی عین وقف کو مستحقین کی ملکیت میں دینا جائز ہے کیونکہ وقف کے مستحق افراد صرف اس وقت کے منافع میں استحقاق کا جواز رکھتے ہیں اور بعینہ چیز کا اصل مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اگر وقف کرنے والے نے حاصلات وقف (کرایہ، نفع) کو اپنے لیے رکھا یا وقف کی سرپرستی اپنے لیے رکھی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے صدقہ سے کھاتے تھے اور اس صدقہ سے مراد وقف ہے۔ امام محمدؒ عدم جواز کے قائل ہیں کیونکہ ان کے نزدیک قبضہ بھی وقف کی ایک شرط ہے، پس جب اس نے اپنے لیے شرط لگائی تو قبضہ نہ پایا گیا اور یہ اس کی طرح ہو گیا جو زمین کے ایک ٹکڑے کو اپنے لیے مشروط کرے۔ فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے تاکہ وقف میں لوگوں کو ترغیب پیدا ہو۔ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اس کی دلیل ہے جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ﴿المسلمون علی شروطهم﴾: "یعنی مسلمان اپنی شرائط پر ہے۔"[1]

اگر وقف کرنے والا کسی کے لیے بھی ولایت (سرپرستی) کی شرط نہ لگائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سرپرستی اسے حاصل ہوگی، پھر اگر اس کا ولی ہو تو اس کی ہوگی، بصورت

---

1. سنن البیہقی ۶/۱۶۶

دیگر قاضی کو حاصل ہوگی۔

نیز ہشام بن عمرو کی روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے مکانات کو صدقہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کی مطلقہ بیٹی کے لیے اس میں سکونت اختیار کرنے کا اختیار ہوگا کہ نہ تو وہ کسی کو نقصان پہنچائے گی اور نہ ہی کوئی اسے نقصان پہنچائے گا اور اگر خاوند کی وجہ سے بے نیاز ہوگئی تو اس کے لیے کچھ نہ ہوگا۔[1]

اگر وقف کرنے والے نے شرط رکھی کہ وہ جب چاہے گا اسے زمین کے بدلہ دوسری زمین تبدیل کرے گا تو امام ابویوسفؒ کے نزدیک (استحساناً) جائز ہے اور امام محمدؒ کے ہاں وقف جائز اور شرط باطل ہے اگر واقف نے اس کی ولایت اپنے لیے مشروط کی حالانکہ یہ واقف غیر مامون ہے تو بلحاظ فقراء قاضی اس کے قبضہ سے نکال سکتا ہے۔

مسجد کے وقف کا حکم

اگر کسی نے مسجد بنائی تو اس کی ملکیت زائل نہ ہوگی یہاں تک کہ اسے اپنی ملکیت سے راستہ سمیت علیحدہ کر دے اور لوگوں کو اس مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے، پس جب اس مسجد میں ایک شخص نے نماز ادا کرلی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو مسجد کی وہ جگہ اس کی ملکیت سے زائل ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ''سپرد کرنا'' ضروری ہے اور بصورت مسجد سپردگی کی شرط یہی ہے کہ اس مسجد میں نماز ادا کی جائے یا بایں وجہ کہ جب یہاں قبضہ کرنا دشوار ہے تو حصول مقصود کو قبضہ کا قائم مقام کیا گیا ہے۔ امام صاحب سے ایک روایت میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ذکر بھی ہے۔ امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں اس واقف کا قول جب یہ متحقق ہے کہ وہ کہے کہ میں نے اسے مسجد بنا دیا ہے تو اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی کیونکہ ان کے نزدیک سپرد کرنا شرط نہیں ہے۔

اگر کسی نے اپنے باغ کے درمیان میں مسجد بنائی اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت دی لیکن اسے اپنے گھر سے الگ نہیں کیا تو وہ اس کی ملکیت میں رہے گی، اسے اختیار ہوگا کہ اسے بیچ دے اور مرنے کے بعد اس سے وہ جگہ میراث ہوگی کیونکہ وہ اس کی ملکیت میں داخل ہے اور اس کو محیط ہے۔ نیز اسے روکنے کا حق ہوگا نیز اس لیے کہ اس نے اسے خالصاً اللہ تعالیٰ کے لیے وقف نہیں کیا کیونکہ اس نے اپنے لیے راستہ کو باقی رکھا، مسجد کے لیے کوئی علیحدہ

---

[1] ایضاً

راستہ نہیں رکھا البتہ اگر وہ لوگوں کے لیے اس کو کھول دے اور اس کا راستہ الگ کر دے اور اسے جدا کر دے تو وہ خالص مسجد ہو جائے گا۔ اگر گھر کی چھت پر مسجد بنائی اور نیچے والی منزل کو رہائش گاہ بنایا تو طرفین کے نزدیک وہ میراث ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وہ مسجد ہوگی اور اگر نیچے والی منزل کو مسجد اور اوپر والی منزل کو رہائش گاہ بنایا اور اس کا راستہ الگ کر دیا تو اجماعاً جائز ہے، اس لیے کہ مسجد وہ ہوتی ہے جو ہمیشہ کے طور پر ہو اور یہ امر نیچے کی جگہ میں متحقق ہوتا ہے اوپر والی جگہ میں متحقق نہیں ہوتا۔

امام محمدؒ سے مروی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ مسجد ایک قابل تعظیم جگہ ہے، پس جب اس کے اوپر رہائش ہوگی تو اس کی تعظیم نہ ہوگی، ہاں البتہ ضرورت (مجبوری) کے وقت جائز ہے۔

اگر مسجد کے اردگرد کی جگہ ویران ہو جائے اور اس کے پاس کوئی نہ رہے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ قیامت کے دن تک ہمیشہ کیلئے مسجد ہی رہے گی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ بانی کی ملکیت اس میں عود کر آئے گی یا اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف منتقل ہو جائے گی، اس لیے کہ اس نے قربت کے لیے خاص کیا تھا اور وہ قربت اب ختم ہو چکی ہے۔

اگر مسجد کے فرش (چٹائی وغیرہ) کی ضرورت نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اسے دوسری مسجد میں منتقل کر دیا جائے، بعض علماء کہتے ہیں کہ اسے فروخت کر کے مسجد کے کاموں میں صرف کیا جائے گا اور مسجد کا ٹوٹا ہوا سامان کنوئیں کی تعمیر میں لگانا جائز ہے، اس لیے کہ وہ مسجد کی جنس میں سے نہیں ہے، اسی طرح کنوئیں کا ٹوٹا ہوا سامان مسجد میں نہ لگایا جائے بلکہ کسی دوسرے کنوئیں میں لگایا جائے گا۔

جس نے پانی کی سبیل یہ کوئی عمارت یا رباط وقف کی یا اپنی زمین کو قبرستان بنایا اور یہ شرط رکھی کہ وہ اس سبیل سے پانی پیے گا یا اس عمارت میں رہے گا یا اس قبرستان میں دفن ہوگا تو جائز اور اس سے اس کی ملکیت زائل نہ ہوگی، یہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے الا یہ کہ حاکم اس کا حکم کرے کیونکہ اس کا مقصود قربت ہے اور اپنی ذات پر صرف کرنا بھی قربت ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جو شخص حلال مال کمائے، پھر اپنی ذات کو کھلائے اور پہنائے تو یہ اس کے لیے زکوٰۃ ہے۔[1]

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس کی ملکیت محض کہنے سے ہی زائل ہو جائے گی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب لوگ اس سے پئیں گے اور رباط اور عمارت میں سکونت اختیار کریں گے

---

[1] المستدرک ۴/۱۳۰

اور زمین میں اپنے مردے دفن کریں گے تو اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ بندے کا حق اس سے منقطع نہیں ہوتا، اس کو انتفاع کا حق حاصل ہوگا۔ چنانچہ وہ اس عمارت میں سکونت اختیار کرے گا اور رباط میں ٹھہرے گا اور پانی پی سکتا ہے اور اس قبرستان مدفون ہو سکتا ہے، پس حکم حاکم یا موت کے بعد اضافت کی شرط ہوگی جیسا کہ فقراء پر وقف کرنے کی صورت میں حکم ہے لیکن مسجد کا حکم اس کے خلاف ہے کیونکہ مسجد میں اس کا حق انتفاع باقی نہیں رہا، پس وہ حکم حاکم کے بغیر ہی خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے گی۔

امام ابو یوسفؒ کا مذہب یہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ قبضہ لازمی شرط نہیں ہے۔

امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک سپرد کرنا شرط ہے اور اس کے لیے ایک شخص ہی کافی ہے کیونکہ تمام جنس کا فعل دشوار ہے نیز اس لیے بھی کہ جب وہ قبرستان میں دفنائیں گے تو یہ قبضہ کی صورت ہو جائے گی تو اس مسجد کی طرح ہو گیا جس مسجد میں نماز ادا کی گئی ہو اگر اس میں کوئی دفن نہ کیا گیا ہو تو اس سے قبضہ کا معنی حاصل نہ ہوگا چنانچہ وہ مالک کے قبضہ میں رہے گا اور اسے رجوع کا حق حاصل ہوگا۔

اور اس قبرستان میں دفن ہونے کے لحاظ سے مالدار اور فقیر سب شریک ہوں گے، اسی طرح اس مسجد میں نماز ادا کرنے اور سبیل اور کنوئیں وغیرہ سے پانی پینے کے اعتبار سے سب شریک ہوں گے کیونکہ یہ چیز اباحت کے درجہ میں آتی ہے اور مباح چیز میں مالدار اور فقیر سب برابر ہیں۔ صدقہ کی آمدنی کا حکم اس کے برخلاف ہے، اس لیے کہ اس کا مقتضی تملیک ہے، پس وہ مال دار کے لیے جائز نہ ہوگی۔

وقف کو کرایہ پر دینا

وقف کرنے والے کی طے کردہ مدت سے زیادہ وقف شدہ چیز کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے کیونکہ واقف کی شرط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے نیز اس لیے کہ اس نے متعین شرط کے ساتھ اسے اپنی ملکیت سے خارج کیا ہے، اگر کوئی مدت شرط نہ کی ہو تو متقدمین حنفیہ کہتے ہیں کہ جتنی مدت چاہے اسے کرایہ پر دے جائز ہے۔ متاخرین حنفیہ کہتے ہیں کہ ایک سال سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے تاکہ طویل مدت کی وجہ سے وہ اسے اپنی ملک نہ بنالے کہ پھر وقف ہونے کی علامت (نشان) ختم ہوتی جائے گی اور ملکیت کی علامت نمایاں ہونے لگے گی کیونکہ ظلم کرنے والوں کی کثرت ہے اور ان کا غلبہ بھی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کھیتوں میں تو تین سال کے لیے

وقف کا اجارہ جائز ہے اور گھروں وغیرہ میں ایک سال کے لیے جائز ہے۔

وقف کو اجرت مثل کے ساتھ ہی اجارہ میں دینا جائز ہے تاکہ فقراء سے ضرر کا دفعیہ ہو، اگر اس نے وقف شدہ چیز کو اجرت مثل پر تین سال کے لیے اجارہ پر دیا، پھر رغبت بڑھنے کی وجہ سے مدت میں اضافہ ہو گیا تو اجارہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ عقد کے دن اجر مثل کا اعتبار کیا گیا ہے۔

موقوف علیہ کے لیے وقف کو اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ واقف کی طرف سے اس کا سرپرست یا قاضی کا نائب ہو، پس جب قاضی یا اس کا نائب یا سرپرست اسے اجارہ پر دے تو اس کی موت سے اجارہ فسخ نہ ہوگا کیونکہ وہ موقوف علیہ کی طرف سے وکیل کی طرح ہے اور معاملات وکیل کی موت سے فسخ نہیں ہوا کرتے۔

اگر موقوف علیہ نے اس میں سکونت اختیار کی تو اگر واقف نے اس کی رہائش کو مشروط کیا تھا تو اس کے لیے یہ جائز ہے اور اگر اس کے نفع کو مشروط کیا تو اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ احتیاط یہی ہے کہ نگران دوسرے کو اجرت پر دے کہ اجرت اس کو دے دے۔ وقف کو عاریۃً دینا یا کسی کو سکونت کے لیے دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں فقراء کے حق کا ابطال ہے۔

اگر مرض الموت میں وقف کیا ہے تو امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ مرنے کے بعد وصیت کے حکم میں ہوگا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو لازم نہ ہوگا اور ان کے نزدیک عدم لزوم ہی صحیح ہے، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ لازم ہوگا مگر ثلث مال میں سے معتبر ہوگا اور حالت صحت میں وقف کرنا تمام مال سے معتبر ہوگا۔

﴿کتاب احیاء الموات﴾

''احیاء'' کا لغوی معنی ہوتا ہے کسی چیز کو زندہ کرنا یعنی حساس یا نامی قوت والا کرنا، اور ''موات'' اس زمین کو کہتے ہیں جو سیم وتھور یا کسی اور وجہ سے قابل انتفاع نہ ہو اور اس کا کوئی مالک نہ ہو اور وہ شہر سے باہر ہو، شہر کے مصالح کا اس سے تعلق نہ ہو اور بستی سے اتنی دور ہو کہ اگر کوئی آدمی آخر آبادی سے کھڑا ہو کر چلائے تو اس زمین میں آواز نہ سنی جائے۔

ہمارے دور میں ہر وہ زمین جس پر حکومت کا قبضہ ہو وہ حکومت کی املاک میں شمار ہوگی اور جس زمین پر حکومت کا قبضہ نہ ہو وہ ارض موات کے حکم میں ہے۔

احیاء موات کی شرعی تعریف یہ ہے کہ غیر آباد زمین کو زراعت وکاشتکاری یا تعمیر یا شجرکاری وغیرہ سے باصلاحیت اور کارآمد بنانا لہٰذا جس زمین کا کوئی مالک نہ ہو یا وہ اسلام میں مقبوض ہو اور اس کا کوئی خاص مالک معلوم نہ ہو اور وہ بستی سے اتنی دور ہو کہ کوئی بلند آواز آدمی کھڑا ہو کر چلائے تو اس کی آواز اس میں سنی نہ جائے تو وہ امام ابو یوسف کے نزدیک ارض موات میں داخل ہے۔ اور امام محمدؒ کے نزدیک اگر وہ زمین اسلام میں مقبوض ومملوک ہو تو وہ موات میں شامل نہ ہوگی اور مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی۔ جو زمین کسی مسلمان یا ذمی کی مملوکہ نہ ہو اس میں امام محمدؒ نے عدم استفادہ کا اعتبار کیا ہے، پس وہ شہر کے مصالح میں سے نہ ہو اور شہر سے باہر ہو، خواہ اس کے قریب ہو یا دور۔

امام ابو یوسفؒ نے دور ہونے کی شرط لگائی ہے کیونکہ ظاہر بات یہی ہے کہ جو زمین شہر یا بستی کے قریب ہوگی اس کے اہلیان کا نفع اس سے منقطع نہ ہوگا۔ امام محمدؒ نے بستی والوں کا اس زمین سے حقیقۃً انقطاع نفع کو معتبر مانا ہے۔ مختار قول امام ابو یوسفؒ کا ہے۔

آج کل ارض موات حکومت کی املاک میں سے شمار ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء موات اور اس کی تملیک میں حاکم کی اجازت کو شرط قرار دیا ہے لہٰذا جو شخص بحکم حاکم ارض موات کو آباد کرے گا وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور اگر حاکم کی اجازت کے بغیر آباد کرے گا تو مالک نہ ہوگا، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی۔

جیسا کہ جنادہ بن ابی امیہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم لوگ دابق مقام

میں عسکری حالت میں موجود تھے کہ حبیب بن مسلمہ سے کسی نے یہ ذکر کیا کہ بند قبرصی سمندر سے سامان تجارت لے کر ارمینیہ کے راستہ پر جا رہا ہے۔ حبیب بن مسلمہ اس کے پیچھے نکلے، اس سے لڑائی ہوئی اور بالآخر اسے قتل کر کے اس کا سامان پانچ خچروں پر لاد کر لے آئے جس میں دیباج، یاقوت اور زمرد وغیرہ بھی تھے۔ حبیب نے چاہا کہ سارا اسباب خود ہی لے لے لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ سارا نہیں بلکہ تھوڑا سا لے لو، حبیب نے ابوعبیدہ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

﴿من قتل قتیلا فله سلبه﴾: ''یعنی جو شخص کسی کو قتل کرے تو مقتول کا سازوسامان اسی کا ہوگا۔''

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے ایسا نہیں فرمایا: معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جب ان کی بات کو سنا تو وہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اس وقت حبیب ان سے لڑ رہے تھے، معاذ رضی اللہ عنہ نے حبیب سے کہا کہ خدا کا خوف کرو، تمہارے امام جتنے حصہ پر خوش ہیں، اتنا حصہ تم لے لو، تمہارے لیے بس اتنا ہی ہے جتنے پر تمہارے امام دل سے خوش ہیں، پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی سنائی، چنانچہ پھر سب کا اس پر اتفاق رائے ہوگیا اور حبیب کو خمس کا بعض حصہ دیا جسے انہوں نے ایک ہزار دینار کے عوض فروخت کیا۔[1]

جب حاکم احیاء موات کے بعد اس زمین کا اسے مالک بنا دے تو وہ زمین اس کی ملک ہو جائے گی۔

بہتر یہ ہے کہ امام وقت اس کے احیاء (آبادکاری) کے بعد وہ زمین اس کو دے دے اور اس سے واپس نہ لے جبکہ وہ نادانی کی وجہ سے اجازت نہ لے لیکن اگر اس نے حاکم کو کم حیثیت جانتے ہوئے اس سے اجازت نہیں لی تو حاکم کو زمین واپس لینے کا حق ہوگا۔

مسلمان اور ذمی اس سلسلہ میں برابر ہیں کیونکہ احیاء ملک کا سبب ہے اور مسلمان پر ایسی زمین میں عشر اور ذمی پر خراج واجب ہوگا۔ پس ہر ایک پر اس کے لائق و مناسب امر لازم ہوگا اور احیاء یہ ہے کہ اس زمین میں کوئی عمارت بنا لے یا کاشتکاری کر لے یا اس زمین کا بند بنا لے تاکہ سیلاب کا پانی روک سکے اور اس عمارت یا کھیت وغیرہ کی جگہ اس کے لیے ہوگی، دوسرے کی نہ ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر نصف سے زیادہ زمین کو آباد کر لیا تو یہ ساری زمین کا احیاء شمار ہوگا اور اگر نصف زمین کو آباد کیا ہو تو جو حصہ آباد کیا ہو بس وہی اس کا

---

[1] [نصب الرایہ ۳/۴۳۱]

ہوگا، باقی غیر آباد حصہ اس کا نہ ہوگا۔ ابن سماعہ نے امام ابوحنیفہؒ سے نقل کرتے ہوئے یہ ذکر کیا ہے کہ اگر اس نے اس میں کنواں کھودا یا اس میں پانی پہنچایا تو اس نے اس کو آباد کر دیا، زراعت کرے یا نہ کرے۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ حاکم کی اجازت (حکم) کے بغیر ہی اس کا مالک ہو جائے گا۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں وہ حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا

﴿من اعمر ارضاً ليست لاحد فهو احق بها﴾: ''جو شخص ایسی زمین کو آباد کرے جو کسی کی ملک نہ ہو تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔''[1]

پتھر وغیرہ سے علامت لگانا

جس نے تین سال تک زمین پر پتھر وغیرہ سے علامت (نشان) لگائی لیکن اس میں کاشتکاری نہیں کی یا اس میں کوئی تعمیر نہ کی یا اس عرصہ کے دوران کوئی کنواں نہ کھودا تو حاکم کسی اور کو وہ زمین دے دے۔ کیونکہ اتنے عرصہ کے بعد اس کا زمین کے بارے میں غفلت اور لاپرواہی ثابت ہو چکی ہے حالانکہ دارالاسلام کا مقصود اس کی اراضی کی آبادی کو ظاہر کرتا ہے تاکہ مسلمانوں کی منفعت حاصل ہو یعنی عشر اور خراج حاصل ہو۔ نیز اس لیے کہ محض پتھر وغیرہ سے علامت لگانا اس کا احیاء نہیں ہے کیونکہ یہ صرف دوسرے کو زمین سے روکنا اور حدود متعین کرنے کے لیے پتھر رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی اس میں شریک نہ ہو۔

زمین کے اردگرد خشک ٹہنیاں لگانا یا اس کا گھاس وغیرہ اکھاڑنا تحجیر ارض میں شامل ہے اور تین سال کی تحدید حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ چنانچہ ایک ضعیف اثر میں جسے ابو یوسفؒ نے اپنی سند سے حضرت سعید بن المسیبؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو بے آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کی ہے اور پتھر لگانے والے کا تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔''

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قبیلہ جہینہ یا مزینہ کے چند لوگوں کو ایک زمین جائیداد کے طور پر دی تو ان لوگوں نے اس زمین کو بے کار چھوڑے رکھا، پھر دوسرے لوگوں نے اس زمین کو لے کر آباد کیا، پھر اس زمین کے بارے میں

---

[1] صحیح البخاری (۲۳۳۵)

پہلے لوگوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاں مقدمہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ قطعہ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیا ہوتا تو میں اس کو نہ لوٹاتا لیکن یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اور فرمایا کہ جس کی زمین ہو اور وہ تین سال تک اسے معطل چھوڑے رکھے، اسے آباد نہ کرے اور اسے کوئی دوسرا آباد کردے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔[1]

تین سال کی تحدید اس وجہ سے بھی ہے کہ عام طور پر سال میں ایک بار اراضی کو کاشت کیا جاتا ہے اور اتنے عرصہ میں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اسے اس میں دلچسپی بھی ہی ہے یا نہیں اگر اس نے زمین کو بے کار چھوڑے رکھا اور تین سال کے عرصہ تک اس میں کاشتکاری نہیں کی تو اس سے پتہ چلا کہ وہ اس زمین کو تلف کرنا اور بے آباد رکھنا چاہتا ہے اس لیے حاکم پر واجب ہے کہ اس زمین سے اس کا قبضہ واگزار کرائے اور یہ سب کچھ ازروئے دیانت کے ہے لیکن اگر مدت معینہ گزرنے سے پہلے دوسرا اس کو آباد کردے تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔

کنوئیں کا حریم

جس نے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بحکم حاکم اور صاحبینؒ کے نزدیک بغیر حکم حاکم ارض موات میں کنواں کھودا تو اس کا حریم ہر جانب سے چالیس ذراع ہوگا، اس لئے کہ کنوئیں کا کھودنا اس کا احیاء ہے۔ نیز کنوئیں کا حریم گھر کے صحن کی طرح ہے اور گھر کا مالک اپنے گھر کے صحن کا زیادہ حق دار ہوتا ہے اسی طرح کنوئیں کا حریم بھی ہے اور اس میں اونٹ اور بکریاں برابر ہیں، یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے۔

پس جو شخص اس کے حریم میں کھدائی کرنا چاہے گا اسے اس کام سے روکا جائے گا، اس لیے کہ پانی کے جانے سے اس کا حق مختل ہوگا نیز اس لیے کہ وہ حریم کا اس لیے مالک ہوا ہے کہ اس کے لیے اس سے انتفاع ممکن ہو جبکہ اس کے حریم میں دوسرا کنواں کھودنا انتفاع حق سے مانع ہوگا۔ ہاں اگر دوسرا شخص پہلے کنوئیں کے حریم سے باہر کنواں کھودے اور پہلے کنوئیں کا پانی اس طرف چلا جائے تو اس پر کچھ لازم نہ ہوگا کیونکہ وہ کھودنے میں تعدی کرنے والا نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کنوئیں کا حریم ہر جانب سے چالیس ذراع ہے، جب وہ کنواں اونٹوں، بکریوں اور مسافروں کو پانی پلانے کے لیے ہو۔“[2]

---

[1] نصب الرایۃ ۲۹۰/۴ [2] سنن البیہقی ۱۵۵/۶

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ کنواں کھیت سینچنے کیلئے ہو تو اس کا حریم ساٹھ گز ہے اور امام صاحبؒ کے نزدیک چالیس گز ہے (جیسا کہ پہلے گزرا) اور چشمہ کا حریم ہر جانب سے پانچ سو گز ہے اس لیے کہ چشمہ کا پانی کھیت کی سیرابی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پس ایسی جگہ کا ہونا ضروری ہے جس میں پانی چلتا ہو اور ایسا حوض جس میں پانی جمع ہوتا ہو اور ایسی نہر جس کا پانی کھیت تک پہنچتا ہو، اس لیے اس کی مقدار بڑھا دی گئی اور پانچ سو گز کی تحدید ہر طرف سے شمار ہوگی۔ اس کی دلیل ایک حدیث غریب ہے جیسا کہ امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں ذکر کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا چشمہ کا حریم پانچ سو گز اور بیر عطن کا حریم چالیس گز اور بیر ناضح کا حریم ساٹھ گز ہے۔

درخت کا حریم

جب درخت ارض موات میں لگائے گئے ہوں تو ان کا بھی ایک حریم ہے یہاں تک کہ پھر دوسرے کو اس کے حریم میں شجر کاری کرنا ممنوع ہوگا کیونکہ اسے ایسے حریم کی ضرورت ہوگی جس میں وہ پھل کو رکھ سکے اور وہ حریم ہر جانب سے پانچ گز مقرر کیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: دو آدمی حریم نخلہ کے بارے میں بارگاہ رسالت میں اپنا مقدمہ لے کر آئے تو ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس کی پیمائش کا حکم دیا تو سات گز نکلی، دوسری حدث میں ہے کہ پیمائش کی گئی تو پانچ گز نکلی اور اسی کا فیصلہ کیا گیا۔[1]

جو دریا زمین چھوڑ دے اور اس سے پانی ہٹ جائے تو اگر پانی پھر آسکتا ہو تو اس زمین کو چلتی کرنا جائز نہیں ہے اور اگر پانی دوبارہ نہ آسکتا ہو تو وہ ارض موات کے حکم ہے کہ اگر وہ کسی کا حریم نہ ہو تو جو اس کو چلتی کرے وہ اس کا حاکم کی اجازت (امام صاحب کے نزدیک) سے مالک ہو جائے گا اور اگر وہ کسی کا حریم ہو تو وہ اسی کے تابع ہوگی کیونکہ وہ اسی کے مرافق میں سے ہے۔

زمین کی آب پاشی

شرکاء کے درمیان پانی کی تقسیم جائز ہے، بعثت نبوی ﷺ سے قبل لوگ ایسا کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے عمل کو برقرار رکھا اور آج تک بغیر کسی ممانعت کے

[1] سنن ابی داؤد ۳/۳۱۴

لوگوں کا تعامل جاری ہے، پانی کی یہ تقسیم باعتبار حق کے ہے نہ کہ باعتبار ملک کے، نہر کا پانی کسی کا مملوک نہیں ہے۔ تقسیم کبھی تو باعتبار ملک کے ہوتی ہے اور کبھی باعتبار حق کے ہوتی ہے۔

حق شرب کا دعویٰ بغیر زمین کے بھی استحساناً جائز ہے بایں طور کہ وہ زمین اور حق شرب کو خرید لے، پھر حق شرب کے سوا زمین کو فروخت کردے یا اس کا وارث ہو جائے کیونکہ کبھی وراثت سے ایسی چیز ملکیت میں آجاتی ہے جو بیع سے نہیں آتی جیسے قصاص، پس اگر قصاص کا حق اس کے باپ کا ہو اور وہ مر جائے اور وہ اپنے باپ کے قاتل سے قصاص نہ لے سکے تو مقتول کا پوتا اس حق کا وارث ہوگا اور اس کا مطالبہ کر سکتا ہے، اسی طرح شراب بھی مالی حق ہے اس میں وراثت جاری ہوگی۔

اگر نہر پر موجود ایک زمین کا دعویٰ کیا جس زمین کا شرب اس نہر سے متعلق ہو اور لوگ اس کے لیے زمین کی گواہی دیں تو زمین کا اور اس کے حصہ شرب کا فیصلہ کر دیا جائے گا اس لیے کہ زمین کا شرب سے تعلق رہتا ہے اور اگر صرف شرب کا دعویٰ کرے اور لوگ اس پر گواہی دیں تو زمین کے کسی حصہ کا بھی اس کے لیے فیصلہ نہ کیا جائے گا۔

حق شرب نہ فروخت کیا جائے گا، نہ اسے ہبہ کیا جائے گا اور نہ ہی اسے صدقہ کیا جائے گا کیونکہ جہالت عام ہے اور قبضہ کا تصور نہیں ہے اور حق شرب میں مہر بننے کی صلاحیت نہیں ہے اگرچہ عقد میں اس کا ذکر کر دیا جائے، اس صورت میں مہر مثل ہی واجب ہوگا اور حق شرب بدل خلع بھی نہیں بن سکتا۔ پس اگر بیوی اپنے شوہر کو (وہ اس سے علیحدگی چاہتی ہو) حق شرب دے تو اس کا اسے بدل خلع کا نام دینا لغو ہوگا اور اس بیوی پر لازم ہے کہ مہر کا جو حصہ وصول کیا ہے اسے واپس کر دے۔

پانی کی اقسام اور اس سے انتفاع کا حق

پانی کی چند اقسام ہیں: (۱) دریا کا پانی، یہ عام ہے، تمام مخلوق کو اس سے انتفاع کا حق حاصل ہے، خواہ پینے کے لیے پانی اس سے لیں یا زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے لیں، کسی کو اس سے منع نہ کیا جائے گا۔ جیسے ہوا اور سورج کی روشنی سے سب کو انتفاع کا حق ہوتا ہے۔

(۲) وادیوں اور بڑی بڑی نہروں کا پانی، تمام لوگ اپنی زمینوں کو سیراب کرنے اور پینے کے اعتبار سے اس میں شریک ہیں جبکہ سیراب کرنے سے عامۃ الناس کو نقصان نہ ہوتا ہو۔ بایں صورت کہ کسی بنجر زمین کو آباد کرے اور اس کی سیرابی کے لیے اس نہر کو کھودے جو کسی کی

ملک میں نہ ہو کیونکہ وہ اصل میں مباح ہے اور اگر عامۃ الناس کو اس سے نقصان ہوتا ہو تو پھر اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ لوگوں سے ضرر کا ہٹانا واجب ہے جیسے دریا کا کنارہ ٹوٹ جائے اور پانی اس کی جانب آجائے اور اس کی ایک جانب غرق ہو جائے۔

(۳) نہر خاص کا پانی: یعنی ایسی نہر کا پانی جو نہر کسی بستی کے لیے خاص ہو، پھر دوسروں کی اس میں پینے میں شرکت ہے اور اہل بستی کے لیے اس سے پانی لینا اپنے استعمال کیلئے جائز ہوگا، دوسروں کے لیے جائز نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا کہ ایک آدمی کا پانی ہے جو اس کے کھیتوں کے لئے چلتا ہے اور ایک آدمی آکر اس پانی سے اپنے اونٹوں اور چوپایوں کو پانی پلاتا ہے یہاں تک کہ ان کو سارا پانی پلا دیتا ہے تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ امام صاحبؒ نے اپنے شاگرد امام زفرؒ سے اس سوال کا حل معلوم کیا تو امام زفرؒ نے لکھا کہ اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان کی تغلیط کرتے ہوئے فرمایا کہ اونٹ والوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

﴿المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الکلاء، والماء، والنار﴾: ''یعنی مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں ایک گھاس، دوسرا پانی اور تیسرا آگ۔''[1]

یہ حدیث پانی پینے اور حق شرب دونوں کو شامل ہے کنوئیں اور حوض کا حکم اسی نہر خاص کی طرح ہے۔

(۴) گھڑے وغیرہ میں محفوظ کیا ہوا پانی، ایسے پانی کا لینا مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ مالک کو اس پانی کا بیچنا بھی جائز ہے، اس لیے کہ وہ احراز (محفوظ کرنا) کی وجہ سے اس کا مالک ہے اور یہ شکار کی مانند ہوگیا مگر اتنا فرق ہے کہ اس کی چوری سے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ حدیث کی وجہ سے اس میں شرکت کا شبہ پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی کنواں، دریا، چشمہ کسی آدمی کی ملک میں ہو تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے کو اس کی ملک میں داخل ہو کر پانی پینے سے روکے جبکہ دوسرا شخص قریب میں مباح زمین کو پاتا ہو، اگر قریب میں کوئی زمین نہ ہو تو دو صورتیں ہیں یا تو اسے اپنی زمین میں داخل ہو کر پانی خود ہی پینے دے بشرطیکہ وہ اس کا کنارہ توڑے گا نہیں اور یا پھر خود اس کو پانی نکال کر دے دے اگر ایسی صورت میں اس کو روکے حالانکہ وہ یا اس کی سواری پیاس کی وجہ سے جان کے جانے کے خطرے میں ہے اور سواری ایسی ہو جسے پانی کی احتیاج ہوتی ہے تو اس کے ساتھ لڑے۔ اس کی

---

[1] سنن ابی داؤد ۳/۲۷۸

دلیل یہ روایت ہے کہ چند لوگ پانی والی جگہ پر آئے اور انہوں نے وہاں کے لوگوں سے کنوئیں کی جگہ معلوم کی تو انہوں نے بتانے سے انکار کیا، پھر ان سے ڈول مانگا تو انہوں نے ڈول بھی نہیں دیا، پھر انہوں نے کہا کہ دیکھو! ہماری اور ہماری سواریوں کی گردنیں ٹوٹنے کو ہیں، انہوں نے پھر بھی نہ مانا اور ڈول تک نہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب (واپس آکر) اس کا ذکر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے ان پر اسلحہ کیوں نہ اٹھالیا؟ نیز اس وجہ سے بھی کہ یہ مضطر کو اس کا حق نہ دینا ہے حالانکہ مضطر کا حق پانی کے پینے میں ثابت ہے۔ پس اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ہتھیار کے ساتھ مقابلہ کرے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہ فرمائیں گے ان میں سے ایک وہ آدمی ہے جس نے مسافر کو اپنے پاس بچا ہوا پانی نہ دیا۔'' الحدیث[1]

بہیسہ نامی عورت اپنے والد سے نقل کرتی ہیں کہ میرے والد نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت لی، پھر آپ کے جسم مبارک کو چومنے لگے اور اس کے ساتھ چمٹ گئے، پھر عرض کی کہ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون سی چیز ہے جس کا روکنا حلال نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانی'' الحدیث۔[2]

اور ایسا پانی جسے کسی برتن میں جمع کر کے محفوظ کیا گیا ہو، اس کے نہ دینے پر بغیر ہتھیار کے اس کے ساتھ لڑے کیونکہ وہ احراز کے ساتھ اس کا مالک ہو۔ اسی لیے دوسرے کو ضامن بھی بنا سکتا ہے لیکن وہ اس بات پر مامور ہے کہ دوسرے کو بقدر حاجت پانی دے پس نہ دینے سے اس نے حکم کی مخالفت کی، اس بنا پر وہ اس کو ادب سکھائے گا، بھوک کی صورت میں کھانے کا حکم بھی برتن میں محفوظ کردہ پانی کی طرح ہے، پس اگر کھانے کی احتیاج ہو بایں صورت کہ اگر کھانا کھائے تو بظاہر وہ نہیں مرے گا تو جس کے پاس کھانا موجود ہو اس سے مانگ لے، اگر وہ انکار کرے تو اس کے ساتھ لڑ سکتا ہے اور کھانا لے سکتا ہے اور جس قدر کھایا ہو اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

صاحب شرب کو اندر آنے سے اس کو روکنے کا حق نہیں ہے جبکہ وہ اس کی ملک کو نقصان نہ پہنچائے اس لیے کہ موات مشترک تھا اور احیاء حق مشترک کا ہے لہٰذا حق شرب سے منع نہیں کر سکتا ہے، ان سب میں اصل (دلیل) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

﴿الناس شركاء في ثلاث، في الماء، والكلاء، والنار﴾: ''لوگ تین چیزوں

[1] سنن ابی داود ۳/ ۲۷۷ [2] سنن ابی داود ۳/ ۲۷۸

میں شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ۔"

اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا جو پانی اس کی ضرورت سے زائد ہو اس کا فروخت کرنا اس کے لیے جائز ہے؟ تو حضرت ایاس بن عبدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زائد پانی کے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔[1]

آج کے دور میں ڈیموں کی تعمیر کا خرچ خزانہ عامہ کے ذمہ ہے کیونکہ اس کا نفع عوام ہی کا ہے لہٰذا سرکاری دولت کے ذمہ ہوگا اگر خزانہ میں پیسہ نہ ہو تو عامۃ الناس کے حق کے احیاء کے لیے لوگوں کو اس پر مجبور کیا جائے گا تا کہ ان سے ضرر کا دفیعہ ممکن ہو لیکن جن لوگوں کے پاس عملی تجربہ یا قوت و طاقت موجود ہو حاکم انہیں اس پر مجبور کرسکتا ہے اور ان کے اخراجات ان اہل ثروت کے ذمہ ڈالے گا جو کام کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ جو نہریں عامۃ الناس کے زیر استعمال ہوں ان نہروں کی توسیع و تنظیف وغیرہ کا کام ان ہی کے مالکان کے ذمہ ہوگا کیونکہ ان کی منفعت بھی ان ہی کو حاصل ہے اور جو ان میں سے اس سے انکار کرے تو عام ضرر کے دفیعہ کے لیے اسے مجبور کیا جائے گا اور اگر ان نہروں میں عام ضرر ہو بایں طور کہ انہیں نہروں کے بھر جانے کا خطرہ ہو کہ پانی مسلمانوں کے راستے اور ان کی زمینوں کی طرف آجائے گا تو اپنے حصوں کی حفاظت ان ہی کے ذمہ ہوگی اور حاکم کو حق ہوگا کہ جس کو چاہے اس پر مجبور کرے اور عموی کلفت ان نہروں سے مستفید ہونے والوں کے ذمہ لگائے۔

اگر نہر مخصوص جماعت کی زیر ملکیت ہو تو اس نہر کی صفائی، کھدائی اور توسیع ان ہی کے اوپر ہوگی، جو ان میں سے انکار کرے تو ایک قول کے مطابق اسے مجبور کیا جائے گا اور دوسرے قول کے مطابق مجبور نہ کیا جائے گا، اس لیے کہ دو ضرروں میں سے ہر ایک خاص ہے اور اس کا دفیعہ بحکم قاضی صفائی کھدائی وغیرہ سے ممکن ہے، پھر شرکت نہ کرنے والے سے رجوع کرلیا جائے گا۔

جب وہ نہر اس خاص جماعت کی زمین سے متجاوز ہو جائے تو ان لوگوں سے صفائی کا صرفہ ختم کردیا جائے گا۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان سب پر نہر کی کھدائی لازم ہے، نہر کی شروع سے آخر تک اور یہ چیز اپنے حصہ اور زمین کے مطابق ہوگی، اس لیے کہ اوپر والا اپنی زمین کے ماوراء حصہ کی احتیاج رکھتا ہے تا کہ بچا ہوا پانی آگے بہایا جائے اور اس کے باشندے غرق

[1] [سنن ابی داؤد ۳/۲۷۸]

نہ ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ کھدائی اس کی زمین سے متجاوز ہو جائے تو اس زمین کی سیرابی ممکن ہوگی اور اس کی ضرورت بھی پوری ہوگی اور اس کے بعد کا وہ محتاج نہ ہوگا۔
یہاں تک کہ اگر اس کے لیے زمین کو سیراب کرنا ممکن ہو اور کھدائی ممکن نہ ہو تو اس پر کھدائی وغیرہ واجب نہ ہوگی۔ اور شرب والوں پر کچھ بھی کھدائی لازم نہیں ہے کیونکہ شرب ایک عام شرکت کا حکم رکھتی ہے۔

مخصوص نہر کے شرکاء آپس میں لڑیں کہ میرا شرب اتنا اور میرا اتنا ہے تو شرب کو ان کے درمیان ان کی زمینوں کے تناسب سے کر دیا جائے گا تا کہ جو مقصد ہے وہ حاصل بھی ہو اور بقدر ضرورت ہو اور اگر راستے کی مقدار میں جھگڑا ہو تو وہاں یہ طریقہ نہ ہوگا کیونکہ کسی کا گھر کشادہ ہو یا تنگ راستہ تو اس کو گزرنے کیلئے ضرور چاہیے اور راستہ سب کے لیے ایک ہی انداز کا ہوگا۔ یہ نہیں کہ کشادہ گھر والے کو زیادہ اور کم والے کو کم ملے یعنی تنگ والے کو کم ملے۔ ان شرکاء میں سے جس کی زمین پہلے ہے اور اوپر ہے کہ پانی نہیں چڑھتا اس کے باوجود بھی اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ نہر میں بند لگا کر اپنی زمین سیراب کرے کیونکہ اس میں دیگر شرکاء کا نقصان ہے بلکہ بغیر بند لگائے ہوئے اپنے حصے کے مطابق سیراب کرنے کا حق ہے ہاں اگر تمام شرکاء راضی ہو کر اجازت دے دیں تو جائز ہے اسی طرح اگر سب نے اتفاق کر لیا کہ اپنی باری میں ہر ایک بند لگا لیا کرے تو جائز ہے کیونکہ یہ انہیں کا حق ہے لیکن بند ایسی چیز سے لگائے کہ نہر جس سے نہ بچے مثلاً تختہ وغیرہ سے مٹی کا بند نہ لگائیں ورنہ دیگر شرکاء کو اس کے نکالنے میں دقت ہوگی اور اگر وہ اس پر بھی راضی ہو جائیں تو جائز ہے۔

مخصوص مشترک نہر میں سے کوئی دوسری نہر کھودنا چاہتا ہے تو اپنی ساتھیوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کوئی مخصوص مشترک کے کنارے پر پن چکی لگانا چاہتا ہے تو اپنے ساتھیوں کی رضامندی کے بغیر نہیں لگا سکتا کیونکہ اس نہر کا کنارہ توڑنا پڑے گا نیز پن چکی میں مشترک جگہ کو اپنی عمارت میں گھیر لے گا اور دونوں ممنوع ہیں اور اگر پن چکی ایسی ہو کہ اس سے نہر کو اور اس کے پانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہو اور اپنی جگہ میں پن چکی لگاتا ہے تو جائز ہے کیونکہ یہ اپنی ملک میں تصرف ہے جس میں کسی کو نقصان نہیں۔

اگر شرکاء میں سے کوئی شریک نہر کا پانی اپنی دوسری زمین میں لے جائیں جس کا شرب اس نہر میں نہیں تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے ورنہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ کہے گا

کہ یہ تو میرا حق ہے۔ لہٰذا اس کو پہلے ہی روک دیا جائے گا۔

جس نے اپنی زمین کو معتاد طریقے سے سیراب کیا اور اس کا پانی دوسرے کی زمین میں پہنچ گیا اور اس سے اس کی زمین غرق ہوگئی تو اس پر کوئی ضمان (تاوان) نہ ہوگا لیکن اگر اس نے غیر معتاد طریقے سے زمین کی آبپاشی کی تو ایسی صورت میں ضامن ہوگا۔ اس لیے کہ وہ تعدی اور زیادتی کا مرتکب ہے۔ جب پانی نہر کا سرا کھول اور پڑوسی کی زمین تک اس کا پانی پہنچ گیا جس سے اس کی زمین ڈوب گئی تو اگر وہ معتاد طور پر تھا تو ضامن نہ ہوگا ورنہ ضامن ہوگا۔ یہی حکم ہے کہ اگر اپنی زمین میں موجود گھاس کو جلاتے اور آگ دوسرے کی زمین میں پہنچ کر کوئی چیز جلا ڈالے تو اگر اس کا جلانا معتاد ہو تو ضامن نہ ہوگا ورنہ ضامن ہوگا اور بعض کا قول یہ ہے کہ اگر وہ دن ہواؤں کے چلنے کا ہو اور اسے معلوم ہو کہ آگ متجاوز ہوگی تو ایسی صورت میں ضامن ہوگا۔

مزارعت کا بیان

مزارعۃ لغۃ ''زرع'' سے مفاعلت ہے بمعنی بونا، بیج ڈالنا، اس کو مخابرہ اور محاقلہ بھی کہتے ہیں اور اہل عراق اس کو قراح بولتے ہیں۔ اصطلاح شرع میں مزارعت اس عقد کو کہتے ہیں جو پیداوار کی تہائی یا چوتھائی وغیرہ پر منعقد ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عقد باطل ہے۔ اس لیے کہ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں محاقلہ کیا کرتے تھے، زمین کو ثلث اور ربع پیداوار اور متعین اناج پر کرایہ پر دیتے تھے، ایک روز ہمارے چچا کے رشتہ داروں میں کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کام سے منع فرمایا جس سے ہمارا فائدہ تھا لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی میں ہم کو زیادہ فائدہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں محاقلہ یعنی زمین کو ثلث یا ربع پیداوار اور متعین اناج پر کرایہ پر دینے سے منع فرمایا اور حکم دیا ہے کہ زمین کا مالک خود اس میں کھیتی باڑی کرے یا دوسرے کو کھیتی باڑی کے لیے دے دے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرایہ پر دینا یا اور کسی طریقہ پر دینا برا جانا ہے۔[1]

نیز حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم محاقلہ کیا کرتے تھے یعنی زمین کو ثلث یا ربع پیداوار پر کرایہ پر دیتے تھے، پھر انہوں نے سابقہ روایت کی طرح بیان کیا۔[2]

نیز حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے تھے کہ تمام انصار میں

---

[1] صحیح مسلم ۱۱۸۱/۲ [2] ایضاً

ہمارے ہاں محاقلہ زیادہ تھا، ہم زمین کو کرایہ پر دیتے اور کہتے کہ یہاں کی پیداوار ہم لیں گے اور تم یہاں کی لینا، پھر کبھی یہاں تو پیداوار ہوتی اور وہاں نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا لیکن چاندی کے بدلے کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا۔[۱]

اور حنظلہ بن قیسؒ کی روایت میں ہے کہ حضرت رافع ؓ نے فرمایا کہ سونے اور چاندی کے بدلے ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (ایضاً) نیز حضرت رافع بن خدیج ؓ سے مروی ہے کہ ظہیر بن رافع میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کام سے منع فرمایا جس میں ہمارا فائدہ تھا، میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ حق ہے، انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے کھیتوں کا کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ان کو کرایہ پر چلاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نہر پر جو پیداوار ہو اس کو لیتے ہیں یا چند وسق کھجور یا جو کے بدلے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، یا تو تم خود اس میں کھیتی باڑی کرو یا دوسروں کو (بلا کرایہ) کھیتی باڑی کے لیے دو یا اسے یوں ہی رہنے دو۔[۲]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ رسول کریم ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا، اس لیے کہ مزارعت بعض پیداوار کے بدلے زمین کو اجرت پر دینا ہے اور اجرت نامعلوم یا معدوم ہوتی ہے اور دونوں چیزیں مفسد عقد ہیں اور آنحضرت ﷺ کا اہل خیبر کے ساتھ جو معاملہ ہوا تھا وہ دراصل خراج مقاسمہ تھا جو کہ بطریق صلح واحسان کے تھا اور یہ جائز ہے۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مزارعت جائز ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کے لوگوں سے کھجور اور کھیت کی پیداوار کے نصف پر معاملہ فرمایا تھا نیز لوگوں کو اس کی حاجت وضرورت بھی ہے، اس لیے زمین کا مالک بسا اوقات بذات خود کام کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوتا اور کرایہ پر دینے کی کوئی چیز نہیں پاتا اور اسی طرح کام پر قدرت وطاقت رکھنے والا بسا اوقات اس کے پاس زمین نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اور کام، اس لیے مزارعت کے جواز کی ضرورت ہے تاکہ حاجت وضرورت پوری ہو جیسا کہ مضاربت کا معاملہ ہوتا ہے، فتویٰ بھی صاحبینؒ کے قول پر ہے۔

صاحبینؒ کے ہاں مزارعت کی چار صورتیں ہیں، تین جائز اور ایک ناجائز، جائز صورتیں یہ ہیں: (۱) زمین اور بیج ایک کا ہو اور بیل اور کام دوسرے کا ہو۔ (۲) زمین ایک کی ہو

---

[۱] صحیح مسلم ۳/۱۱۸۳ [۲] صحیح مسلم، البیوع ۳/۱۱۸۲

اور باقی (بیج، بیل، عمل) دوسرے کا ہو (۳) عمل ایک کا ہو اور باقی دوسرے کا ہو، یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔ وقد نظمها فی الدر المختار

ارض و بذر کذا ارض کذا عمل   من واحد ذی ثلثها کلها قبلت

پہلی صورت میں زمین اور بیج کا مالک بعض پیداوار پر عامل کا مستاجر ہے اور یہی اصل مزارعت ہے اور آلات حراثت استیجار میں داخل نہیں ہے، وہ جو عامل کے عمل کے تابع ہیں، جیسے کسی درزی کو اجرت پر رکھا جائے تا کہ وہ درزی کی مشین سے اس کے کپڑے سلا یا کرے تو یہ جائز ہے اور دوسری صورت میں عامل پیداوار کے بعض متعین حصہ کے بدلہ زمین کو اجرت پر لینے والا ہے تو یہ لینا اسی جائز ہے جس طرح زمین کو معلوم و متعین مال پر اجرت پر لیا جائے۔

اور تیسری صورت میں زمین کا مالک بعض پیداوار پر عامل کا مستاجر ہے اور آلات مستاجر کے ہیں جو یہ جائز ہے کیونکہ وہ ایسا ہی جیسے کوئی درزی اجرت پر لیا جائے کہ وہ کپڑے والے کی مشین سے اس کا کپڑا سلائی کرے۔

(۴) زمین اور بیل ایک کا ہو اور بیج اور عمل دوسرے کا ہو، یہ صورت باطل ہے کیونکہ اس میں آلہ حرث (بیل) کو بعض پیداوار کے عوض اجرت پر لینا لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ عمل کے تابع نہ ہوگی۔

نیز اگر بیج اور بیل ایک کا ہو اور زمین اور عمل دوسرے کا ہو یا صرف بیل ایک کا ہو اور باقی دوسرے کا یا صرف بیج ایک کا ہو اور باقی دوسرے کا تو یہ تینوں صورتیں بھی فاسد ہیں۔ وقد نظمها فی الدر المختار

والبذر مع بقر اولا کذا بقر   لاغیر او مع ارض اربع بطلت

صحت مزارعت کی شرائط

صاحبینؒ کے نزدیک صحت مزارعت کے لیے چند شرطیں ہیں۔ (۱) زمین کا قابل کاشت ہونا، شور اور ریگستان میں مزارعت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے مزارعت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ (۲) مزارعت کی ایسی مدت بیان کرنا جو کاشتکاروں میں معروف ہو تا کہ اختلاف نہ ہو مثلاً ایک سال یا دو سال (۳) زمین کے مالک اور مزارع کا اہل عقد میں سے ہونا (۴) صاحب تخم کا مذکور ہونا، اس لیے کہ اگر بیج مالک کی طرف سے ہو تو عامل مزدور ٹھہرے گا اور اگر عامل کی طرف سے ہو تو زمین کرایہ پر ٹھہرے گی اور دونوں کے احکام مختلف ہیں تو بلا ذکر صاحب

تخم معقود علیہ مجہول ہوگا۔ (۵) جس کی طرف سے بیج نہیں ہے اس کا حصہ بیان کرنا کیونکہ حصہ عمل یا زمین کی اجرت ہے تو اس کا متعین ہونا ضروری ہے۔ (۶) زمین کے مالک اور عامل کے درمیان تخلیہ کا ہونا (یعنی مالک ارض کا درمیان میں نہ آنا) حتیٰ کہ اگر مالک ارض کے عمل کو شرط ٹھہرایا گیا تو عقد فاسد ہوگا۔ (۷) پیداوار میں بلاتعین مقدار دونوں کا شریک ہونا اگر کسی ایک کے لیے کچھ پیمانہ غلہ کی شرط ہو تو مزارعت باطل ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ غلہ اتنی ہی مقدار میں پیدا ہو، اس سے زیادہ نہ ہو اور پھر ان میں جھگڑا پڑے، اسی طرح پانی کی نالیوں اور گولوں کے قریب اگنے والی کھیتی اگر کسی ایک کے لیے مشروط ہو تو مزارعت جائز نہ ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ اس جگہ کے سوا اور جگہ غلہ پیدا نہ ہو۔

لیکن اگر بیج کا مالک اپنے لیے یا دوسرے کے لیے پیداوار کا عشر مشروط کرے اور باقی پیداوار دونوں کے درمیان مشترک ہو تو یہ متعین مشترک ہوگا جو کہ قطع شرکت کا موجب نہیں ہے۔

اگر ایک کے لیے بھوسا (جانوروں کا چارہ) اور دوسرے کے لیے غلہ مشروط ہو تو یہ مزارعت فاسد ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی آفت آن پڑے اور بھوسے کے سوا کچھ بھی نہ رہے۔

اگر دونوں نے شرط لگائی کہ بھوسا نصف نصف ہوگا اور دانے ان دونوں میں سے خاص طور ایک کے لیے ہوں گے تو یہ مزارعت بھی فاسد ہے کیونکہ یہ قطع شرکت کا موجب ہے۔ اگر دونوں نے شرط رکھی کہ دانے نصف نصف ہوں گے اور بھوسے کا ذکر نہیں ہوا تو مزارعت درست ہوگی کیونکہ دونوں نے مقصود یعنی دانوں میں شرکت کی شرط لگائی ہے اور بھوسا بیج والے کا ہوگا کیونکہ یہ اس کے بیج کا نمو ہے۔

اگر دونوں نے شرط رکھی کہ دانے نصفا نصف ہوں گے اور بھوسا بیج والے کا ہوگا تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ عقد کا حکم ہے۔ اگر دونوں نے بھوسے کو دوسرے کے لیے مشروط کیا تو مزارعت فاسد ہوگی کیونکہ یہ ایسی شرط ہے جو قطع شرکت کا موجب ہے، بسا اوقات بھوسے کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا تو دوسرا یعنی بیج والے کے علاوہ کوئی دوسرا مشروط طور پر اس بھوسے کا مستحق ہو جائے گا۔

جب مزارعت صحیح ہو تو پیداوار ان شرائط کے مطابق ہوگی جو دونوں میں طے ہوئیں اور وہ ایسی شرائط ہوں جو قطع شرکت کا تقاضا نہ کرتی ہوں اگر پیداوار کچھ بھی نہ ہوئی تو مزارعت صحیحہ میں عامل کے لیے کچھ نہ ہوگا کیونکہ شرکت تو پیداوار میں تھی اور پیداوار ہوئی نہیں اور اس صورت میں وہ اس مضارب جیسا ہوگا جسے کوئی نفع نہ ہوا ہو اگر مزارعت فاسدہ ہو اور زمین کچھ پیدا نہ

کرے یعنی پیداوار نہ ہو تو جس کی طرف سے بیج تھا اس پر اجر مثل واجب ہوگا پس اگر بیج عامل کی طرف سے تھا تو وہ زمین کو اجرت پر لینے والا ہوگا اور اگر بیج مالک ارض کی طرف سے ہو تو وہ عامل کو اجرت پر لینے والا ہوگا جب مزارعت فاسد ہوگی تو اجر مثل واجب ہوگا کیونکہ اس نے عقد فاسد سے منفعت کو پورا پورا حاصل کیا ہے اور مزارعت فاسدہ میں زمین کی پیداوار بیج والے کی ہوگی کیونکہ یہ سب کچھ اسی کی ملک کی نمو ہے۔ پس اگر بیج زمیندار کی طرف سے ہو تو عامل کے لیے اجر مثل ہوگا، اس لیے کہ زمیندار نے عقد فاسد سے اپنی منفعت کو پورا پورا وصول کیا ہے بشرطیکہ مشروط پیداوار کی مقدار سے زیادہ اجرت عامل کے لیے نہ ہو کیونکہ وہ خود زیادہ اجرت کے سقوط پر راضی ہے اور یہ شیخینؒ کے ہاں ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسے ہی اجرت ملے گی جو اس کام میں اوروں کو ملتی ہے، خواہ کہیں تک پہنچ جائے۔ اس لیے کہ زمیندار نے عقد فاسد سے اپنے منافع پورے پورے وصول کر لیے ہیں لہٰذا اس پر منافع کی قیمت واجب ہوگی۔ اس لیے کہ اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ فتویٰ شیخین کے قول پر ہے۔

اگر بیج کام کرنے والے کی طرف سے تھا تو زمین دار کو اس زمین کا اجر مثل ملے گا، اس لیے کہ عامل نے عقد فاسد سے اس کی زمین سے پوری پوری منفعت حاصل کر لی ہے لہٰذا اس کا واپس کرنا اس پر واجب ہوگا اور وہ ممکن نہیں ہے اور اس کا کوئی مثل نہیں۔ لہٰذا اس کی قیمت لوٹانا واجب ہوگا۔

کیا مشروط پیداوار سے زیادہ دیا جاسکتا ہے، اس میں اختلاف ہے، اگر زمین دار زمین اور بیل کو اور دوسرا بیج اور کام کو جمع کرے تو مزارعت فاسد ہوگی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس عامل پر اس زمین جیسی اجرت ہوگی اور آلہ حراثت بھی۔ یہی صحیح ہے کیونکہ اجارہ میں اس کا دخل ہے اور یہ بھی ایک معنی میں اجارہ ہے۔

اگر زمین دار مزارعت فاسدہ اپنے بیج کی وجہ سے پیداوار کا مستحق قرار پائے تو ساری پیداوار اس کے لیے جائز ہوگی کیونکہ نمو ایسی زمین میں ہوئی ہے جس کا وہ مالک ہے اور اگر عامل اس کا مستحق ہو بایں طور کہ بیج اس کا ہو تو وہ اپنے بیج اور زمین کی اجرت کے بقدر لے گا اور جو زائد ہو اسے صدقہ خیرات کر دے کیونکہ اس کے بیج سے ہی یہ حاصل ہوا ہے لیکن ایسی زمین میں جو دوسرے کی مملوکہ ہے اور ایسے فاسد عقد کے ساتھ جو خبث کا موجب ہے، پس اپنے مال کے عوض تو اس کے لیے جائز ہے اور زائد کو صدقہ کر دے گا۔ جب مزارعت کا معاملہ سابقہ شرائط کے ساتھ طے ہو جائے، پھر بیج والا کام سے انکار کر دے تو اس پر حاکم جبر نہیں کرے گا اور اس پر

کاشتکاری کا کام لازم نہ ہوگا اور یہ بات قضاءً ہے۔ البتہ دیانۃً اس پر لازم ہے کہ وہ اسے راضی کرے کیونکہ اس نے اس کو دھوکہ دیا ہے، پس مزارعت بیج والے کے حق میں لازم نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے اپنا مال یعنی بیج کو تلف کیے بغیر عقد کا ایفاء ممکن نہیں ہے جبکہ دوسرے کے حق میں یہ لازم ہے۔ پس جب وہ شخص جس کی طرف سے بیج نہیں ہے انکار کردے تو حاکم اسے کام پر مجبور کرے گا کیونکہ عقد کو پورا کرنے میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اور عقد، اجارہ کی طرح لازم ہے الا یہ کہ کوئی عذر درپیش ہو تو اس کی وجہ سے اجارہ فسخ ہو جاتا ہے لہٰذا مزارعت اس وجہ سے فسخ ہو جائے گی جب متعاقدین میں سے کوئی ایک مر جائے تو مزارعت باطل ہو جائے گی جیسا کہ اجارہ کا حکم ہے جبکہ مزارعت سے پہلے کوئی مر جائے، حتیٰ کہ اگر عامل نے زمین کو کاشت کیا تو کام کے عوض اس کو کچھ نہ ملے گا اگر بیج بونے کے بعد مر جائے تو اگر زمین دار مر گیا ہو تو کھیت کٹنے تک وہ زمین عامل کے ہاتھ میں رہنے دیں گے اور شرائط کے مطابق تقسیم ہوگی تاکہ دونوں کے حق کی رعایت ہو اور باقی سالوں کیلئے مزارعت کا عقد ختم ہو جائے گا جبکہ سال سے زیادہ کا عقد کیا گیا ہو اور اس میں عامل کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

اگر مزارعت کی مدت گزر جائے اور کھیتی ابھی نہ پکی ہو تو کاشتکار کو اس زمین کا وہ کرایہ دینا ہوگا جو اس جیسی زمین کا کھیتی کٹنے تک ہوا کرتا ہے اور کھیتی کا صرفہ ان دونوں پر ہوگا اپنے اپنے حصوں کے مطابق کیونکہ عقد کو باقی رکھنے میں دونوں کے حق کا ایفاء ہے اور اسے فسخ کرنے میں ان میں سے ایک کو ضرر لاحق ہوتا ہے لہٰذا کھیتی کے کٹنے تک اس عقد کو باقی رکھنا بہتر ہوگا اور کام ان دونوں پر لازم ہوگا۔ اس لیے کہ عقد کا وقت تو انتہائے مدت سے پورا ہو چکا ہے اور یہ مشترکہ مال میں عمل ہے، پس اس میں صرف عامل پر کام کا وجوب نہ ہوگا۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب زمین کا مالک مر جائے اور کھیت ابھی پکا نہ ہو تو اس صورت میں صرف عامل کے ذمہ کام ہوگا کیونکہ مدت باقی ہونے کی وجہ سے عقد ابھی باقی ہے۔

کھیتی کاٹنے، گاہنے اور غلہ صاف کرنے کی اجرت دونوں پر حصوں کے مطابق ہوگی کیونکہ معاملہ کھیت کے مقصود یعنی غلہ کے حاصل ہونے کی وجہ سے پورا ہو چکا ہے، پس دونوں کے درمیان بغیر عقد کے مال مشترک باقی رہا، پس اس کا صرفہ ان ہی پر ہوگا۔ اگر ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کی اجازت کے بغیر صرفہ کر دیا، قاضی نے بھی اس کا حکم نہیں دیا تھا تو وہ متبرع (احسان کرنے والا) ہوگا اگر دونوں نے عقد مزارعت میں کھیتی کاٹنے کی اجرت وغیرہ کاشتکار کے ذمہ ہونے کی شرط کر لی تو مزارعت فاسد ہو جائے گی کیونکہ یہ ایسی شرط ہے کہ اس کا

عقد تقاضا نہیں کرتا ہے۔ اور اس میں متعاقدین میں سے کسی ایک کا نفع ہے اور یہ قیاس ہے مگر یہ کہ امام ابو یوسفؒ سے اس کا جواز مروی ہے۔ حضرت حسنؒ، امام صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ کھیتی کے صرفہ کی شرط کاشتکار کے ذمہ کرلی گئی تو تعامل کی بنا پر جائز ہے اور اس کو استصناع پر قیاس کیا گیا ہے۔ وعلیہ الفتویٰ

مساقات کا بیان

زیلعی، عینی اور درروغیرہ میں ہے کہ مساقات لغۃً ''سقی'' سے باب مفاعلت ہے بمعنی سینچنا اور سیراب کرنا۔ لیکن نہایہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لغوی اور شرعی معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس مساقات اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنا باغ دوسرے کو اس لیے دے دے کہ وہ درختوں کی پرورش، ان کی اصلاح اور دیکھ بھال کرے اور جو پھل آئے وہ ان میں نصف یا ثلث یا ربع یا کم وبیش مشترک ہو۔ مزارعت کی طرح مساقات بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک باطل ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

صاحبینؒ کے نزدیک اس کا جواز اس شرط سے مشروط ہے کہ معین مدت ذکر کردی گئی ہو اور بطریق مشاع پھل کا حصہ معین کردیا گیا ہو، اس میں مدت کی تعیین کی شرط قیاس کے مطابق ہے، اس لیے کہ مساقات بھی ایک لحاظ سے اجارہ ہے اور استحسان کا تقاضہ یہ ہے کہ مدت بیان نہ بھی ہو تو جائز ہونا چاہیے اور یہ عقد پہلی بار پیدا ہونے والے پھل پر ہوگا کیونکہ پھل کو پکنے کیلئے ایک وقت معین تو درکار ہوتا ہے اور پھلوں کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے لہٰذا پھلوں میں بیان مدت کی شرط نہ ہوگی جیسے مزارعت میں ہے۔ اس لیے کہ اس کی ابتداء اور انتہاء بھی موسم خریف، صیف اور ربیع کے اعتبار سے اکثر مختلف ہوتی ہے، پس اس میں جہالت آئے گی لیکن اگر کسی کو درخت دیئے اور اس کو ابھی پھل نہیں لگے تو بیان مدت کے بغیر یہ عقد جائز نہ ہوگا کیونکہ زمینوں کی قوت اور ضعف کی وجہ سے اس میں کھلا تفاوت ہے اور اگر کھجور کے درخت یا رطبہ کی جڑیں اس لیے دیئے کہ وہ اس کی نگہداشت کرے یا اس نے رطبہ کو مطلق چھوڑا تو مساقات فاسد ہوگی کیونکہ اس کی انتہائی مدت نامعلوم ہے، اس لیے کہ جب تک اسے زمین میں چھوڑا جائے اس میں بڑھوتری آتی رہتی ہے، اس مدت میں جہالت ہوئی اور بطریق مشاع پھل کا حصہ اس لیے متعین ہو کہ اس سے شرکت کا تحقق ہوگا کیونکہ معین جزء کی شرط رکھنا شرکت کو ختم کردیتا ہے۔

اگر متعاقدین نے مساقات میں ایک وقت معین کردیا جس وقت کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ پھل اتنے وقت میں نہیں نکلے گا تو معاملہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ مقصود فوت ہے اور وہ پیداوار میں شرکت ہے۔

اگر دونوں نے اتنی مدت کی تعیین کی جس میں کبھی پھل آجاتا ہے اور کبھی موخر بھی ہو جاتا ہے تو جائز ہے کیونکہ ہم ایسی صورت میں مقصود کے فوت ہونے کا یقین نہیں کر سکتے۔ پھر اگر وقت معین پر پھل آجائے تو صحت عقد کی وجہ سے وہ شرکت کے مطابق ہوگا اگر پھل کے نکلنے میں تاخیر ہوئی تو فساد عقد کی وجہ سے عامل کو اس جیسی اجرت ملے گی۔

مساقات، کھجور ،درختوں، انگوروں، ترکاریوں اور بینگنوں میں جائز ہے۔ پس اگر کھجور کا پھل دار درخت مساقات پر دیا اور پھل عمل سے بڑھنے والا ہے تو یہ جائز ہے یا کھیت دیا جو عمل سے بڑھنے والا ہے تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں عمل کی ضرورت ہے اور اگر پھل کا بڑھنا پورا ہو چکا ہو اور کھیتی کاٹنے کیلئے تیار ہو چکی ہو تو جائز نہیں ہے کیونکہ عامل اپنے عمل کی وجہ سے مستحق ہوتا ہے۔ اور جب پھل پک چکا، کھیتی تیار ہو چکی تو اس کے عمل کو کوئی دخل نہیں رہا۔ پس اگر پکنے کے بعد بھی مساقات کو جائز رکھا جائے تو عامل کا بلاعمل مستحق ہونا لازم آئے۔ ولم یرد بہ الشرع

جب مساقات فاسد ہو تو کارندہ کو اجر مثل ملے گی کیونکہ یہ ایک لحاظ سے اجارہ فاسدہ ہے اور مزارعت کی مثل ہوگا جب وہ فاسد ہو جائے پھر شیخینؒ کے نزدیک تو اسے اجر مثل ملے گا جو طے شدہ شرط سے زائد نہ ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک اسے وہی اجرت ملے گی جو اس کام میں اوروں کو ملتی ہے خواہ کہیں تک پہنچ جائے۔

عقد مساقات کسی کے مر جانے سے باطل ہو جاتی ہے، مالک کے مرنے سے اس لیے باطل ہو جاتی ہے کہ کھجور کے درخت دوسرے کی طرف منتقل ہو گئے اور عامل کے مرنے سے اس لیے باطل ہو جاتی ہے کہ اس کی طرف سے اب عمل (کام) کا ہونا ناممکن ہو گیا ہے۔ پس اگر کھجوروں کا مالک مر گیا اور پھل نیم پختہ اور سبز ہیں تو عامل کے لیے جائز ہے کہ وہ پہلے کی طرح اس کی دیکھ بھال کرے یہاں تک کہ پھل پک جائیں اگرچہ اس کے ورثہ اس کو برا جانیں کیونکہ اس میں عامل پر سے دفع ضرر ہے اور ورثہ کو کوئی ضرر نہیں ہے۔

اور اگر عامل مر گیا تو اس کے ورثہ کے لیے جائز ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں۔ خواہ کھجوروں کا مالک اس کو برا جانے کیونکہ اس میں جانبین کا خیال اور رعایت ہے۔

اور اگر دونوں مر جائیں تو عامل کے ورثہ کو اختیار حاصل ہے کیونکہ وہ اب اس کے قائم

مقام ہیں پس اگر عامل اس کی دیکھ بھال سے انکار کریں تو کھجوروں کے مالک کے ورثہ کو اختیار ہوگا۔

اگر معاملہ کی مدت گزر جائے اور پھل ابھی نیم پختہ اور سبز ہوں تو عامل کے لیے جائز ہے کہ وہ پھل پکنے تک بلا اجرت اس کی دیکھ بھال کرے کیونکہ درختوں کو اجرت پر لینا جائز نہیں ہے مگر اس میں مزارعت کا حکم اس کے برخلاف ہے۔ اس لیے کہ زمین کو کرایہ پر لینا جائز ہے، اسی طرح اس مسئلہ میں عمل، عامل کے ذمہ ہے اور مزارعت میں ان دونوں پر عمل ہے۔

جن اعذار کی بنا پر اجارہ فسخ ہو جاتا ہے ان ہی اعذار کی وجہ سے مساقات اور مزارعت بھی فسخ ہو جاتی ہے، ان اعذار میں سے ایک عذر یہ ہے کہ عامل چور ہو، خوف ہو کہ کہیں وہ پکنے سے پہلے پھل وغیرہ نہ چرالے نیز اس میں زمین دار کا نقصان ہے۔

اس طرح عامل کا بیمار ہو جانا بھی ایک عذر ہے جبکہ وہ مرض ایسا ہو جو اسے کام کرنے سے عاجز کرتا ہو کیونکہ ایسا کرنے میں اس پر ضرر کی زیادتی لازم کرنا ہے جس کا اس نے التزام نہیں کیا' لہٰذا اسے عذر قرار دیا جائے گا۔ جس شخص نے کسی کو معین سالوں کے لیے کوری زمین دی کہ وہ اس میں درخت لگائے اس شرط پر کہ زمین اور درخت ان دونوں کے درمیان نصفا نصف ہوں گے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اس نے شرکت کو شرکت سے پہلے حاصل ہونے والی چیز سے مشروط کیا۔ اس کے کام سے مشروط نہیں کیا ہے اور تمام پھل اور درخت زمین کے مالک کے ہوں گے اور درخت لگانے والے کو درخت لگانے کی قیمت اور اپنے کام پر اجرت مثل ملے گی۔

ماذون غلام کے احکام

اذن کا لغوی معنی ہوتا ہے، اجازت دینا اور اصطلاح شرع میں ممنوع التصرف شخص کو تصرف کی اجازت دینا اور اس پر لگی ہوئی پابندی کو ختم کرنا ہے۔ عبد ماذون اپنی اہلیت کے سبب اپنے لیے تصرف کر سکتا ہے کیونکہ اس کی اہلیت اذن کے بعد اپنی زبان اور عقل و تمیز کی وجہ سے باقی ہے اور اجازت دہندہ تجار کو اس کی خبر دے گا تا کہ وہ اس کے ساتھ معاملہ کریں اور اس کا فائدہ بچہ کو تصرفات کرنے، مال کمانے اور نفع حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى (النساء: ۶) یعنی کسی طرح ان کو آزماؤ، کوئی چیز ان کو دے کر دیکھو کہ وہ اس میں کس طرح تصرف کرتے ہیں۔ اور سرپرست باپ ہے اور باپ نہ ہو تو دادا ہے اور پھر وصی اور قاضی ہے۔

بچے کے اذن کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اس بات کو سمجھتا ہو کہ بیع سے ملکیت سلب اور نفع حاصل ہوتا ہے۔

اور اذن صراحۃً اور دلالۃً دونوں طرح ثابت ہوتا ہے۔ صراحت کی مثال تو یہ ہے کہ اس طرح کہے کہ میں نے تجھے تجارت کی اجازت دی اور دلالۃً اذن کی صورت یہ ہے کہ اسے بیع وشراء کرتے دیکھے اور خاموشی اختیار کرلے کیونکہ لوگ جب اسے تصرفات کرتے دیکھتے ہیں اور اس کے سرپرست کو خاموش دیکھتے ہیں تو یہی سمجھتے ہیں کہ اس کا سرپرست اس پر راضی ہے ورنہ وہ ضرور اس کو منع کرتا، چنانچہ وہ اس کے ساتھ عبید ماذون والا معاملہ کرتے ہیں۔ پس اگر اس کی خاموشی اس کی رضامندی شمار نہ ہو تو اس سے انہیں ضرر پہنچ سکتا ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ اس کی خاموشی کو دفع ضرر کی خاطر اس کی رضامندی قرار دیا جائے۔ خواہ اس کی بیع (معاملہ) سرپرست کے لیے ہو یا کسی اور کے لیے ہو اور اس کے حکم اور اجازت سے ہو یا نہ ہو، معاملہ صحیح ہو یا فاسد کیونکہ ان تصرفات کے موقع پر اس کا سکوت اس کی رضا وخوشی کی دلیل ہے۔

جب سرپرست نے بچہ کو تجارت کی عام اجازت دے دی تو تمام تجارتوں میں اس کا تصرف جائز ہوگا۔ اور اگر اس نے کسی خاص نوع کی تجارت کی اجازت دی مثلاً اس نے کہا کہ میں تجھے روٹی کی تجارت کی اجازت دیتا ہوں تو پھر بھی وہ ہر قسم کی تجارت کا مجاز ہوگا۔ اسی طرح اگر اس نے اس کو کسی خاص نوع کی تجارت سے منع کیا تو بھی یہی حکم ہے، اسی طرح اگر اس سے کہا کہ میں تجھے خشکی میں تجارت کی اجازت دیتا ہوں لیکن سمندر میں اجازت نہیں دیتا ہوں، پھر بھی یہی حکم ہے کیونکہ اذن، فک حجر اور اطلاق تصرف کا نام ہے اور انفکاک حجر کے بعد غلام اپنی اہلیت کے سبب سے تصرف کرتا ہے اذن وتصرف نہ کسی وقت کے ساتھ مقید ہوگا اور نہ کسی خاص قسم کی تجارت کے ساتھ مخصوص ہوگا جبکہ توکیل کا معاملہ ایسا نہیں ہے اور اسے اس کا وکیل بنانا درست نہیں ہے کیونکہ وہ مجہول ہے اور ماذون سے تو آذن تصرفات میں رجوع نہیں کرسکتا جبکہ وکیل سے رجوع کرسکتا ہے۔

ہاں اگر وہ کسی معین چیز کے بارے میں اجازت دے تو وہ ماذون نہ ہوگا کیونکہ یہ درحقیقت استخدام ہے نہ کہ اذن۔

ماذون کے جائز تصرفات

جب ماذون کے لیے تصرف جائز ہوا تو اس کے لیے خریدنا، فروخت کرنا، رہن لینا،

رہن رکھنا وغیرہ تمام تصرفات جائز ہوں گے خواہ وہ کرایہ پر لے یا کرایہ پر دے۔ وکیل بنائے، مضاربت کرے، شرکت عنان کرے، بیع سلم کرے، مزارعت کرے، غلہ خریدے اور اس کو بوئے۔

اگر ماذون نے کسی قرض یا ودیعت یا غصب کردہ چیز کا اقرار کیا تو جائز ہے کیونکہ اقرار بھی تجارت کے توابع میں سے ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کے اقرار کو درست قرار نہ دیا جائے تو لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے باز آجائیں گے اور یہ اس وقت ہے کہ جب اس کا تعلق تجارت سے ہو۔

ماذون کے ناجائز تصرفات

ماذون کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ شادی کرے کیونکہ یہ تجارت میں شامل نہیں ہے اگر اس نے اس کے ساتھ دخول کرلیا تو مہر اس پر ہوگا۔ ماذون کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی چیز ہبہ کرے خواہ بالعوض ہو یا بلا عوض اور اس کے لیے کوئی چیز صدقہ کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ یہ سب چیزیں تبرع میں آتی ہیں۔ ہاں اگر وہ (ماذون) تھوڑا سا کھانا کسی کو تحفۃً دے دے یا تھوڑا سا مال تحفۃً دے دے یا اس کی مہمان داری کرے جو اس کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے تو جائز ہے کیونکہ یہ تاجروں کی عادت ہے۔ اسی طرح ماذون کے لیے جائز نہیں کہ وہ آقا (سرپرست) کی اجازت کے بغیر کسی کے مال کا کفیل بنے، اگر آقا نے اجازت دے دی تو جائز ہے جبکہ اس پر قرض نہ ہو لیکن اگر وہ مقروض ہو تو جائز نہیں ہے۔

صید کے احکام

"صید" لغۃً مصدر ہے بمعنی شکار کرنا خواہ وہ ماکول ہو یا غیر ماکول اور مجازاً مفعول پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے خلق اور علم کا اطلاق مخلوق اور معلوم پر ہوتا ہے۔ صید ہر وہ متوحش جانور ہے جس کو حیلہ کے بغیر پکڑنا ممکن نہ ہو۔

سکھائے ہوئے کتے، چیتے اور باز اور شکرے اور دیگر سکھائے ہوؤں سے شکار کرنا جائز ہے، اس طرح شکار کی بندوقوں اور تیروں سے بھی شکار کرنا جائز ہے۔ خنزیر سے شکار کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ نجس العین ہے۔

شکار کے جواز پر دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔

﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ [المائدۃ:۲]: ”جب تم حلال ہو جاؤ تو شکار کرو۔“

نیز ارشاد ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ [المائدۃ:۹۶]: ”تمہارے لیے دریا کا شکار حلال کیا گیا ہے۔“

نیز ارشاد ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ﴾ [المائدۃ ۴]: ”تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں اور جن زخمی کرنے والوں کو تم نے سکھایا ان کا شکار حلال کیا گیا ہے۔“

نیز اس کے جواز کی دلیل آنحضور ﷺ کا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو یہ فرمانا ہے کہ جب تم اپنا سکھایا ہوا کتا چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے لو تو وہ شکاری جانور جو شکار تمہارے لیے روکے اس کو کھالو، خواہ وہ مار ڈالیں۔[۱]

نیز آنحضرت ﷺ نے ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”پس تم اپنی کمان کے ساتھ شکار کرو تو اللہ تعالیٰ کا نام لو، پھر کھاؤ۔“[۲]

شکار کے حلال ہونے کی شرطیں

شکار کے حلال ہونے کی سات شرطیں ہیں ان میں سے چار شرطیں تو مرسل (چھوڑے ہوئے شکاری جانور) کے بارے میں ہیں۔ اور تین شرطیں مرسل (چھوڑنے والے) کے بارے میں ہیں۔ مرسل میں پائی جانے والی شرطیں یہ ہیں: (۱) شکاری جانور سکھایا ہو، کتے اور دوسرے درندوں کا معلم ہونا تو یہ ہے کہ وہ تین بار شکار پکڑ چکے اور اس کی کھال، گوشت، ہڈی کچھ نہ کھائے، اگر خون پی لے تو کچھ حرج نہیں اور باز وغیرہ کا معلم ہونا یہ ہے کہ جب اس کو بلایا جائے تو فوراً واپس آجائے، وجہ یہ ہے کہ کتے کی عادت پھاڑنا ہے اور باز وغیرہ کی عادت وحشت ہے، جب دونوں نے اپنی عادت چھوڑ دی تو ان کا معلم ہونا ثابت ہو گیا اور ان کے معلم کے بارے میں تجربہ کار لوگوں سے رجوع کیا جائے گا۔

حضرت حسنؒ، امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: شکاری جانور جو شکار پہلی بار اور دوسری بار کرے اس کو نہ کھاؤ اور تیسری بار کا کیا ہوا شکار کھاؤ۔ صاحبینؒ فرماتے

---

[۱] [صحیح البخاری ۱۱۸۶]　[۲] [صحیح البخاری ۱۱۸۷]

ہیں کہ جب وہ تین بار شکار کو کھا نا چھوڑ دے تو وہ معلم ہو جائے گا کیونکہ ایک بار چھوڑنے سے اس کا معلم ہونا ثابت نہ ہوگا کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس نے سیر ہونے یا مار کے خوف سے اس کو چھوڑ دیا ہو۔ اس لیے کئی بار دیکھ لینا ضروری ہے اور تین بار چھوڑ دینے کے بعد اس کے معلم ہونے کا حکم لگائیں گے۔ اگر شکاری جانور کے معلم ہونے کا حکم لگانے کے بعد اس نے کھالیا یا بات ماننی چھوڑ دی تو اس کے جاہل ہونے کا حکم لگا دیں گے اور اس سے پہلے اس کا بچا ہوا شکار حرام ہوگا کیونکہ اس کی جہالت سامنے آ گئی۔ یہ امام صاحب کے ہاں ہے۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ صرف وہی حرام ہوگا جس شکار سے اس نے کھایا ہو کیونکہ ہم اس سے پہلے اجتہاد کے ذریعہ اس کے شکار کے حلال ہونے کا حکم لگا چکے ہیں لہٰذا اس طرح کے اجتہاد سے وہ نہیں ٹوٹے گا۔

(۲) شکاری جانور ہو، پس وہ (شکاری جانور) اپنی کچلیوں یا اپنے پنجے سے شکار کو پکڑے اور اس کے ذریعے اس کو روک رکھے کیونکہ آیت قرآنی میں ''الجوارح'' سے یہی مراد ہے یعنی وہ جانور جو زخمی کرتا ہے اس مقام پر اس کا زخمی کرنا ذبح اختیاری سے عاجز ہونے کی مجبوری کی وجہ سے ذبح اضطراری کے حکم میں ہوگا۔

(۳) اور یہ کہ وہ خنزیر کی طرح نجس العین نہ ہو۔

(۴) شکار کو زخمی کرے تاکہ جارح کا لفظ اس پر صادق آئے اور اس لیے بھی کہ خون کا بہنا ضروری ہے پس اگر اسے ٹکر مار کر یا گلا گھونٹ کر مار دیا ہو تو زخمی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔

مرسل میں پائی جانے والی شرطیں

(۱) مرسل مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہو جو شکار چھوڑنے کا مفہوم سمجھتا ہو۔ (۲) چھوڑتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا۔ اس کی دلیل آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان ہے جب تم اپنے تعلیم یافتہ کتے چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے لو تو پھر کھالو۔ [الحدیث]

اور تسمیہ کی یہ شرط کھانے کے حلال ہونے کے لیے ہے لیکن اگر بھول کر تسمیہ چھوٹ جائے تو اس کا کھانا حلال ہوگا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿رفع عن امتی الخطاء والنسیان﴾ ''یعنی میری امت سے خطا و نسیان اٹھالی گئی ہے۔''[1]

---

[1] جامع الاحادیث ۴/۲۲۲

(۳) شکار ممتنع ہو، اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو، اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایسے شکار کا کھانا ناپسند کیا ہے جو تیر انداز کی نگاہ سے غائب ہو جائے جیسا کہ ابو رزینؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس شکار کے بارے میں جو اس کے صاحب کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے۔ یہ فرمایا

﴿لعل هوام الارض هي قتلته﴾: ''یعنی ہوسکتا ہے کہ زمین کے جانوروں نے اسے مار ڈالا ہو۔''[1]

نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک سیاہ فام غلام آنحضور ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے پاس سے مسافر گزرتے ہیں اور میں اپنے آقا کے مویشی چرا رہا ہوتا ہوں تو کیا میں ان کی اجازت کے بغیر ان بکریوں کا دودھ انہیں پلا سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نہیں'' اس نے کہا کہ میں تیر چلاتا ہوں تو شکار کبھی میرے سامنے دم توڑ دیتا ہے اور کبھی زخمی ہو کر کہیں دور چلا جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شکار تمہارے سامنے گر کر دم توڑ دے اسے کھاؤ اور جو زخمی ہو کر کہیں دور جا کر مرے اسے مت کھاؤ کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ تمہارے شکار کی وجہ سے مرا ہے یا کسی اور سبب سے مرا ہے۔

شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کرنا

جب کوئی شخص اپنا معلم کتا یا باز شکار کے جانور پر چھوڑے اور چھوڑتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے، پھر وہ شکاری جانور اس شکار کو پکڑ کر زخمی کر دے، پھر وہ مر جائے تو اس کا کھانا حلال ہے۔ جیسا کہ حدیث عدی رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوتا ہے، جسے ہم نے پہلے نقل کیا ہے۔ نیز اس لیے کہ کتا یا باز ایک آلہ ہے اور محض آلہ سے مقصود حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ اسے استعمال نہ کیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اسے شکار پر چھوڑا جائے، پس اسے تیر اندازی اور چھری چلانے کے قائم مقام کر دیا گیا اس لیے اس وقت تسمیہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر بھول کر تسمیہ چھوڑ دے تو بھی حلال ہوگا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن اگر اس نے قصداً تسمیہ ترک کی تو شکار کا کھانا حرام ہوگا۔ نیز ذبح اضطراری کے پائے جانے کیلئے شکار کا زخمی ہونا ضروری ہے اور ذبح اضطراری یہ ہے کہ جسم کے کسی بھی حصہ میں زخم پایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان مبارک ﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ﴾ [المائدة: ۴] میں اسی زخمی کرنے کی شرط کی طرف اشارہ

---

[1] [مجمع الطبرانی ۱۹/۲۰۴]

ہے۔ امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے شرط قرار نہیں دیا، اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

اگر شکاری جانور کا معلم ہونا ثابت ہو چکا ہو، اس کے بعد اگر وہ (کتا یا دوسرا کوئی درندہ) شکار کے جانور میں سے کچھ کھالے تو اس شکار کا کھانا جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ اس کی جہالت کی علامت ہے۔

اور اگر شکرہ اس میں سے کھالے تو اسے کھانا جائز ہے، اس لیے کہ شکاری پرندوں کے سکھانے میں کھانا چھوڑنا شرط نہیں ہے۔ ان کا سکھانا۔ بس یہ ہے کہ جب ان کو چھوڑا جائے تو وہ شکار کی طرف چلا جائے اور بلایا جائے تو واپس آجائے۔ البتہ درندوں کے سکھاتے میں ان کا شکار کو نہ کھانا شرط ہے۔ جب مرسل (چھوڑنے والا) شکار کو زندہ حالت میں پائے تو اس پر واجب ہے کہ اسے ذبح کرے کیونکہ وہ ذبح اختیاری پر قادر ہے لہٰذا عدم ضرورت کی بنا پر ذبح اضطراری کافی نہ ہوگا۔ پس اگر اس نے ذبح نہ کیا یہاں تک کہ شکار مر گیا اور اس میں مذبوح کی حیات سے زائد حیات تھی بایں طریق کہ وہ کچھ عرصہ جیسے ایک دن یا آدھا دن زندہ رہتا تو اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس کو ذبح کرنے پر قادر تھا اور اس نے اسے ذبح نہیں کیا لہٰذا وہ مردار کی طرح ہو گیا لیکن اگر وہ وقت کی تنگی یا آلہ ذبح کے نہ پائے جانے کی بنا پر ذبح نہ کر سکا اور اس میں مذبوح کی حیات سے زیادہ حیات موجود تھی تو بطور استحسان اس کا کھانا حلال ہوگا۔ واضح یہاں پر یہ قید جو لگائی گئی ہے کہ اس میں مذبوح کی حیات سے زیادہ حیات ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مذبوح کی حیات کے مثل اس میں حیات پائے تو اس کا ذبح کرنا لازم نہ ہوگا کیونکہ وہ حکماً میت ہے اور یہ صاحبینؒ کا قول ہے۔ امام صاحب سے منقول ہے کہ اسے بھی کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ اس نے اس کو زندہ حالت میں پکڑا ہے لہٰذا ذبح اختیاری کے بغیر حلال نہ ہوگا۔ اگر اس کتے نے شکار کا گلا گھونٹ کر اس کو مار دیا اور زخمی نہ کیا تو اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔

اگر ایسا معلم کتا جسے بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا گیا تھا اس کے ساتھ کوئی غیر معلم کتا مل گیا یا معلم کتا ہی شریک ہوا لیکن چھوڑتے وقت اس (دوسرے) پر قصداً تسمیہ ترک کی گئی تھی تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس میں حرمت اور اباحت کی دونوں جہتیں جمع ہو گئی ہیں۔ پس احتیاطاً حرمت والی جہت کو ترجیح دی جائے گی اس کی دلیل حدیث عدی رضی اللہ عنہ ہے جس میں حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اگر میں اپنے کتے کے ساتھ کوئی دوسرا

کتا پاؤں اور مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ ان دونوں میں سے کس نے شکار کو پکڑا ہے تو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿فلا تاکل فانما سمیت علی کلبک ولم تسم علی غیرہ﴾: "یعنی اس صورت میں مت کھاؤ، کیونکہ تم نے اپنے کتے کو چھوڑتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھا دوسرے کتے کو چھوڑتے وقت نہیں لیا تھا۔"[1]

تیراور بندوق سے شکار کرنا

جب کوئی شخص شکار کے جانور پر تیر چلائے اور تیر چلاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہو (بسم اللہ پڑھو) تو تیر سے جو جانور زخمی ہو کر مر جائے اسے کھا سکتا ہے کیونکہ یہ تیراندازی کے ساتھ ذبح کرنا ہے، اس لیے کہ تیر ذبح کا آلہ ہے، پس اس وقت تسمیہ شرط ہوگی اور اس قسم کے ذبح کے لیے سارا جسم محل ہے، زخم کرنا ضروری ہے تاکہ ذبح کا معنی پایا جائے، پس اگر اس نے شکار کو زندہ حالت میں پایا تو اسے ذبح کر دے اگر ذبح نہ کیا یہاں تک کہ وہ مر گیا تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے۔

اگر تیر شکار پر لگا اور شکار بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گیا اور شکاری اس کی تلاش میں مسلسل لگا رہا یہاں تک کہ اس نے شکار کو مردہ حالت میں پایا اور اس پر اس کے تیر کے ہی نشان ہیں تو اسے کھا سکتا ہے کیونکہ وہ تفریط کرنے والا نہیں ہے اور اس نے اس کو ذبح اضطراری کے ساتھ ذبح کر لیا ہے لیکن اگر اس نے شکار کی تلاش کو چھوڑ دیا، پھر اسے مردہ حالت میں پایا ہو تو اسے کھانا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ احتمال ہے کہ اس کی موت کسی اور سبب سے ہوئی ہو۔ نیز آنحضور ﷺ نے فرمایا جب تم اپنا تیر پھینکو تو اللہ تعالیٰ کا نام لو، پس اگر تم اسے پاؤ کہ وہ دم توڑ چکا ہے تو اسے کھاؤ۔[2]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"اگر تم اپنا تیر چلاؤ تو اللہ تعالیٰ کا نام لو، پھر اگر وہ (شکار) ایک دن تک غائب رہے اور اس میں تم اپنے تیر کا ہی نشان پاؤ تو چاہو تو کھا لو۔"[3]

اگر شکار پر تیر چلایا اور تیر پانی میں جا گرا، پھر شکار مر گیا تو نہ کھایا جائے، اس لیے کہ احتمال ہے کہ وہ پانی میں غرق ہو کر مرا ہو جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

1۔ صحیح مسلم ۲/۱۵۳۰ 2۔ صحیح مسلم ۲/۱۵۳۱ 3۔ ایضاً

''جب تم اپنا تیر چلاؤ تو اللہ تعالیٰ کا نام لو، پھر اگر اس کو پاؤ کہ وہ قتل ہو چکا ہے تو کھاؤ مگر یہ کہ تم اس کو پانی میں گرا ہوا پاؤ (پھر نہ کھاؤ) کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ پانی نے اسے مارا یا تیرے تیر نے اسے مارا۔''[1]

جب کسی نے شکار پر تیر چلایا اور وہ کسی چھت یا پہاڑ پر جا گرا، پھر وہاں سے زمین پر گر کر ہلاک ہو گیا تو اسے نہ کھایا جائے اور اگر ابتداء میں ہی زمین پر گر پڑا تو کھا سکتے ہیں۔ پہلی صورت کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس کی موت چھت یا پہاڑ سے گرنے کے سبب ہوئی ہو اور اللہ تعالیٰ نے ایسے جانور (متردیہ) کو حرام قرار دیا ہے۔ اور دوسری صورت کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر گرنے سے تو احتراز ممکن نہیں ہے۔ بندوق کے ذریعہ شکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے تیر کے ذریعہ شکار کرنا، یعنی ان کا حکم یکساں ہے۔

معراض کے ذریعہ شکار کرنا

جس شکار کو معراض نے اپنے عرض کی جانب سے قتل کیا ہو وہ حرام ہے کیونکہ وہ بوجھ اور گرانی کی وجہ سے مرا ہے نہ کہ زخم اور دھاری دار چیز سے۔

معراض کہتے ہیں بلا پر کے تیر کو جس کے دونوں کنارے باریک ہوتے ہیں۔ یہ نشانہ پر عرض کی جانب سے لگتا ہے۔ اس میں زخمی کرنا ضروری ہے تاکہ ذبح کا معنی پایا جائے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور حدیث عدی میں ہے کہ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں معراض کے ذریعہ شکار پر تیر چلاتا ہوں اور نشانہ پر لگتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم معراض کے ذریعہ تیر اندازی کرو اور وہ اس کو چیر کر زخمی کر دے تو اسے کھاؤ اور اگر اس کی عرض کی جانب سے لگے تو نہ کھاؤ۔[2]

پتھر اور غلیل سے شکار کرنا

پتھر، غلیل اور لاٹھی سے شکار حلال نہیں ہوتا کیونکہ یہ سب موقوذہ کے حکم میں ہے گو وہ زخمی ہو گیا ہو کیونکہ یہ چیزیں شکار کو چیرتی پھاڑتی نہیں بلکہ اس کے اعضاء کو توڑتی ہیں ہاں اگر اس کو تیر کی مانند دراز اور نوکدار کر کے مارا ہو اور زخمی ہو گیا ہو تو حلال ہے۔

اگر پتھر وغیرہ نے شکار کو زخمی کر دیا اور وہ شکار مر گیا تو اگر پتھر ثقیل تھا تو اسے نہ کھایا جائے، اس لیے کہ احتمال ہے کہ اس پتھر کے ثقل سے وہ قتل ہوا ہو اور اگر پتھر خفیف (ہلکا) ہو اور

---

[1] [ایضاً]　[2] صحیح مسلم ۱۵۲۹/۳

اس میں حدت (تیزی) ہو تو شکار کا کھانا حلال ہوگا کیونکہ اس کا یقین ہو چکا کہ وہ اس زخم سے مرا ہے۔ اس کی دلیل حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اگر ہم سے کسی کے پاس چھری نہ ہو اور شکار ہاتھ لگ جائے تو کیا وہ پتھر یا لاٹھی کے ٹکڑے سے ذبح کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس چیز سے چاہو خون بہادو اور اللہ تعالیٰ کا نام لو۔[1]

ان مسائل میں اصل یہ ہے کہ جب موت کی زخم کی طرف نسبت یقین کے ساتھ ہو تو شکار حلال ہوگا اور اگر موت کی نسبت ثقل (بوجھ) کی طرف یقین کے ساتھ ہو تو حرام ہوگا اور اگر اس میں شک واقع ہو تو احتیاطاً حرام ہوگیا۔

شکار کے دوران عضو کے کٹ جانے کا حکم

جب کسی نے شکار کے جانور پر تیر چلایا اور اس کا کوئی عضو کٹ گیا تو زخم پائے جانے کی وجہ سے اس شکار کا کھانا حلال ہوگا البتہ عضو مقطوع نہ کھایا جائے گا، اس لیے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ”زندہ حالت میں جس جانور کا جو عضو کاٹا جائے وہ میتہ ہے۔“[2]

اگر تیر نے اس کو تین ٹکڑے کردیا اور اکثر حصہ وہ ہے جو ڈھڈی سے ملا ہوا ہے تو اس کا کھانا حلال ہوگا اور اگر اس کو دو ٹکڑے کردیا تو کھایا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا جدا کردہ حصہ زندہ حالت میں نہیں ہے اور اس کی حیات کے باقی ہونے کا وہم نہ کیا جائے گا، پس اکثر کھایا جائے گا اور اقل نہ کھایا جائے گا۔

تیراندازی میں دو آدمیوں کا شریک ہونا

کسی نے شکار کو تیر مارا اور اس نے اس کو نیم جان کردیا، پھر دوسرے نے اس کے تیر مارا اور اس کو قتل کردیا تو وہ کھایا نہ جائے گا کیونکہ اسے نیم جان کرنے سے اس کا ذبح اختیاری ثابت ہوگیا، پھر جب دوسرے نے زخمی کیا تو وہ مردار ہوگیا اور دوسرا شخص پہلے شخص کے لیے اس شکار کی قیمت کا ضامن ہوگا۔ اس نقصان کے سوا جو اس کے زخم نے کیا ہے کیونکہ دوسرا شخص غیر کے مملوک شکار کو تلف کرنے والا ہے اور یہ اس وقت ہے کہ جب کہ وہ شکار ایسی حالت میں ہو کہ پہلی تیراندازی سے جانبر ہوسکتا ہے تاکہ اس کی موت کی نسبت دوسری تیراندازی کی طرف ہوسکے لیکن اگر اس کی حالت ایسی ہو کہ وہ پہلی تیراندازی سے نہ بچ پایا ہو مثلاً اس سے اس کا سر

[1] سنن ابی داؤد ۳/۱۰۳ [2] سنن ابی داؤد ۳/۱۱۱

کٹ گیا ہو یا پیٹ ہی پھٹ گیا ہو تو حلال ہوگا کیونکہ دوسری تیر اندازی کا وجود کالعدم ہے۔ اور اگر کسی نے شکار کو تیر مارا اور وہ اس کے لگ گیا لیکن اس کو سست اور نیم جان نہیں کیا تھا کہ دوسرے نے تیر مار کر قتل کر دیا تو وہ شکار دوسرے کا ہوگا اور حلال ہوگا۔ حلال جانوروں کا شکار جائز ہے کیونکہ وہ گوشت اور دیگر اجزاء سے انتفاع کا سبب ہیں، اس طرح حرام جانوروں کا شکار بھی جائز ہے کیونکہ وہ بھی کھال، بال یا سینگ سے انتفاع یا شر سے بچاؤ کا سبب ہیں۔

ذبائح کا بیان

ذبائح، ذبیحہ کی جمع ہے اور ذبح بھی اس معنی میں ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ [الصافات: ۱۰۷] ذبیحہ اور ذبح دونوں کا معنی مذبوح (ذبح کیا ہوا، قربانی کا جانور) ہے اور ذَبح "ذبح" کرنے کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ [المائدہ:۳]: "یعنی مگر جو تم ذبح کر لو۔"

ذبح کی دو قسمیں ہیں: ذبح اختیاری، ذبح اضطراری، ذبح اختیاری پر قدرت ہوتے ہوئے ذبح اضطراری جائز نہیں ہے، جب ذبح اختیاری سے عاجز ہو تو اس وقت ذبح اضطراری جائز ہوگی۔

(۱) ذبح اختیاری کی جگہ حلق اور لبہ (سینہ کے اوپر کی ہڈی) کا درمیانی حصہ ہے اور ذبح کرنے کا معنی یہ ہے کہ حلقوم کو نصیل کے پاس سے اس کے اندر سے کاٹنا اور نصیل وہ جوڑ ہے جو دو جبڑوں کے نیچے گردن اور سر کے درمیان ہوتا ہے، پس جب حلقوم اور اس کے پاس موجود رگیں کاٹ دی جائیں تو ذبح کا معنی ثابت ہوگا اور وہ سری کو ابتدا میں کاٹنے گا اس کے سبب دوسری، بلعوم اور ودجین کو کاٹے گا اور ودجان وہ دو شہ رگیں ہیں جو حلقوم اور سری کے دائیں اور بائیں جانب واقع ہیں جن میں خون کا دوران رہتا ہے۔ حدیث ابی امامہ میں ہے کہ ایک باندی اپنے آقا حضرت عقدیہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے حکم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اس نے ایک پتھر سے بکری کو ذبح کیا تھا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ھل افریت الاوداج یعنی کیا تم نے اس کی رگیں کاٹ کر خون نکال دیا تھا؟ اس نے کہا کہ جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز بھی رگیں کاٹ دے اس کو کھالو۔[1]

---

[1] [معجم الطبرانی ۲۱۱/۸]

جب عقدہ کے اوپر سے کاٹ ڈالے تو وہ حلال ہوگا کیونکہ اس نے چار میں سے تین کو کاٹ دیا ہے اور اگر عقدہ کے نیچے سے کاٹا اور اس کو سر کے تابع کیا تو اس نے چاروں رگیں کاٹ دیں اور یہ زیادہ مکمل ہے۔

جو رگیں ذبح میں کاٹی جاتی ہیں وہ چار یہ ہیں: حلقوم، مری اور دو جان (دو شہ رگیں) اگر ذبح کرنے والا ان سب کو کاٹ دے تو کھانا حلال ہوگا اور اگر تین رگیں کاٹ دیں تب بھی یہی حکم ہے، ہر اس چیز سے ذبح کرنا جائز ہے جو چیز رگیں کاٹ دے اور خون کو نکال دے لیکن اپنی جگہ لگے ہوئے دانت اور ناخنوں سے ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کل ہمارا دشمن سے ٹکراؤ ہے، ہمارے پاس چھری نہیں ہے تو کیا ہم پتھر اور لاٹھی کے ٹکڑے سے ذبح کر سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو چیز خون کو نکال دے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ، جبکہ وہ دانت اور ناخن نہ ہو اور میں تم سے اس کی وجہ بیان کرتا ہوں، وہ یہ کہ دانت تو ایک ہڈی ہے اور ناخن حبشیوں کی چھری ہے۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانت اور ناخن کو اس لیے مستثنیٰ کیا کہ حبشی لوگ ان دونوں چیزوں سے جبکہ وہ اپنی جگہ لگے ہوئے ہوں۔ جانور ذبح کیا کرتے تھے نیز اس لیے کہ ان دونوں چیزوں سے جبکہ وہ اپنی جگہ لگے ہوئے ہوں، جانور کو ہلاک کرنا آدمی کی قوت سے ہی ممکن ہے، پس یہ منخنقہ کے مشابہ ہوا جو جانور مانوس ہوں ان کی ذکاۃ ذبح ہے کیونکہ وہ اس کو ذبح کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

(۲) ذبح اضطراری یہ ہے کہ کسی بھی جگہ پر زخم لگانا اور ذبح اضطراری اس وقت جائز ہے جب ذبح اختیاری سے عاجز ہو اور یہ شکار اور وحشی اونٹ کے مثل ہے لہٰذا اگر ایسے جانور کے تیر مارا اور اس تیر نے اس کو ہلاک کر دیا تو اس کا کھانا حلال ہوگا کیونکہ جب ذبح کرنا عجز کی بنا پر دشوار ہو تو اس وقت غیر بوح کو زخمی کرنا ہی ذبح کے قائم مقام ہوتا ہے۔

شہر یا جنگل میں بدک جانے والا اونٹ اور گائے شکار کی مانند ہے، جنگل کی بکری کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر شہر میں بکری وحشی ہوگئی تو اس کو ذبح کیے بغیر کھانا حلال نہیں ہوگا کیونکہ اس کو پکڑنا ممکن ہے لیکن گائے اور اونٹ کا مسئلہ اس کے خلاف ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اونٹ اسے کاٹ لے اور گائے سینگ مار دے، پس اس میں عجز ثابت ہوگا جو جانور کنوئیں میں گر جائے اور

---

[1] [سنن ابی داؤد [۱۰۲/۳]

اس کو رگیں کاٹ کر ذبح کرنا ممکن نہ ہو تو وہ بھی شکار کی شکل ہے۔ اس لیے کہ پانی کے سبب اس کی ہلاکت کا وہم نہ کیا جائے گا۔

جو چوپائے وحشی ہوں ان کی ذکاۃ نیزہ مارنا اور زخمی کرنا ہے کیونکہ اس میں عجز کا تحقق ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بھیڑیے نے ایک بکری کو دانتوں سے کاٹا تو لوگوں نے اس بکری کو پتھر سے ذبح کر دیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کی اجازت دے دی۔

ذبح کے صحیح ہونے کی شرطیں

(۱) تسمیہ کہنا (۲) ذبح کرنے والے کا مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہونا، تسمیہ کی دلیل یہ آیت ہے: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ [الحج: ۳۶] اور تسمیہ بوقت ذبح شرط ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا [الحج: ۳۶] یعنی ذبح کے بعد جب جانور گر جائے۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اور جو تم اپنے معلم کتے کے ساتھ شکار کرو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لو تو پھر اس کو کھاؤ۔[1]

نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''جب تم اپنے معلم کتوں کو (شکار پر) چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کا نام لے لو تو جو وہ تمہارے لیے (شکار) روک لیں اس میں سے کھاؤ۔''[2]

پس اگر عمداً تسمیہ ترک کیا تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا، اس کی دلیل یہ فرمان ہے:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ﴾ [الانعام: ۱۲۱]

''اور جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو مت کھاؤ وہ گناہ ہے۔''

اس بارے میں صدر اول سے کوئی اختلاف منقول نہیں ہے ہاں البتہ متروک التسمیہ ناسیا کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا مذہب یہ ہے کہ وہ حرام ہے اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس سے اس کی حلت منقول ہے۔

بنابریں امام ابو یوسف اور دیگر مشائخ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ متروک التسمیہ عامداً کے بارے میں تو کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر قاضی بھی اس کی بیع کے جواز کا فیصلہ دے دے

---

[1] [صحیح البخاری ۱۱۸۷] [2] [صحیح البخاری ۱۱۸۹]

تو وہ نافذ العمل نہ ہوگا کیونکہ یہ اجماع کے خلاف ہے، اس لیے کہ وہ مردار ہے کہ اس پر عمداً اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ البتہ ہمارے ہاں تارک التسمیہ ناسیاً کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ اس کو حرام قرار دینے میں حرج عظیم لازم آتا ہے کیونکہ ایسا کوئی انسان بہت ہی کم ہوگا جو نہ بھولتا ہو پس اس کا اعتبار کرنے میں حرج لازم آئے گا اور حرج والی چیز کو دور کیا جائے گا۔

نیز بھولنے والا مرفوع القلم ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿رفع عن امتی الخطاء والنسان وما استكرهوا عليه﴾: "یعنی میری امت سے خطا و نسیان (بھول چوک) اور وہ کام اٹھالیا گیا ہے جس کام پر ان کو مجبور کیا گیا ہو۔"[1]

معلوم ہوا کہ بھولنے والے نے ذبح کرتے وقت کوئی فرض ترک نہیں کیا جبکہ عمداً تسمیہ ترک کرنے والے کا مسئلہ اس کے خلاف ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک قوم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں تو ہم کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿سموا علیه انتم وكلوه﴾: "یعنی تم اس پر بسم اللہ پڑھو اور اسے کھالو۔"[2]

ذبح اختیاری میں ذبح کرتے وقت تسمیہ علی المذبوح شرط ہے، پس اگر کسی نے بکری کو زمین پر لٹایا اور اس پر بسم اللہ پڑھی، پھر اسے کوئی اور کام پیش آگیا اور اس نے اس کو ذبح نہ کیا، پھر کسی اور بکری کو اسی تسمیہ کے ساتھ ذبح کردیا تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے اور اگر بکری کو نیچے لٹایا اور تسمیہ پڑھی، پھر ایک چھری سے زخمی کیا اور دوسری چھری سے ذبح کیا تو اس کا کھانا حلال ہوگا کیونکہ یہ تسمیہ، مذبوح پر ہوئی ہے۔ اور شکار میں تسمیہ شکاری جانور چھوڑتے وقت اور تیر چلاتے وقت شرط ہے، پس اگر کسی نے شکار کے تیر مارا اور اس نے تسمیہ بھی کہی اور وہ تیر کسی اور کو لگا تو وہ شکار حلال ہوگا اور اگر ایک تیر کو مارتے وقت تسمیہ کہی پھر کوئی اور تیر شکار پر چلایا تو اس کو نہ کھایا جائے گا۔ اگر اپنے معلم کتے کو چھوڑتے وقت تسمیہ کہی، پھر کوئی دوسرا کتا چھوڑ دیا، پس وہ شکار کو لے آیا تو اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا کیونکہ شکار میں تسمیہ آلہ رمی پر شرط ہے۔ پس اگر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا مثلاً یوں کہے کہ اللهم اغفرلی "اے اللہ میری مغفرت فرما۔"

اگر تسمیہ کے ارادے سے الحمد للہ کہا یا سبحان اللہ کہا تو حلال ہوگا اگر چھینکنے کے بعد

---

[1] [جامع الاحادیث ۴/۴۴۳] [2] [صحیح البخاری ۱۱۹۱]

الحمدللہ کہا تو صحیح روایت کے مطابق حلال نہ ہوگا۔

جانور ذبح کرتے وقت جو دعا زد عام ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے اور وہ دعا یہ ہے: ''بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر، اللّٰھم منک والیک

اللہ کے نام پر کسی اور کے نام کا عطف نہ کرے مثلاً یوں کہے کہ باسم اللہ و فلان یا یوں کہے کہ بسم اللہ و محمد رسول اللہ کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: جودوا التسمیۃ یعنی تسمیہ کو غیر سے خالی کرو۔

دوسری شرط (ذبح کرنے والے کا مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہونا) کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ [المائدہ:۵]: ''اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔''

ذبح کرنے والے شخص کا ذبیحہ اس وقت حلال ہوگا جب وہ تسمیہ اور ذبح کی حقیقت کو سمجھتا ہوں، خواہ وہ بچہ یا مجنوں یا عورت ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ تسمیہ اور ذبح کی حقیقت کو نہیں جانتا تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا کیونکہ ذبیحہ پر تسمیہ کی شرط نص سے ثابت ہے اور ذبح پر قدرت ہونا بھی ایک مقصد ہے۔

پس اگر کتابی نے تسمیہ کہتے ہوئے یوں کہا باسم المسیح (مسیح کے نام سے) اور ذبح کر دیا اور مسلمان نے اس کو سنا تو اس کا کھانا درست نہیں ہے اور اگر اس نے باسم اللہ کہا اور اس (اللہ) سے مسیح علیہ السلام مراد لیتا ہے تو ظاہر پر بنا کرتے ہوئے اسے کھایا جائے گا۔

اگر کتابی نے بھول کر تسمیہ چھوڑ دی تو اس کا ذبیحہ بھولنے والے مسلمان پر قیاس کرتے ہوئے حلال ہوگا اور اگر کتابی نے عمداً تسمیہ چھوڑ دی تو وہ جانور مردار ہے اسے کھانا حلال نہیں ہوگا۔

کس کا ذبح حرام ہے؟

(۱) مجوسی کا ذبیحہ حلال نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے جانور ذبح کیا اور بسم اللہ کہنا بھول گیا، پوچھا گیا تو فرمایا کہ اس کا ذبیحہ کھایا جائے اور مجوسی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ ذبح کرے اور بسم اللہ کہنا بھول جائے تو فرمایا کہ نہ کھاؤ۔[1]

---

[1] [المستدرک ۴/۲۳۳]

(۲) مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی مذہب ہی نہیں۔ مسلمان اگر کفریہ کلمہ کہے، دین وملت کو گالی دے اور بازاری زبان استعمال کرے، حرام کو حلال جانے تو وہ بھی مرتد ہو جاتا ہے، اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

(۳) بت پرست اور غیر اللہ کے پوجنے والوں کا ذبیحہ بھی حلال نہیں ہے۔

(۴) حج یا عمرہ کا محرم (احرام باندھنے والا) کا ذبیحہ بھی حلال نہیں ہے یعنی جب وہ حرم کا کوئی جانور شکار کرے تو وہ مردار ہے اور حرم میں مطلق ذبح کرنے کے بارے میں حلال اور حرام یکساں ہے۔

ذبح کے متعلق مستحب امور

(۱) ذبح کرنے والے شخص کے لیے مستحب ہے کہ وہ جانور کو لٹانے سے پہلے اپنی چھری کو تیز کرلے، اس کی دلیل شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان (اچھے طریقہ سے انجام دینا) کو فرض کیا ہے، پس جب تم قتل کرو تو اچھے طریقہ سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو اور اپنی چھری کو تیز کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔''[1]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے ذبح کے ارادہ سے بکری کو لٹایا اور اپنی چھری تیز کرنے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اس بکری کو کئی بار مارنا چاہتے ہو؟ تم نے اس کو لٹانے سے پہلے اپنی چھری کو تیز کیوں نہیں کرلیا۔''[2]

(۲) ذبح کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ اس کی چھری جب نخاع (گلے کی ہڈی کا گودا) تک پہنچے تو جانور کے ٹھنڈا ہونے سے قبل اس کا سر نہ کاٹے۔

پس اسے چاہیے کہ نخاع سے تجاوز نہ کرے اور اس کا سر نہ کاٹے کیونکہ اس میں بلا فائدہ جانور کو زیادہ تکلیف پہنچتا ہے اور یہ بات ممنوع ہے البتہ ذبیحہ حلال ہوگا کیونکہ فعل کی کراہت موجب تحریم نہیں ہوتی۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ جانور کو نخاع تک ذبح کیا جائے۔[3]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع

۱۔ صحیح مسلم: ۱۵۴۸ ۲۔ المستدرک ۲۳۱/۴ ۳۔ السنن الکبریٰ للبیہقی ۲۸۰/۹

فرمایا کہ دم نکلنے سے پہلے اس کی گردن توڑ دی جائے۔[1]

(۳) اونٹ میں نحر مستحب ہے یعنی لبہ (سینہ کے اوپر کی ہڈی) سے ذبح کرنا کیونکہ اس جگہ اس کی تمام رگیں موجود ہوتی ہیں۔ پس اگر ان کو گردن کے نیچے سے ذبح کیا گیا تو جائز ہے لیکن مخالفت سنت کی وجہ سے مکروہ ہوگا۔

بکری کو گدی کی طرف سے ذبح کرنا

اگر بکری کو گدی کی طرف سے ذبح کیا تو اگر وہ زندہ رہی اتنی دیر کہ اس نے رگیں کاٹ دیں تو جائز ہے کیونکہ اس کی موت ذبح سے ہوئی اور مکروہ ہے کیونکہ اس میں اس کو بلاضرورت زدہ تکلیف دی گئی ہے اور اگر رگیں کاٹنے سے پہلے مرگئی تو نہیں کھائی جائے گی کیونکہ اس کی موت ذبح سے نہیں ہوئی۔

گائے، اونٹنی یا بکری وغیرہ ذبح کی گئی اور اس کے پیٹ میں مردہ بچہ پایا گیا تو اسے نہ کھایا جائے گا۔ اگرچہ اس کی خلقت پوری ہو چکی ہو۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ [المائدہ:۳] میتہ کہتے ہیں اس جانور کو جو طبعی موت مر چکا ہو اور یہ معنی جنین میں موجود ہیں کیونکہ وہ اپنی ماں کے مرنے کی وجہ سے نہیں مرا کیونکہ ماں کبھی مر بھی جاتی ہے اور اس کا بچہ اس کے پیٹ میں زندہ ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بچہ کی حیات کا اپنی ماں کی حیات سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا ماں کی زکاۃ بچہ کی زکاۃ شمار نہیں ہوگی اور وہ مستقل خون دار جانور ہے اور ذبح کا مقصد خون ہی زائل کرنا ہے۔ مقصد ماں کے ذبح ہو جانے سے حاصل نہیں ہوتا، رہی حدیث مبارک کہ "ذكاة الجنين ذكاة امه"[2]

سو وہ تشبیہ پر محمول ہے یعنی زکاۃ جنین زکاۃ ام کی مانند ہے وجہ یہ ہے کہ روایت میں لفظ "زکاۃ امہ" مرفوع اور منصوب دونوں طرح مروی ہے۔

صاحبین اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کی خلقت پوری ہو چکی ہو تو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا کھانا جائز ہے ورنہ نہیں کیونکہ حدیث میں ہے: ذكاة الجنين ذكاة امه" یعنی جنین کی زکاۃ اس کی ماں کی زکاۃ ہے۔[3]

---

[1] المعجم الطبرانی ۱۲/۱۹۲ [2] سنن ابی داؤد ۳/۱۰۳ [3] المعجم الطبرانی ۳/۱۹۴

ماکول اور غیر ماکول جانوروں کے احکام

کچلیوں والے درندے جو دانتوں سے شکار کر کے کھاتے ہیں اور پنجہ گیر پرندے جو اپنے چنگل سے شکار کرتے ہیں، ان کا کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی دار درندوں اور پنجہ گیر پرندوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔[1]

کچلی دار درندے یہ ہیں: چیتا، بھیڑیا، لومڑی، ریچھ، ہاتھی، بندر، ہر قسم کی بلی، شیر، چوہا، نیولا وغیرہ۔

اور پنجہ گیر پرندے یہ ہیں: باز، شکرہ، شاہین، گدھ، چیل، عقاب۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطفہ، نہبہ اور مجثمہ کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔

خطفہ وہ پرندہ جو ہوا میں اچکتا ہو جیسے باز۔ اور نہبہ وہ جانور جو زمین پر کسی کو نشانہ بناتا ہو جیسے کتا، بھیڑیا۔ اور مجثمہ ہر وہ شکار جس کو نشانہ بنا کر مار دیا جائے۔

حنفیہ کے نزدیک بجو کھانا حرام ہے کیونکہ وہ کچلی دار جانور ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلی دار جانور کے شکار سے منع فرمایا ہے اگرچہ بجو کے شکار ہونے کے بارے میں صحیح حدیث وارد ہوئی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بجو کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ شکار ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ، سائل نے پوچھا کہ کیا اس کو کھا سکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں، پھر پوچھا کہ کیا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔[2]

اسی طرح بجو کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اسے نہ کھایا جائے چنانچہ حضرت خزیمہ بن جزء کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بجو کے کھانے کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کیا کوئی بھلا آدمی بجو بھی کھاتا ہے۔"[3]

اب ان دونوں حدیثوں میں تعارض آیا اور قاعدہ ہے کہ اذا تعارضا تساقطا یعنی جب دو چیزیں باہم متعارض ہوں تو دونوں ساقط الحکم ہو جاتی ہیں۔ پس بجو کا ذی ناب (کچلی دار) ہونا باقی رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ذی ناب کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن یزید السعدیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے دریافت کیا کہ

---

[1] [صحیح مسلم ۱۵۳۴/۳]　[2] السنن الترمذی ۱۹۲/۳]　[3] [ایضاً]

میری قوم کے کچھ لوگ جو کھاتے ہیں! تو انہوں نے فرمایا کہ اس کا کھانا حلال نہیں ہے۔
گھریلو گدھے اور خچروں اور گھوڑوں کا کھانا حلال نہیں ہے اس کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً﴾ [النحل:۸]

یہ آیت کریمہ احسانات جتانے کے ذیل میں لائی گئی ہے اگر ان کا کھانا جائز ہوتا تو اس (کھانے) کا ذکر ہوتا کیونکہ کھانے کی نعمت سواری کی نعمت سے عظیم تر ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، اس کی دلیل خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں "خچروں اور گدھوں کے (گوشت) کھانے سے منع فرمایا"۔[1]

امام صاحبؒ کے یہاں گھوڑے کے کھانے کی کراہت، کراہت تحریمیہ ہے۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ گھوڑے کا گوشت حلال ہے، ان کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گھوڑوں کے گوشت کھائے اور گدھوں کے گوشت (کے کھانے) سے منع فرمایا"۔[2]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک گوہ بھی حلال نہیں ہے ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراہت کی وجہ سے اس کو نہیں کھایا۔"

نیز گوہ سے طبیعت میں کراہت پیدا ہوتی ہے۔

"الاختیار" کے مصنفؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ گوہ بطور ہدیہ کے بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کی گئی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے سے اجتناب کیا، پھر ایک سائلہ آئی، حضرت عائشہؓ نے اسے کھانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کیا تم اسے وہ چیز کھلاتی ہو جو تم خود نہیں کھاتیں؟۔[3]

گدھ اور گدھ نما سفید و سیاہ دھبوں والا پرندہ، سیاہ کوا اور پہاڑی کوا، یہ سب حرام ہیں کیونکہ یہ سب مردار کھاتے ہیں لہٰذا خبائث میں داخل ہوں گے۔

تمام حشرات الارض کا کھانا جائز نہیں یعنی خواہ آبی ہوں یا بری جیسے مینڈک، بچھو، چوہا، کیکڑا، چھپکلی، سیہ وغیرہ محرم پر ان کے مار دینے میں کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔

---

[1] سنن ابی داود ۳/۳۵۲ [2] سنن الترمذی ۳/۱۲۳ [3] الاختیار ۵/۱۵

سیہہ کا کھانا اس لیے حرام ہے کہ عیسیٰ بن نمیلہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان سے کسی نے سیہہ (خاردار جانور) کے بارے میں دریافت کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا﴾ [الانعام ۱۴۵]: ''آپ فرما دیں کہ جو احکام میری طرف وحی کیے گئے ہیں ان میں میں کوئی حرام چیز نہیں پاتا۔''

(راوی) کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک بزرگ بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس (سیہہ) کا ذکر آیا تھا، آپ نے فرمایا: ''خبيثة من الخبائث'' یعنی ''یہ خبائث میں سے ایک خبیثہ ہے'' ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان فرمائی ہے تو ایسا ہی ہوگا۔[1]

چھپکلی اور چوہے کا کھانا اس لیے حرام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حل و حرم میں اس کے مار ڈالنے کا حکم دیا ہے اور کیکڑا کی حرمت اس روایت سے ثابت ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ السلام نے کیکڑے کی بیع سے منع فرمایا۔[2]

مینڈک کی حرمت عبدالرحمن بن عثمان کی روایت سے ثابت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک طبیب نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے دوا میں مینڈک کے استعمال کی بابت دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مینڈک کے مار ڈالنے سے منع فرمایا۔ [سنن البیہقی ۹/۲۵۸]

دریائی جانوروں میں مچھلی کے سوا اور کچھ نہ کھایا جائے یعنی مچھلی کے علاوہ اور کوئی جانور حلال نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ [الاعراف: ۱۵۷] اور مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں کو طبائع سلیمہ مکروہ جانتی ہیں اور ان سے گھن کھاتی ہیں۔ نیز اس لیے کہ دریائی جانور میتہ (مردار) ہے جس کی حرمت نص سے ثابت ہے اور مچھلی کی حلت نص کی وجہ سے ہے۔ وہ یہ حدیث ہے کہ: يحل من الميتة اثنان، ومن الدم اثنان، فاما الميتة فالسمك والجراد واما الدم فالكبد والطحال ''یعنی مردار میں سے دو چیزیں حلال ہیں اور خون بھی دو طرح کا حلال ہے مردار تو مچھلی اور ٹڈی ہے اور خون کلیجی اور تلی ہے۔''[3]

سمک طافی جو بلا آفت اپنی موت مرکر پانی کی سطح پر آ گئی ہو اور اس کا پیٹ آسمان کی طرف ہو، وہ حلال نہیں ہے اگر اس کی پشت آسمان کی طرف ہو تو وہ اس حکم میں شامل نہیں ہے، اس کا کھانا حلال ہے، اس کی دلیل حضرت ابوالزبیر کی روایت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے

---

[1] سنن ابی داؤد ۳/۳۵۴ [2] نصب الرایۃ ۴/۲۰۱ [3] نصب الرایۃ ۴/۲۰۲

تھے کہ جس کو دریا پھینک دے یا اس کا پانی خشک ہو جائے یا اس میں شکار کیا جائے وہ کھاؤ اور جو اس میں مر کر پانی کی سطح پر آ جائے اسے مت کھاؤ۔[1]

نیز مروی ہے کہ "جس مچھلی کو دریا پھینک دے یا اس کا پانی خشک ہو جائے اسے کھاؤ اور جو پانی کی تپش یا ٹھنڈک سے مر جائے یا پانی میں کوئی چیز ڈالنے سے مر جائے اور اس کی موت کسی آفت سے ہے اسے کھایا جائے گا جیسا کہ اگر دریا اس کو پھینک دے تو کھانا حلال ہوتا ہے۔

اس پر حدیث جابر رضی اللہ عنہ بھی دلیل ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جیش خبط میں شریک تھے اور ہمارے امیر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح تھے، ہمیں بہت شدید بھوک لگی، تھوڑی دیر کے بعد دریا نے ایک ایسی مردہ مچھلی پھینکی جس کے مثل دیکھا نہیں گیا تھا، اس کو عنبر کہا جاتا ہے، ہم نے اس مچھلی کو نصف ماہ تک کھایا۔ الحدیث[2]

جو کوا دانے چگتا ہو مردار نہ کھاتا ہو اس کو کھانے میں حرج نہیں ہے۔

خرگوش کا کھانا بھی جائز ہے کیونکہ خرگوش نہ تو درندوں میں سے ہے اور نہ ہی مردار خور جانوروں میں سے ہے، پس وہ ہرن کے مشابہ ہوا، اس کی حلت کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مر الظہران کے مقام پر ہمیں ایک خرگوش ملا، صحابہ اس کے پیچھے دوڑے، میں نے اس کو پکڑ لیا اور اسے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا، انہوں نے اس کو تیز پتھر سے ذبح کیا، پھر مجھے اس خرگوش کی ران یا سرین کا حصہ دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا۔[3]

ٹڈی کو کھانا جائز ہے اور اس میں ذبح کی بھی ضرورت نہیں، اس کی دلیل حضور علیہ السلام کا یہ فرمان ذی شان ہے۔ یحل من المیتة اثنتان ومن الدم اثنان فاما المیتة فالسمک والجراد "یعنی مردار میں سے دو چیزیں اور خون میں سے بھی دو چیزیں حلال ہیں، مردار میں سے تو ایک مچھلی ہے اور دوسری ٹڈی ہے۔"

---

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/۲۵۵ [2] السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/۲۵۱ [3] سنن الترمذی ۳/۱۶۰

اضحیہ کے احکام

اضحیہ ہمزہ کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے، اس کی جمع اضاحی آتی ہے، اس کو ضحیہ بھی کہتے ہیں جس کی جمع ضحایا آتی ہے۔ نیز اس کو اضحاۃ بھی کہتے ہیں، ہمزہ کے فتح کے ساتھ اس کی جمع اضحٰی ہے، عید الاضحٰی کا لفظ اسی سے ماخوذ ہے۔ اضحیہ دراصل اس جانور کو کہتے ہیں جو وقت ضحٰی (چاشت کے وقت) ذبح کیا جاتا ہے۔ پھر یہ لفظ اتنا زیادہ استعمال ہوا کہ اس جانور کا نام ہو گیا جو ایام ضحٰی میں کسی بھی وقت ذبح کیا جائے۔ اصطلاح شرع میں وہ مخصوص جانور ہے جو بہ نیت قربت خاص وقت میں ذبح کیا جائے اور چوپاؤں میں سے وہ جانور اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری وغیرہ ہیں۔ ''الواقعات'' میں ہے کہ دس روپے کا قربانی کا جانور خریدنا ہزار روپے صدقہ خیرات کرنے سے زیادہ افضل اور بہتر ہے کیونکہ وہ قربت جو خون بہا کر حاصل ہوتی ہے وہ صدقہ خیرات سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

قربانی کا حکم

قربانی ہر مقیم مالدار مسلمان پر قربانی کے دنوں میں واجب ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، حضرت حسنؒ، امام زفرؒ کے ہاں اور امام ابو یوسفؒ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ''جس کے پاس مال ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں ہرگز نہ آئے۔''[1]

اس حدیث مبارک میں قربانی نہ کرنے والے پر وعید کا ذکر ہے اور وعید ترک واجب پر ہی ہوتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام شافعی رحمہا اللہ فرماتے ہیں کہ قربانی سنت مؤکدہ ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کسی کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔''[2]

اس حدیث میں ارادے کے ساتھ حکم کو معلق کیا گیا ہے اور ارادے کے ساتھ معلق کرنا وجوب کے منافی ہے۔ ظاہر الروایۃ میں یہ ہے کہ قربانی ہر آدمی پر اپنی طرف سے واجب ہے اور فتویٰ اس پر ہے۔ صدقہ فطر کا مسئلہ اس کے خلاف ہے کہ صدقہ فطر اس پر بھی واجب ہے اور

[1] [المستدرک ۴/۲۳۲] [2] [صحیح مسلم ۳/۱۵۶۵]

اس کی زیر عیال اولاد کی طرف سے بھی واجب ہے۔ امام ترمذیؒ نے عطاء بن یسارؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہر آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر کے افراد کی طرف سے بکری کی قربانی کرتا تھا، پھر وہ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔"[1]

امام صاحبؒ سے حسن بن زیادؒ کی روایت یہ ہے کہ قربانی اپنی طرف سے بھی اور اپنی چھوٹی اولاد کی طرف سے بھی واجب ہے، پس چھوٹے بچوں میں سے ہر ایک کی طرف سے ایک بکری یا سات کی طرف سے اونٹ یا گائے ذبح کرے گا۔

اگر قربانی کے ارادے سے گائے خریدی، پھر اس کے ساتھ چھ اور افراد شریک ہو گئے اور ان لوگوں کا قربت کا ارادہ ہو تو جائز ہے اور اگر ان میں سے کسی کا بھی گوشت کھانے کا ارادہ ہو یا وہ نصرانی ہو تو جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہر ایک کا مقصد قربت وعبادت ہو اور خون ریزی میں تجزی ممکن نہیں کہ اس کا کچھ حصہ تو قربت ہو اور کچھ حصہ قربت نہ ہو لہٰذا جب اس کا کچھ حصہ قربت نہ رہا تو باقی حصہ بھی قربت سے خارج ہو جائے گا۔

گائے اور اونٹ میں شرکت کے جواز پر دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ حج کا احرام باندھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں شریک ہو جائیں، ہم میں سے ہر سات آدمی بدنہ میں شریک ہوں۔"[2]

سات افراد سے کم ہوں تو بطریق اولیٰ جائز ہوگا البتہ سات سے زیادہ جائز نہیں ہے۔

اگر چھوٹے بچہ کا مال ہو تو اصح یہ ہے کہ اس کے مال میں بالاجماع قربانی واجب نہیں ہے کیونکہ قربانی ایک قربت ہے، پس وہ اس کا مخاطب نہ ہوگا نیز اس کیلئے اراقت دم واجب ہے۔

فقیر اور مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے، فقیر پر واجب نہ ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، مسافر پر اس لیے واجب نہیں ہے کہ قربانی کی ادائیگی ایسے اسباب کے ساتھ مخصوص ہے جو اسباب مسافر کے لیے بارگراں ہوں گے اور قربانی وقت کے گزرنے پر فوت ہو جاتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مسافر پر نہ جمعہ واجب ہے اور نہ ہی قربانی"[3]

---

[1] سنن الترمذی ۳/۳۱] [2] صحیح مسلم ۲/۹۵۵] [3] نصب الرایۃ ۴/۲۱۱]

قربانی کا وقت

قربانی کا وقت یوم نحر کی طلوع فجر سے شروع ہو جاتا ہے لیکن اہل شہر کے لیے قربانی کرنا (ذبح کرنا) جائز نہیں، جب تک کہ امام عید کی نماز نہ پڑھا دے البتہ گاؤں والے طلوع فجر کے بعد قربانی کر سکتے ہیں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہماری جیسی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہماری جیسی قربانی کرے تو وہ قربانی کا جانور ذبح نہ کرے جب تک کہ نماز (عید) نہ ادا کر لے۔''[1]

نیز آنحضور ﷺ نے فرمایا ''جو شخص نماز سے قبل قربانی کرے تو اس نے اپنے لیے اسے ذبح کر لیا ہے اور جس نے نماز کے بعد ذبح کیا تو اس کی قربانی مکمل ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کے طریقہ کو پا لیا۔'' (ایضاً) پھر اس بارے میں قربانی کی جگہ کا اعتبار کیا گیا ہے لہٰذا اگر قربانی کا جانور گاؤں میں تھا اور قربانی کرنے والا شہر میں ہے تو طلوع فجر کے بعد قربانی کرنا جائز ہے اگر اس کے برعکس ہو تو نماز عید کے بعد ہی جائز ہو گا۔

قربانی تین دن میں جائز ہے، ایک یوم نحر اور دو دن اس کے بعد کے ہیں، اس کی دلیل حضرت نافع کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قربانی یوم اضحیٰ کے بعد دو دن ہیں۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: ''قربانی نحر کے بعد دو دن ہیں''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''قربانی یوم اضحیٰ کے بعد دو دن ہیں۔''[4]

سب سے افضل پہلا دن ہے، اگر قربانی نہیں کی یہاں تک کہ قربانی کے دن گزر گئے تو اگر اس نے اپنے اوپر واجب کی تھی یا فقیر تھا اور اس نے قربانی کا جانور خریدا تھا تو اسے زندہ ہی صدقہ کیا جائے گا اور اگر وہ مالدار ہے تو بکری کی قیمت صدقہ کرے گا خواہ اس نے خریدا ہو یا نہ خریدا ہو۔

---

[1] [صحیح مسلم ۱۵۵۳/۳] [2] [الموطأ ۳۲۲/۱] [3] [سنن البیہقی ۲۹۷/۹] [4] [ایضاً]

قربانی کے جانور کی صفات

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگ دار سیاہ وسفید رنگ کے دو مینڈھے قربان کیے''۔[1]

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگ والا طاقتور مینڈھا قربانی میں ذبح کیا''۔[2]

قربانی کے جانور کا ہر عیب سے سالم ہونا ضروری ہے لہٰذا ایسا جانور جو اندھا ہو اور اس کا اندھا پن ظاہر ہو یا لنگڑا ہو اور اس کا لنگڑا پن ظاہر ہو یا بیمار ہو اور اس کا بیمار پن ظاہر ہو یا لاغر اور دبلا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ایسے جانور کی قربانی کافی نہ ہوگی جس کا کان یا دم ناقص ہو اور اس جانور کی قربانی بھی جائز نہیں جس کا اکثر کان یا دم کٹی ہوئی ہو۔ اگر اس کا اکثر کان یا دم باقی ہو تو جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''چار طرح کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے، ایسا اندھا جس کا اندھا پن ظاہر ہو، ایسا بیمار کہ اس کی بیماری ظاہر ہو، ایسا لنگڑا کہ اس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور ایسا دبلا کہ اس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو''۔[3]

نیز حضرت عتبہ بن عبدالسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستاصلہ، بخقاء، مشیعہ اور کسراء اور مصفرہ (کی قربانی) سے منع فرمایا۔ مستاصلہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کا سینگ جڑ سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ بخقاء اس جانور کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ اندھا ہو، بخق اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ آنکھ کی بینائی ختم ہو جائے اور آنکھ اپنی جگہ کھلی کی کھلی باقی رہ جائے۔ اور مشیعہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کو ہانکا جائے یہاں تک کہ وہ بھیڑ بکریوں کے ساتھ شامل ہو جائے اور وہ لاغر اور دبلا جانور ہے۔[4]

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جانور کی قربانی کرنے سے منع فرمایا جس کا کان اور سینگ کٹا ہوا ہو۔[5]

حضرت سعید بن المسیبؒ نے حدیث ہذا میں موجود لفظ ''عضباء'' کی تفسیر اس جانور سے کی ہے جس کا کان نصف اور اس سے زیادہ کٹا ہو، پس جب نصف کان موجود نہ ہوگا تو وہ اکثر شمار ہوگا۔ صاحبینؒ کے قول کے مطابق ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے اور سینگ اگر ٹوٹا

---

[1] [صحیح مسلم ۳/۱۵۵۶] [2] [سنن الترمذی ۳/۸۷]

[3] [سنن ابی داؤد ۳/۹۷] [4] [سنن ابی داؤد ۳/۹۸]

ہوا ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق اس کی قربانی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسے جانور کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "لا یضرک" یعنی اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

جس جانور کے کان پیدائشی طور پر ہی نہ ہوں اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔

ان عیوب سے متصف جانوروں کی قربانی اس وقت ناجائز ہے جب یہ عیوب خریداری کے وقت موجود ہوں لیکن اگر خریداری کے وقت وہ جانور ان عیوب سے پاک تھا پھر بعد میں کوئی مانع عیب اس میں آگیا تو اگر مالدار ہے تو اس میں دوسری قربانی واجب ہوگی اور اگر فقیر ہو تو یہی کافی ہو جائے گی' کیونکہ مالدار پر قربانی کا وجوب ابتداء ہی میں حکم شرع کی بنا پر ہوا ہے۔ خریدنے کی بنا پر نہیں ہوا لہذا اس کی قربانی متعین نہیں ہوگی اور فقیر پر اس کا وجوب بہ نیت قربانی اس کے خریدنے کی وجہ سے ہوا ہے لہذا اس کی قربانی متعین ہوگئی، پس جب قربانی کا جانور مر جائے تو فقیر سے تو وجوب ساقط ہو جائے گا لیکن مالدار سے ساقط نہ ہوگا۔

کن جانوروں کی قربانی جائز ہے؟

جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں اس کی قربانی جائز ہے اور خصی کی قربانی بھی جائز ہے۔ خصی اس جانور کو کہتے ہیں جس کے خصیتین نکال دیے گئے ہوں۔ اس کی دلیل سیدہ عائشہؓ یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کرتے تو ایسے مینڈھے منگواتے جو خوب موٹے موٹے ہوتے جس کے خصیتین نکالے گئے ہوتے اور وہ سیاہ و سفید رنگ کے سینگ دار ہوتے۔ ان میں سے ایک مینڈھا اپنی امت کی طرف سے کرتے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتے ہوں اور دوسرا مینڈھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کرتے۔"[2]

دیوانہ جانور جو چارہ کھاتا ہو اس کی قربانی بھی جائز ہے کیونکہ وہ مقصود میں مخل نہیں ہے اگر چارہ نہ کھاتا ہو تو جائز نہیں ہے۔ خارشی جانور اگر موٹا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے اور اگر دبلا اور لاغر ہو تو ناجائز ہے جس جانور کے دانت نہ ہوں اس کی قربانی بھی جائز ہے، امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس میں کثرت اور قلت کا اعتبار کیا ہے، پس اگر اتنے دانت باقی ہوں جن سے چارہ کھانا اس کے لیے ممکن ہو تو جائز ہے۔ چھوٹے کان والے جانور کی

---

[1] [سنن البیہقی ۹/۲۷۵] [2] [سنن البیہقی ۹/۲۷۳]

قربانی جائز ہے، اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''حضرت ابن عباس چھوٹے کان والے جانور کی قربانی میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔''[۱]

قربانی کے جانور کی عمر

پنج سالہ اونٹ، دو سالہ گائے، بیل بھینس، ایک سالہ بھیڑ بکری کی قربانی درست ہے البتہ بھیڑ دنبہ میں چھ ماہ کا پٹھا بھی جائز ہے بشرطیکہ فربہ اور قد آور ہو کہ اگر سال بھر والوں میں چھوڑ دیا جائے تو تمیز نہ ہو سکے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿لاتذبحوا الا مسنة الاان یعسر علیکم، فتذبحوا جذعة من الضان﴾: ''تم مسنہ ہی ذبح کرو مگر یہ کہ تمہارے لیے مشکل ہو جائے تو بھیڑ دنبہ میں جذع ذبح کرلو۔''[۲]

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھیڑ دنبہ میں جذع کی قربانی کیا خوب ہے۔[۳]

نیز حضرت عقبہ عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ساتھیوں میں قربانی کے جانور تقسیم کرنے کے لیے بھیڑ بکریاں دیں۔ (تقسیم کے بعد) ایک عتود (بکری کا ایک سالہ بچہ) بچ گئی رسول کریم سے اس کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ضح به انت'' یعنی ''اس کی تم خود قربانی کرلو۔''[۴]

قربانی کے گوشت کا حکم

قربانی کے جانور کا گوشت خود کھائے، مالداروں اور ناداروں کو کھلائے اور اس کو ذخیرہ کرے، سب جائز ہے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابتداء میں) قربانی کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع فرمایا، پھر بعد میں فرمایا: ''کلوا وتزودوا وادخروا'' یعنی ''کھاؤ، توشہ بناؤ اور ذخیرہ کرو۔''[۵]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تین دن سے زیادہ گوشت ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا تھا اور بقیہ گوشت صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ ناتواں اعرابیوں کے ساتھ غمخواری ہو سکے، پھر یہ فرماتے ہوئے اجازت دے دی کہ ''میں نے تمہیں تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے سے منع فرمایا تھا، اب تم جتنا چاہو رکھ لیا کرو۔''[۶]

۱۔ [سنن البیہقی ۹/۲۷۵] ۲۔ [صحیح مسلم ۳/۱۵۵۵] ۳۔ [سنن الترمذی ۳/۴۹]
۴۔ [صحیح مسلم ۳/۱۵۵۶] ۵۔ [صحیح مسلم ۳/۱۵۶۲] ۶۔ [صحیح مسلم ۳/۱۵۶۴]

جب مالدار ہوتے ہوئے خود کھانا جائز ہوا تو دوسرے مالدار کو کھلانا بھی جائز ہوگا۔
البتہ مستحب یہ ہے کہ تین حصوں میں تقسیم کرے، ایک حصہ کھانے کا دوسرا ذخیرہ کرنے اور تیسرا کھلانے کا کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ''وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ'' [الحج:۳۶]

قربانی کے جانور کی کھال صدقہ کردے کیونکہ وہ کھال بھی اس کا حصہ ہے یا دباغت دے کر گھر میں استعمال کرے اس لیے کہ کھال سے انتفاع حرام نہیں ہے۔ کھال کا بیچنا اگرچہ جائز ہے لیکن مکروہ ہے کیونکہ ملکیت موجود ہے اور حوالہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جس نے قربانی کی کھال کو بیچا اس کی کوئی قربانی نہیں۔[1]

قصاب کو اس کی اجرت قربانی میں سے نہیں دی جائے گی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جانور کی دیکھ بھال اور ان کی کھالوں اور جھولوں کی تقسیم پر مامور فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ میں قصاب کو اس میں سے کچھ نہ دوں اور فرمایا کہ ہم اس کو اپنے پاس سے دیں گے۔[2]

پس اگر وہ فقیر ہوگا تو ہم اس میں سے اس کو دیں گے اور اس کو اس کی اجرت دیں گے۔

اون والے جانور کی اون ذبح کرنے سے پہلے کاٹنا اور اس سے انتفاع کرنا مکروہ ہے۔ افضل یہ ہے کہ قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرے جبکہ ذبح کرنے کا طریقہ خوب جانتا ہو کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سینگ والے مینڈھے سیاہ وسفید کے رنگ کے قربان کیے، ان کو اپنے ہاتھ سے ذبح کیا، بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھا۔[3]

اگر ذبح کا طریقہ خوب نہ جانتا ہو تو افضل یہ ہے کہ دوسرے سے تعاون حاصل کرلے، ایسی صورت میں اسے بذات خود موجود ہونا چاہیے کیونکہ حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اے فاطمہ، تم اپنی قربانی کے جانور کی طرف اٹھو اور اس کے پاس موجود رہو تو خون کے پہلے قطرہ کے وقت ہی تمہارے ہر گناہ کی مغفرت کردی جائے گی اور تم یوں کہو۔ ''ان صلاتی ونسکی و محیای ومماتی للّٰہ رب العالمین لاشریک لہ و بذلک امرت وانا اول المسلمین''

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

---

[1] [سنن البیہقی ۲۹۴/۹] [2] [ایضا] [3] [صحیح مسلم ۲/۱۵۵]

یہ خاص آپ ﷺ کے لیے اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہے یا اس کے اہل آپ ہیں یا تمام مسلمانوں کے لیے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔''[1]

کتابی کا قربانی کا جانور ذبح کرنا مکروہ ہے کیونکہ قربانی ایک قربت والا عمل ہے اور وہ اس کا اہل نہیں ہے۔

اگر اس کو کہا اور اس نے ذبح کر دیا تو جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ اہل ذکاۃ میں سے ہے۔ جس نے کسی کی بکری غصب کی پھر اس کی قربانی دے دی تو اس کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس کی قربانی جائز ہوگی۔ اگر بکری امانۃً رکھوائی، پس اس نے اس کی قربانی کر دی تو اس کا ضامن ہوگا اور اس کی قربانی جائز نہ ہوگی کیونکہ ذبح کرنے کے بعد ہی اس کی ملکیت ثابت ہوگی۔

اگر غلطی سے ایک نے دوسرے کا جانور ذبح کر دیا تو دونوں کی طرف سے کافی ہوگا اور ان دونوں پر ضمان نہ ہوگا کیونکہ ہر ایک جانور قربانی کے لیے متعین تھا اور ہر ایک پر واجب تھا کہ وہ ایام نحر میں ان ہی کی قربانی کرے اور دوسرے کے ساتھ تبدیل کرنا مکروہ ہے، پس اس مسئلہ میں ہر ایک ذبح کروانے میں دوسرے سے تعاون چاہنے والا ہو گیا۔

مضطر کے لیے کیا حلال ہے؟

مضطر (بے تاب آدمی) کے لیے جائز ہے کہ وہ بقدر ضرورت دوسرے کے مال سے متمتع ہو اور اس انتفاع کا ضامن ہوگا کیونکہ دوسرے کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنا مسلمان پر حرام ہے۔ لیکن اگر وہ اس (انتفاع) کے ثمن کا مالک نہ ہو اور اس کا مہمان نوازی نہ کی جائے تو جائز ہے۔ حضرت عمیر مولی ابی اللحم سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں اپنے آقا کے ساتھ ہجرت کے ارادے سے نکلا، جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ پہلے مدینہ پہنچ گئے، مجھے سخت بھوک لگی، تھوڑی ہی دیر کے بعد کچھ لوگ جو مدینہ سے باہر جا رہے تھے، میرے پاس سے گزرے، انہوں نے کہا کہ تم مدینہ میں کسی باغ میں جا کر اس کے پھل حاصل کر لو تو بہتر ہوگا، پس میں مدینہ کے ایک باغ میں داخل ہوا اور کھجوروں کے دو گچھے توڑ لیے، اتنے میں باغ کا مالک آ گیا اور وہ دو گچھے میرے پاس تھے، وہ مجھے حضور علیہ السلام کے پاس لے گیا، آپ ﷺ نے میرے بارے پوچھا تو میں نے سارا قصہ ذکر کیا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ ان میں سے کون سا زیادہ اعلیٰ ہے؟ میں نے ایک گچھے کی اشارہ کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لے لو اور باغ

---

1 [المستدرک ۴/۲۲۳]

کے مالک کو دوسرا کچھالے لینے کا حکم دیا اور مجھے چھوڑ دیا۔"[1]

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھوکے کو کھانا کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور قیدی کو رہائی دلاؤ۔"[2]

رہا ضمان کا وجوب تو وہ ان دلائل سے مستفاد ہے جن سے دوسرے کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنے کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ ان دلائل میں سے ایک دلیل حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس وقت حضرت عمران رضی اللہ عنہ اور دیگر اصحاب ایک سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر تھے اور انہیں سخت پیاس نے بے تاب کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو بلا بھیجا تھا جس کے پاس وہ اونٹ تھا جس پر دو توشہ دان لدے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اس عورت کو لایا گیا اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پانی لیا، وہ توشہ دان جوں کے توں تھے، بڑھتے ہی جاتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، پس وہ اپنے توشے لائے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کپڑے کو بھر دیا۔[3]

نجس ادویات کے استعمال کا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جسمانی صحت کے لیے اہل عرینہ کو اونٹنی کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں کو مدینہ منورہ کی آب وہوا موافق نہ آئی تو نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے انہیں حکم دیا کہ اونٹوں کے چرواہے کے پاس چلے جائیں اور ان کے دودھ اور پیشاب استعمال کریں۔ چنانچہ وہ لوگ اونٹوں کے چرواہے کے پاس گئے، وہاں جانوروں کا دودھ اور پیشاب پیا، یہاں تک کہ ان کے جسم تندرست ہو گئے، پھر وہ اس چرواہے کو قتل کر کے اونٹ ساتھ لے گئے۔ حضور علیہ السلام کو جب خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں لوگ بھیجے چنانچہ ان کو پکڑ کر لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری۔[4]

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ ان لوگوں کی شفایابی اونٹوں کا پیشاب پینے میں منحصر ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی اجازت دی۔

---

1. [سنن البیہقی ۱۰/۳]
2. [صحیح البخاری ۱۱۹۵]
3. [سنن البیہقی ۱۰/۳]
4. [صحیح البخاری ۱۳۲۳]

نشہ آور چیز سے علاج معالجہ کی ممانعت

نشہ آور چیز کا کسی بھی صورت میں استعمال جائز نہیں ہے کیونکہ کسی کو بھی اس بات کا یقینی طور پر علم حاصل نہیں کہ شراب باعث شفاء ہے بلکہ جس کو علم یقینی حاصل ہے۔ انہوں نے تو یہ بتایا ہے کہ شراب بیماری ہے، شفاء نہیں چنانچہ وائل حضرمی سے مروی ہے کہ طارق بن سوید الجعفی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شراب کا استعمال کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا۔ یا اس کو بنانا مکروہ بتایا۔ انہوں نے کہا کہ میں تو دوا وعلاج کے لیے بناتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شراب دوا نہیں بلکہ داء (بیماری) ہے۔[1]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شراب کے استعمال سے اجتناب کرو کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے، ایک شخص ان کے سامنے پیش کیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کتاب اللہ کو نذر آتش کرنے، بچہ کو قتل کرنے، عورت سے زنا کرنے، شراب کا جام پینے اور صلیب کو سجدہ کرنے میں سے کون سا گناہ زیادہ بھاری ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ شراب کا جام پینے سے زیادہ بھاری کوئی گناہ نہیں کیونکہ جب شراب پیے گا تو صلیب کو سجدہ بھی کرے گا، بچہ کو قتل بھی کرے گا، عورت سے زنا بھی کرے گا اور کتاب اللہ کو بھی جلائے گا۔[2]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ "میں نے ایک کوزے میں نبیذ ڈالی، اتنے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو نبیذ جوش زن تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میری بیٹی نے فریاد کی تھی اس کے لیے نبیذ بنائی جارہی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری شفاء ان چیزوں میں نہیں رکھی جن چیزوں کو تم پر حرام قرار دیا ہے۔"[3]

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور علاج (دونوں) کو اتارا ہے اور ہر بیماری کی دوا رکھی ہے، پس تم علاج کیا کرو اور حرام چیز سے علاج نہ کرو۔"[4]

---

[1] صحیح مسلم ۱۵۷۳/۳ [2] سنن البیہقی ۱۰/۵
[3] سنن البیہقی ۱۰/۵ [4] سنن البیہقی ۱۰/۵

پنیر کھانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ تبوک میں پنیر کا ٹکڑا بارگاہ نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے چھری منگوائی اور بسم اللہ پڑھ کر اس کو کاٹا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب تم پنیر کھانے لگو تو اس پر چھری رکھو بسم اللہ پڑھو اور کھاؤ۔ کثیر بن شہابؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پنیر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: پنیر، دودھ اور پیوی میں سے ہے، پس تم اللہ کا نام اس پر لے کر کھاؤ اور خدا کے دشمن تمہیں دھوکہ نہ دیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک عورت نے پنیر کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اگر تم کو پنیر نہیں کھانا تو ہمیں دے دو، ہم کھا لیتے ہیں۔

ثور بن قدامہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا حکم نامہ ہمارے پاس آیا جس میں یہ مرقوم تھا: تم پنیر میں سے نہ کھاؤ مگر اہل کتاب جو تیار کریں۔ حضرت علی البارقیؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پنیر کے بارے میں حکم دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مسلمان اور اہل کتاب جو تیار کریں اسے کھاؤ کیونکہ بھیڑ بکری کا بچہ ذبح کیا جاتا ہے، پھر اس کے معدے کے مادے کے ذریعہ دودھ کا پنیر بنایا جاتا ہے اور گر ذبیحہ مجوسیوں اور بت پرستوں کا ہو تو حلال نہیں ہے، اگر وہ بچہ مر جائے، پھر اس کے دودھ کا پنیر بنایا جائے تو حلال نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پنیر اور گھی کا حکم پوچھا گیا تو فرمایا ''بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، پھر پوچھا گیا کہ اگر وہ مردار ہو؟ فرمایا کہ اگر تمہیں معلوم ہو کہ اس میں مردار پن ہے تو اسے نہ کھاؤ۔''

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے پنیر کے بارے میں دریافت نہیں کرتے تھے کہ وہ اس کے پاک ہونے کو غالب قرار دیتے تھے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی اور اس کے بعد بھی پنیر کھایا کرتے تھے، آپ ﷺ سے اس کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، البتہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم احتیاطاً پوچھتے تھے۔[1]

---

[1] (سنن البیہقی ۱۰/۷)

کلیجی اور تلی کھانے کا حکم

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ دو مردار اور دو خون ہمارے لیے حلال کیے گئے ہیں، دو مردار تو ٹڈی اور مچھلی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں۔[1]

ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا میں تلی کھا سکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں اس نے کہا کہ اس کا اکثر حصہ تو خون کا ہوتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حرام تو دم مسفوح ہے۔[2]

بکری کے کون سے اجزاء مکروہ ہیں

مجاہدؒ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھیڑ بکری میں سات چیزیں ناپسند فرماتے تھے۔ خون، پتا، آلۂ تناسل، خصیتین، فرج، غدود، مثانہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بکری کا اگلا حصہ (دستی) پسند تھا، یہاں کراہت (ناپسندیدگی) سے مراد حرمت ہے، دلیل یہ ہے کہ پہلے جس خون کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد دم مسفوح ہے لہٰذا اس کے معطوفات کا بھی وہی حکم ہوگا جو اس کا حکم ہے۔ واللہ اعلم

بنی اسرائیل نے اپنے اوپر کیا حرام کیا تھا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کے مرض میں گرفتار تھے۔ آپ گھر میں رہتے، درد چیخنے، انہوں نے یہ کیا کہ کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو شفاء بخشی تو وہ ایسا گوشت نہیں کھائیں گے جس گوشت میں رگیں ہوتی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود نے اس کو حرام کرلیا، چنانچہ یہ آیت کریمہ اتری:

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [آل عمران: ۹۳]

"تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے مگر اسرائیل (یعقوب) نے جو اپنے لیے حرام کیا پہلے اس سے کہ تورات نازل ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ لاؤ تورات، پس اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔"

علماء لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹ کا گوشت اپنے لئے حرام کیا تھا۔

---

[1] [ایضاً] [2] [ایضاً]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے۔ ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ "پس ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو ان کے لیے حلال تھیں۔" امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ پاکیزہ (حلال) چیزیں ان کے لیے حلال تھیں اور فرمایا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ﴾ [الانعام:۱۴۶]: "اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کردیے تھے اور گائے اور بکری (کے اجزاء) میں سے ان دونوں کی چربیاں ان پر ہم نے حرام کردی تھیں مگر وہ جو ان کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو۔"

ناخن والے جانوروں سے مراد اونٹ اور شتر مرغ ہیں۔

مشرکین نے اپنے اوپر کیا چیزیں حرام کی تھیں؟

مشرکین نے بھی کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کرلی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمادی کہ ان کے حرام کرنے سے وہ چیزیں حرام نہیں ہوسکتیں۔ جیسا کہ مشرکین نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی کو اپنے لیے حرام کرلیا تھا، ایسے اونٹوں اور بکریوں کے دودھ، گوشت اور ملکیت کو حرام کردیا تھا۔

بحیرہ وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے نام کردیتے تھے، کوئی اپنے استعمال میں نہ لاتا تھا، سائبہ وہ جانور ہے جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اس سے کوئی کام نہ لیتے اور وصیلہ وہ ناقہ (اونٹنی) ہے جو پہلے مادہ بچہ جنے، پھر دوسری بار بھی مادہ بچہ دے، درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو، اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور حامی نر اونٹ ہے جو ایک خاص تعداد میں جفتی کرچکا ہے اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے یہ سب باطل، کفر اور شرک ہیں۔

﴿قتل کی حرمت﴾

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [الانعام: ۱۵۱]

''اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ۔''

ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [الفرقان]

''اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور اس جان کو قتل نہیں کرتے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ [المائدة: ۳۲]

''یہ کہ جو شخص کوئی جان بغیر کسی جان کے یا بغیر زمین میں فساد مچانے کے بدلے قتل کر دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کوئی جان زندہ کی تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کیا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ [النساء: ۹۳]

''اور جو شخص جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرتا ہے اس کی سزا جہنم ہے اس میں ہمیشہ رہے گا۔''

ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ﴾ الانعام: ۱۵۱]

''اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔''

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ [التکویر: ۸-۹]

''اور جب زندہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس گناہ کی پاداش میں مار دیا گیا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الانعام: ۱۴۰]

''وہ لوگ یقیناً خسارے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بغیر علم کے نادانی سے قتل کیا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرو حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے، اس نے پوچھا کہ پھر کونسا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' پھر یہ کہ تم اپنے اولاد کو اس ڈر سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔'' اس نے کہا کہ پھر کون سا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' پھر یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔'' اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا﴾ [الفرقان: ۶۸]

''اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور اس جان کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرے گا اسے سزا سے سابقہ پڑے گا۔''[1]

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب گھر میں محصور کردیے گئے تھے۔ (ایک دن) ہم ایک جگہ میں آکر لوگوں کی باتوں کو سن رہے تھے کہ حضرت عثمان اندر آئے پھر گھر سے باہر نکلے، چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا، کسی نے پوچھا کہ اے امیر المؤمنین! آپ کو کیا ہوا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ لوگ اب مجھے قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں، مجھے ان سے اس بات کی توقع نہ تھی، ہم نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے شر سے بچائے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ آخر وہ مجھے کس وجہ سے قتل کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''کسی مسلمان کا خون حلال

---

[1] صحیح البخاری [۱۴۳۰]

نہیں مگر تین باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے (حلال ہے) ایک وہ آدمی جو مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کرے۔ یا محصن ہونے کے بعد زنا کرے۔ یا کسی جان کو بغیر جان کے بدلے قتل کرے۔ پس خدا جانتا ہے کہ میں نے نہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی زنا کیا اور نہ ہی زمانۂ اسلام میں۔ اور جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے میں اپنے دین کے بدلے کوئی دین پسند نہیں کیا۔ اور میں نے کسی جان کو بھی قتل نہیں کیا، پھر کس بنا پر یہ لوگ میرے قتل کے درپے ہیں[1]

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قبیلہ جہینہ کے علاقے حرقہ کی طرف (لشکر کشی کے لیے) روانہ کیا، پس ہم نے اس قوم پر صبح ہوتے ہی حملہ کیا اور ان کو شکست سے دوچار کیا۔ (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے اور ایک انصاری آدمی نے دشمن کے ایک شخص کو پکڑا، جب ہم اس پر غالب آگئے تو اس نے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا، انصاری آدمی نے تو اسے چھوڑ دیا لیکن میں نے اپنا نیزہ اسے مارا اور قتل کر دیا، جب ہم واپس آئے اور نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو مجھے فرمایا: ''اے اسامہ رضی اللہ عنہ! کیا تم نے اس کو قتل کر دیا بعد اس کے کہ اس نے لا الہ الا اللہ پڑھ لیا تھا؟'' میں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اس نے تو پناہ پکڑنے کے لیے ایسا کیا، آنحضور ﷺ نے پھر فرمایا، کیا تم اسے قتل کر دیا بعد اس کے کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا؟ آپ ﷺ بار بار یہ جملہ ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ کاش! میں اس دن سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔''[2]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن ہمیشہ اپنے دین کی طرف سے کشادگی اور وسعت میں رہتا ہے جب تک کہ حرام کردہ خون کا ارتکاب نہ کرے۔''[3]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسے دشوار گزار امور جن میں مبتلا شخص کے لیے اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہوتی ان امور میں سے ایک حرام کردہ خون کو بغیر حلال کے بہانا ہے۔''[4]

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ ایک حدیث رسول اللہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ''جو شخص کسی مومن کو قتل کر کے اس پر رشک کرتا ہے تو اس کی نہ فرض عبادت قبول ہوگی نہ نفل'' ایک نے دوسرے سے ''قتل پر رشک کھانے'' کا مطلب پوچھا تو اس نے کہا کہ اس سے مراد'' وہ لوگ ہیں جو کسی فتنہ کے زمانہ میں کسی کو قتل کرتا ہو اور خود کو ہدایت پر سمجھتا ہو، اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی

---

[1] سنن البیہقی ۱۹/۸ [2] صحیح البخاری ۱۳۴۲ [3] صحیح البخاری ۱۳۴۰ [4] ایضاً

کبھی بھی معافی نہ مانگتا ہو۔[1]

پس ہر وہ شخص جو مسلمانوں اور غیر مسلموں اور ان کے بچوں کو بلا کسی جرم کے قتل کرتا ہو وہ ان لوگوں میں شامل ہے جن کی نہ فرض عبادت قبول ہوگی اور نہ نفل۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں ایک مقتول شخص ملا، اس کے قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری موجودگی میں کوئی شخص قتل کیا جائے اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو؟ اگر (بالفرض) آسمان والے اور زمین والے سب ایک مومن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ چاہیں تو سب کو عذاب میں گرفتار کر دیں۔'' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اگر ایک مومن آدمی کے قتل پر زمین و آسمان کے رہنے والے جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو ضرور عذاب میں گرفتار کر دیں۔''[2]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مومن کا قتل دنیا کے زوال سے زیادہ بھاری ہے'' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''دنیا کا زوال اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمان کے قتل سے زیادہ ہلکا ہے۔''[3]

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔''[4]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے بھائی کے سامنے ہتھیار سے اشارہ نہ کرے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شیطان اس کے ہاتھ سے کھینچ لے اور وہ جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔''[5]

خودکشی پر وعید

مسلمان کا دوسرے کو قتل کرنے کی بہ نسبت اپنے آپ کو قتل کرنا (خودکشی) زیادہ بھاری گناہ ہے چنانچہ حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اسلام کے سوا دوسرے مذہب کی قسم اٹھائے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے کہا۔ اور جس نے کسی چیز کے ذریعہ خودکشی کی تو اسے آتش دوزخ میں اس چیز کا عذاب ہوگا۔ اور مومن کا دوسرے کو لعن طعن کرنا اس کو قتل کرنے کی طرح ہے اور جو شخص کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائے تو وہ اس کو قتل کی طرح ہے۔''

[1] [سنن البیہقی ۲۱/۸] [2] [سنن البیہقی ۲۲/۸] [3] [ایضا]
[4] [صحیح البخاری ۶۸۷۴] [5] [ایضا] [6] [صحیح البخاری ۱۳۶۳]

کتاب الجنایات

جنایات، جنایۃ کی جمع ہے بمعنی جرم اور قصور۔ اور فقہاء کرام کی اصطلاح میں اس فعل ممنوع کا نام ہے جو جان اور اطراف (اعضاء) پر واقع ہو۔ جنایت کا اصل معنی ہے زیادتی کرنا اور یہ زیادتی کبھی اپنی جان پر ہوتی ہے اور کبھی دوسرے پر، کہا جاتا ہے جنی علی نفسہ وجنی علی غیرہ یعنی اس نے اپنی ذات پر زیادتی کی اور اس نے دوسرے پر زیادتی کی، جنایت علی الغیر جان، مال اور عزت وآبرو پر ہوتی ہے اور جنایت علی النفس کو قتل یا صلب یا حرق کہتے ہیں اور جنایت علی الاطراف کا نام قطع یا کسر یا شج بھی ہے اور جنایت علی العرض (عزت پر زیادتی) کی دو قسمیں ہیں، ایک قذف (تہمت) جس کا موجب حد ہے، ہم اس کو بیان کر چکے ہیں، دوسری غیبت جس کا موجب گناہ ہے اور وہ احکام آخرت میں سے ہے اور جنایت علی المال کو غصب یا خیانت یا سرقہ (چوری) بھی کہتے ہیں، اس کے احکام کتاب السرقۃ والغصب میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع صرف جنایت علی النفس اور جنایت علی الاطراف ہے۔

جنایت علی النفس (قتل) کی اقسام: قتل کی پانچ قسمیں ہیں۔ (۱) قتل عمد (۲) قتل شبہ عمد (۳) قتل خطاء (۴) قتل جاری مجرائے خطاء (۵) قتل بالسبب۔

قتل عمد

قتل عمد وہ ہے جس میں آدمی کو مار ڈالنا مقصود ہو، خواہ ہتھیار سے ہو جیسے تلوار، چھری، خنجر وغیرہ یا کسی ایسی نوک دار چیز سے ہو جو تفریق اجزاء میں ہتھیار کا کام کرتی ہو جیسے نوک دار لکڑی، پتھر، آگ وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز ہتھیار کے مشابہ ہو جیسے پیتل، سیسہ، سونا، چاندی، اس کا بھی یہی حکم ہے خواہ دوسرے کو کاٹنے کے ساتھ ہو یا زخمی کرنے کے ساتھ ہو یا کوٹنے کے ساتھ ہو، یہاں تک کہ اگر سیسہ کا ہتھوڑا لے کر مارا اور اس کو قتل کر دیا تو اس پر قصاص واجب ہوگا۔ جو چیز تفریق اجزاء میں ہتھیار کا کام کرتی ہو وہ بھی اس کے حکم میں ہے جیسے بندوق، شیشہ، پستول وغیرہ۔ اور ہر وہ چیز اس کے ساتھ ذکاۃ (ذبح) کا عمل واقع ہو وہ بھی اس کے حکم میں ہے کہ جب اس کے ساتھ قتل کرے گا تو اس میں قصاص واجب ہوگا۔

اگر زراعت کے کسی آلہ سے مارا جیسے بیلچہ، کلہاڑی، چوڑا تختہ وغیرہ تو اگر لکڑی لگنے سے مر گیا تو اس میں دیت ہے اور اگر لوہا لگنے سے مرا تو اس میں قصاص ہوگا اور اگر کسی کو آگ میں

جلایا تو اس پر قصاص ہے۔ اگر پانی میں پھینکا اور وہ غرق ہو کر مر گیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس میں قصاص نہیں ہوگا اور عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔ صاحبینؒ کے نزدیک اس پر اس صورت میں قصاص لازم ہوگا جب کہ پانی اتنا ہو کہ عام طور پر اس میں انسان ڈوب جاتا ہو کیونکہ یہ آگ میں ڈال کر قتل کرنے کے مثل ہے۔

اگر کسی آدمی کو باندھا، پھر اسے دریا برد کر دیا جس سے وہ غرق ہو گیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیت واجب ہوگی، اگر وہ ایک ساعت (لمحہ) کے لیے تیر کر پھر ڈوب جائے تو دیت واجب نہ ہوگی۔

اگر آزاد آدمی کو گھر میں بند کر دیا، پس وہ بھوک یا پیاس سے مر گیا تو وہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کچھ بھی ضامن نہ ہوگا کیونکہ یہ ایسا سبب ہے جو ہلاکت تک نہیں پہنچاتا، وہ شخص تو کسی اور سبب سے مرا ہے اور وہ سبب کھانے اور پانی کی عدم دستیابی ہے۔ پس بھوک کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا اور آزاد آدمی ید کی وجہ سے ضامن نہیں ہوتا۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ اس پر دیت ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسا سبب ہے جو اس کی ہلاکت تک پہنچانے والا ہے، جیسے دوسرے کو زہر پلانا۔

اگر ایک آدمی کو زہر پلایا یا اس کو کھلایا جس سے وہ مر گیا تو اگر میت نے از خود اسے کھایا تو کھلانے والے پر کوئی ضمان نہ ہوگا البتہ اس کو مارا جائے گا اور تعزیر لگائی جائے گی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت زہر آلود بکری کا گوشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ کھالیا، پھر اس عورت کو لایا گیا، کسی نے اجازت لی کہ کیا ہم اس کو قتل نہ کر دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔[1]

اور اگر اس کو زہر کھلایا ہو یا اس کو زہر کھانے پر مجبور کیا ہو تو اس صورت میں اس پر دیت ہوگی۔ کیونکہ جب وہ خود زہر کھائے گا تو وہ اپنی جان کو خود قتل کرنے والا ہے اور جس نے زہر اس کے سامنے پیش کیا ہے اس نے صرف اس کو دھوکہ دیا ہے اور دھوکہ دہی میں جان کا ضمان نہیں ہوتا۔

اور جس یہودی عورت نے گوشت میں زہر ملایا تھا اس کے قتل کے بارے میں روایات مختلف ہیں، یہاں تک کہ بشر بن براء رضی اللہ عنہ اس وجہ سے فوت ہوئے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعزیراً اس عورت کو قتل کیا ہو۔ اگر کسی کو چھت سے یا پہاڑ سے گرایا ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک اس پر قصاص نہیں ہے۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر اکثر و بیشتر اس سے بچنا ممکن نہ ہوتا ہو تو اسی

---

[1] [سنن البیہقی ۸/۴۶]

صورت میں قصاص واجب ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس کے زیور پر پتھر کے ساتھ قتل کیا، پس اس لڑکی کو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لایا گیا، اس میں ابھی زندگی کی رمق موجود تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ ''کیا اس نے تجھے قتل کیا ہے؟ اس نے سر کے اشارہ سے کہا کہ نہیں، پھر دوسری بار پوچھنے پر اس نے سر سے اشارہ کیا کہ نہیں، پھر تیسری بار پوچھنے پر اس نے سر کے اشارہ سے کہا کہ ہاں۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس یہودی کو دو پتھروں کے ساتھ قتل کروایا۔''[1]

وہ صورت بھی قتل عمد میں داخل ہے جس میں دوسرے کو مارنا مقصود ہو۔ قتل کی جگہ مقصود ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اگر جسم کی خاص جگہ کا مارنے میں قصد کرے لیکن غلطی سے دوسری جگہ پر ضرب لگ جائے جس سے وہ مر جائے تو قتل عمد ہے اس پر قصاص واجب ہوگا۔

قتل عمد کا حکم اور قاتل کی وراثت سے محرومی

قتل عمد کا حکم گناہ اور قصاص ہے۔ گناہ تو اجماع سے ثابت ہے نیز اس ارشاد باری تعالیٰ سے ثابت ہے:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ﴾ [النساء ۹۳] ''اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے اس کا بدلہ جہنم ہے اس میں ہمیشہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب اور لعنت ہے۔''

نیز قتل، شرک اور عقوق والدین کے بعد اکبر الکبائر میں سے ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، جان کو قتل کرنا اور جھوٹ بولنا، کبیرہ گناہ ہیں۔''[2]

قتل نفس کے بارے میں نصوص کثیر ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور قصاص کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى﴾ [البقرة ۱۷۸]: ''اور تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض کیا جاتا ہے۔''

اور اس قتل سے قتل عمد مراد ہے کیونکہ قصاص کسی اور قتل میں نہیں ہے نیز آنحضور علیہ

---

۱ [صحیح البخاری ۲۴۱۳] ۲ [صحیح مسلم ۹۱/۱]

السلام نے فرمایا ''العمد قود'' یعنی قتل عمد میں قصاص ہے۔[1]

یعنی قتل عمد کا موجب اور حکم قصاص ہے۔ ہمارے (احناف کے) نزدیک قتل عمد میں کفارہ نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قتل عمد اور اس کا حکم ان الفاظ سے ذکر کیا ہے:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ [النساء، ۹۳]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا، جبکہ قتل خطاء میں اس کا حکم اور اس میں لزوم کفارہ کا صراحت سے ذکر کیا ہے، معلوم ہوا کہ اگر قتل عمد میں بھی کفارہ واجب ہوتا تو قتل خطاء کی طرح اس کو بھی ضرور بیان فرماتے۔ میراث سے محرومی بھی قتل عمد کے حکم میں سے ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن المسیب ؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قاتل، مقتول کی دیت کا وارث نہ ہوگا۔''[2]

البتہ اگر مقتول کے اولیاء معاف کردیں یا مصالحت کرلیں تو وارث ہوگا کیونکہ حق ان کا ہے۔ پس جب انہوں نے مصالحت کرلی تو ان کا حق قصاص ساقط ہو جائے گا۔ جیسا کہ معاف کردیں تو ساقط ہو جاتا ہے اگر مقتول کے اولیاء مصالحت نہ کریں لیکن بعض اولیاء معاف کردیں تو قصاص باطل ہو جائے گا اور معاف نہ کرنے والوں کا حصہ مال سے منقلب ہو جائے گا کیونکہ جب من لہ القصاص کی طرف سے قصاص کا حق پورا پورا وصول کرنا دشوار ہو تو اس کا حصہ مال سے منقلب نہیں ہوتا اور جب من علیہ القصاص کی طرف سے دشوار ہو تو اس کا حصہ مال سے منقلب ہو جائے گا، پھر جس نے معاف کیا ہو اس کا حصہ مال سے منقلب نہ ہوگا کیونکہ اس کی طرف سے قصاص کے حق کا پورا پورا وصول کرنا متعذر ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علي المقتتلين ان ينحجزوا الاوّل، فالاوّل، وان كانت امرأة'' اس حدیث کے ایک راوی نے ''ان ينحجزوا'' کا مفہوم کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص مقتول ہو اور اس کے مرد اور عورتیں دونوں ورثاء میں موجود ہوں تو مرد یا عورت ہی سے الاقرب فالاقرب کے طریق پر جو بھی اس کا خون معاف کردے تو اس کا معاف کرنا جائز ہوگا کیونکہ حدیث میں موجود لفظ ''ان ينحجزوا'' کا معنی ہے کہ وہ قصاص لینے سے رک جائیں۔

زید بن وہبؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''ایک آدمی نے اپنی بیوی کے پاس کسی غیر شخص کو پایا اور اس کو قتل کردیا، حضرت عمر بن خطابؓ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا،

---

[1] نصب الرایۃ ج۴/ ۳۲۷ [2] السنن الکبریٰ ۱۳۳/۸

اس عورت (مقتولہ) کے کسی بھائی کو اس پر ناراضگی ہوئی، پس اس نے اپنا حصہ معاف کر دیا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کے لیے دیت کا حکم دیا۔"[1]

دیت اسی کے مال میں واجب ہوگی، اس کی دلیل مصنف عبدالرزاق میں امام شعبیؒ کا قول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں دیت عاقلہ پر نہیں ہوگی بلکہ خاص اسی کے مال میں ہوگی، ایک قتل عمد، دوسرا اعتراف، تیسرا صلح اور چوتھا مملوک"۔[2]

ابن شہابؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "سنت یہی جاری ہے کہ عاقلہ قتل عمد کی دیت کو برداشت نہیں کرے گی البتہ عاقلہ خوشدلی سے اس کے ساتھ تعاون کرے تو اور بات ہے۔"[3]

ابوالزنادؒ کہتے ہیں کہ فقہاء اہل مدینہ کہتے تھے کہ جو قتل عمداً ہو اس کا بار نہ ہوگا اور نہ ہی صلح کا اور نہ اعتراف کا اور نہ ہی مملوک کی جنایت کا عاقلہ پر بار ہوگا۔ مگر یہ کہ عاقلہ از راہ کرم اس کو پسند کریں تو اور بات ہے۔"[4]

جس قتل عمد میں قصاص کسی شبہ کی بنا پر ساقط ہو جائے، اس میں دیت قاتل کے مال میں ہوگی اور ہر ایسا تاوان جو صلح سے واجب ہو وہ بھی قاتل کے مال پر ہوگا اور ہر ایسی جنایت جس کا جانی (مجرم) اعتراف کرے تو وہ اسی کے مال میں ہوگی اس کے عاقلہ پر نہ ہوگی۔

دیت تین سال میں واجب ہوگی، اس کی دلیل یحییٰ بن سعیدؒ کی روایت ہے کہ "یہ بات سنت میں سے ہے کہ دیت تین سالوں میں قسط وار دی جائے گی۔"[5]

قتل شبہ عمد

امام صاحبؒ کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ کسی ایسی چیز سے قتل کیا جائے جو اجزائے بدن کی تفریق نہ کرے۔ یعنی ایسی چیز سے مارنے کا ارادہ کرے جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی قائم مقام ہتھیار ہو بلکہ ایسی چیز سے مارے جس سے عموماً ہلاکت واقع ہو جاتی ہے مثلاً بڑے پتھر یا بڑی لاٹھی یا بڑے تختے سے مارے تو ایسا قتل امام صاحب کے ہاں شبہ عمد ہوگا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں قتل عمد ہوگا کیونکہ جب عموماً اس سے قتل کیا جاتا ہو تو وہ اس آلۂ قتل کے مثل ہو گیا جو قتل کے لیے ہی بنایا گیا ہے چنانچہ صاحبینؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا ارادہ کرے جس سے عموماً قتل نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے مقصود تادیب

---

[1] السنن البیہقی ۵۹/۸ [2] نصب الرایہ ۳۹۹/۴ [3] السنن البیہقی ۱۰۵/۸

[4] ایضاً [5] السنن البیہقی ۱۰۶/۸

ہوتی ہو۔ جب آلہ چھوٹا ہو جس سے عموماً قتل نہیں کیا جاتا جب اس کے سبب مر جائے تو ایسا قتل شبہ عمد ہوگا۔

قتل شبہ عمد کا حکم

قتل شبہ عمد کا حکم یہ ہے کہ ابتدا میں گناہگار ہوگا پھر کفارہ کے ادا کرنے سے گناہ ساقط ہو جاتا ہے۔ گناہگار اس لیے ہوگا کہ وہ قاتل اور قاصد ضرب ہے اور کفارہ کا وجوب شبہ بالخطاء کی وجہ سے ہے اور اس قتل میں قود اور قصاص نہیں ہے کیونکہ ایسے قتل میں عمد نہیں پایا گیا اور استعمال شدہ آلہ بھی ایسا ہے جو قتل کے لیے وضع نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس میں استعمال ہوا ہے۔ اس قتل میں عاقلہ پر دیت مغلظہ واجب ہوگی۔

اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ دیت جو ابتداءً قتل سے واجب ہوئی ہو اور اس میں بعض ورثاء کی طرف سے مصالحت یا معافی کا کوئی عمل نہ ہو ایسی دیت عاقلہ پر واجب ہوا کرتی ہے۔ اسے قتل خطاء پر قیاس کیا گیا ہے اور اس قتل سے میراث کی محرومی بھی متعلق ہوتی ہے کیونکہ وہ قتل کا بدلہ ہے اور شبہ قصاص کے سقوط میں اثر انداز ہوتا ہے، وراثت سے محرومی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیت مغلظہ پچیس بنت مخاض، پچیس بنت لبون، پچیس حقہ اور پچیس جذعہ ہے۔ اونٹوں میں جذعہ اس ناقہ (اونٹنی) کو کہتے ہیں جس کے چار سال پورے ہو چکے ہوں اور پانچویں سال میں لگ چکی ہو۔ اور حقہ اس ناقہ کو کہتے ہیں جس کے تین سال پورے ہو چکے ہوں اور چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اور بنت لبون اس ناقہ کو کہتے ہیں جس کے دو سال پورے ہو چکے ہوں اور تیسرے سال میں لگ چکی ہو۔ اور بنت مخاض اس ناقہ کو کہتے ہیں جس کا ایک سال پورا ہو چکا ہو اور دوسرے سال میں شروع ہو چکی ہو۔ امام صاحب کے ہاں دیت سو اونٹ ہیں چنانچہ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ دیتوں کے بارے میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکتوب گرامی (حکم نامہ) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں: ان فی النفس مئة من الابل یعنی جان کے (قتل کرنے) میں سو اونٹ ہوں گے۔[1]

امام ابوحنیفہؒ کی اس پر دلیل کہ وہ سو اونٹ بطریق ارباع ہوں گے، عاصم بن ضمرہؒ کی

---

[1] الموطا ۱۸۰/۴

روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "قتل خطاء میں دیت بطریق ارباع ہوگی، پچیس حقے، پچیس جذعے، پچیس بنت لبون اور پچیس بنت مخاض"۔[۱]

اور قتل نفس کی دیت بھی بارہ ہزار درہم ہیں، اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "ایک آدمی عہد رسالت مآب میں قتل ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی"۔[۲]

حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے اس صحیفہ میں جسے انہوں نے دیات کے بارے میں رقم کیا تھا یہ ہے: سونا رکھنے والوں پر ایک ہزار دینار ہیں۔ (ایضاً) دراہم کے حساب کی صورت میں دیت کی رقم چار کلوگرام سونا یا چونتیس کلوگرام اور ایک کلو کے دس حصوں میں سے آٹھ حصے کی چاندی کے وزن کو پہنچتی ہے اور قتل شبہ عمد کو وردو دلیل کے سبب قتل خطاء پر قیاس کیا گیا ہے۔

عاقلہ سے مراد عصبہ ہیں، عصبہ وہ ہیں جو باپ کی طرف سے قرابت دار ہوں جو قتل خطاء کی دیت دیتے ہیں۔ عاقلہ کی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ جنایت کرنے والے شخص کے باپ کی طرف کے بھائیوں کو دیکھا جائے گا اور ان پر اس چیز کا بار ڈالا جائے گا جو عاقلہ پر ڈالا جاتا ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو برداشت کرلیں تو وہ اس (دیت) کو تین سال میں ادا کریں گے اور اگر اسے برداشت نہ کریں تو پھر اس کے (مجرم کے) چچاؤں کے سامنے اس امر کو پیش کیا جائے گا، اگر وہ بھی اس بار کو نہ اٹھائیں تو پھر اس کے باپ کے چچاؤں کے سامنے سے پیش کیا جائے گا، اگر وہ بھی اس بار کو نہ اٹھائیں تو پھر اس کے دادا کے والد کے دادا کی اولاد کے سامنے اس کو پیش کیا جائے گا اور جب تک یہ لوگ عاجز نہ ہوں باپ کی اولاد کے سامنے اسے پیش نہیں کیا جائے گا۔ اس دیت کو "عقل" بھی کہتے ہیں کیونکہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں دیت اونٹوں کی شکل میں ہوتی تھی کیونکہ اونٹ ہی ان کے مال تھے اور اس لیے کہ قاتل کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ مقتول کے ورثاء کے گھر کے صحن میں دیت کو لے کر جائے، پس وہ ان اونٹوں کو عقل سے باندھ دیتا تھا اور مقتول کے اولیاء کے حوالہ کر دیتا تھا۔ عقل جمع ہے عقل کی، عقل اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا پیر باندھتے ہیں۔ اس بات کی دلیل کہ قتل شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی طرح دیت مغلظہ ہے اور شبہ عمد میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: **عقل شبه العمد مغلظة مثل عقل العمد ولایقتل صاحبه، وذلک ان ینزو والشیطان بین الناس فیکون رمیا فی عمیا فی غیر ضغینة ولاحمل**

[۱] [سنن البیہقی ۸/۷۴] [۲] [سنن البیہقی ۸/۷۹]

صلاح یعنی "قتل شبہ عمد کی دیت، مغلظہ ہے، قتل عمد کے مثل اور اس کے صاحب کو قتل نہ کیا جائے گا، اس کا سبب یہ ہے کہ شیطان لوگوں کو بھڑکاتا ہے تو کسی بغض وعداوت اور اسلحہ برداری کے بغیر ہی نادانی سے تیر چل جاتا ہے۔"[1]

اور اس امر کی دلیل کہ شبہ عمد میں دیت عاقلہ پر واجب ہے، ابوسلمہ بن عبدالرحمن کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑنے لگیں، ایک نے دوسری کو پتھر مارا جس سے وہ اور اس کا جنین مر گیا، مقتولہ کے ورثاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے کر آئے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ یہ کیا کہ اس کے جنین کی دیت، غرہ یعنی غلام یا لونڈی مقرر فرمائی اور اس عورت کی دیت کا فیصلہ اس کی عاقلہ کے اوپر کیا۔ اور اس کی اولاد وغیرہ کو اس کا وارث قرار دیا۔[2]

قتل خطاء

قتل خطاء کی دو قسمیں ہیں، ایک خطاء فی القصد، وہ یہ ہے کہ ایک شخص کو شکار خیال کر کے اس پر تیر وغیرہ چلائے، پھر معلوم ہو کہ وہ تو مسلمان آدمی ہے۔ دوسری قسم خطاء فی الفعل ہے، وہ یہ ہے کہ شکار کو ہدف بنا کر اس پر تیر چلائے اور وہ غلطی سے کسی انسان کو لگ جائے یا اپنی گاڑی یا موٹر سائیکل کسی کے ساتھ ٹکرا دے اور دوسرے کو بلا قصد قتل کر دے۔

قتل خطاء کا حکم

قتل خطاء کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر اس کا کفارہ اور عاقلہ پر دیت لازم ہوگی۔ کفارہ کے وجوب پر یہ آیت کریمہ دلیل ہے:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ... فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ﴾ [النساء ۹۲]: "اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو وہ ایک مومن غلام آزاد کرے اور دیت ہوگی جو اس کے گھر کے لوگوں کے حوالہ کی جائے گی...... پس جو شخص مومن غلام نہ پائے وہ لگاتار دو ماہ کے روزے رکھے، اللہ سے توبہ کرتے ہوئے۔"

اور اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: رفع عن امتی الخطاء

---

[1] [سنن البیہقی ۸/۷۰] [2] [صحیح مسلم ۳/۱۳۰۹]

والنسيان وما استكرهوا عليه یعنی ''میری امت سے خطاء، نسیان اور جس کام پر ان کو مجبور کیا جائے، یہ سب کچھ اٹھالیا گیا ہے۔'' صرف قتل کے گناہ کی نفی کی گئی ہے لیکن اس سے احتراز نہ کرنے کا گناہ ہوگا۔ قتل خطا میں بھی قاتل میراث سے محروم ہوگا کیونکہ یہاں ممکن ہے کہ اس نے قتل کا قصد کیا ہو اور خطا کو ظاہر کیا ہو، پس اس پر تہمت کے سبب میراث ساقط ہوگی۔

کونسا قتل مانع میراث ہے اور کونسا نہیں؟

(۱) ہر وہ قتل جس کے ساتھ قصاص یا کفارہ کا تعلق ہو وہ مانع میراث ہے۔ اس کی چند صورتیں یہ ہیں۔ (الف) جس قتل سے قصاص کا تعلق ہوتا ہے وہ قتل عمد ہے اور اس میں اہل قصاص نے قاتل کو معاف نہ کیا ہو اور اس میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

(ب) جس قتل سے کفارہ کا تعلق ہوتا ہے اور جس میں دھار دار آلہ کے بغیر مارا ہو اور وہ شدت ضرب سے مر گیا ہو وہ قتل شبہ عمد ہے۔ اور شبہ عمد میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ (ج) چوپائے کے ذریعہ قتل کرنا، یعنی اس چوپائے نے کسی کو روند ڈالا جبکہ وہ اس پر سوار تھا۔ (د) نیند کی حالت میں اپنے مورث پر کروٹ بدل کر اس کو مار دیا۔ (ہ) اس پر چھت گری اور مورث مر گیا (و) اس کے ہاتھ سے پتھر گرا اور اس سے اس کا مورث مارا گیا یا اینٹ یا لکڑی یا لوہا گرنے سے وہ مر گیا، یہ تمام چیزیں کفارہ واجب کرتی ہیں اور اگر وہ وارث ہو تو میراث سے محروم کرتی ہیں اور اگر اجنبی ہو تو وصیت سے محروم کرتی ہیں۔

(۲) جن صورتوں میں نہ قصاص متعلق ہوتا ہے اور نہ ہی کفارہ، وہ یہ ہیں۔ (الف) چھوٹے بچہ کا اپنے مورث کو قتل کرنا احناف کے ہاں یہ مانع میراث نہیں ہے۔ (ب) دیوانہ کا اپنے مورث کو قتل کرنا، یہ بھی احناف کے ہاں مانع میراث نہیں ہے (ج) مورث کو کسی سبب کے ساتھ قتل کرنا، جیسے راستہ میں دیوار بنائی اور اس نے (مورث نے) اس کے ساتھ ٹیک لگائی تو وہ دیوار اس پر گر گئی یا راستہ میں کنواں کھودا تھا اور اس میں اس کا مورث گر گیا اور مر گیا تو یہ بھی مانع میراث نہیں ہے۔ (د) اپنے مورث کو قصاصاً یا رجماً قتل کرنا یا اس کے خلاف زنا کی گواہی دی ہو پھر اسے رجم کیا گیا تو یہ بھی مانع میراث نہیں ہے۔ (ہ) اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے باغی (ظالم) مورث کو قتل کر دیا، یہ بھی میراث نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ صورت موجب قصاص نہیں ہے اور ان تمام حالات میں کفارہ نہیں ہے۔

اگر باغی نے عادل کو قتل کیا اور باغی کہتا ہے کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے اور میں باطل

پر تھا اور اب بھی میں باطل پر ہوں تو وہ بالاجماع اس کا وارث نہ ہوگا۔ اور اگر کہے کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے اور میں خود کو حق پر سمجھتا ہوں اور اب بھی میں حق پر ہوں تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس کا وارث ہوگا کیونکہ یہ ایسا قتل ہے جو موجب قصاص نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں بھی وہ اس کا وارث نہ ہوگا کیونکہ اس نے اس کو ناحق قتل کیا ہے۔

باپ جب اپنے بیٹے کو عمداً قتل کرے تو اس میں نہ قصاص واجب ہوگا اور نہ ہی کفارہ، قصاص تو اس لیے واجب نہ ہوگا کہ وہ ابتداء واجب ہوا لیکن شبہ کی بنا پر ساقط ہوگیا اور وہ اس کا وارث نہ ہوگا۔

جاری مجرائے قتل خطا

جب سونے والا شخص دوسرے آدمی پر کروٹ کیلئے اور اس کو مار ڈالے تو اس کا حکم قتل خطاء کی طرح ہے، پس قصاص ساقط ہوگا اور دیت عاقلہ پر واجب ہوگی اور میراث سے محروم ہوگا اور کفارہ واجب ہوگا۔ قصاص اس لیے ساقط ہو جائے کہ اس نے اس کو قصداً قتل نہیں کیا اور دیت کا وجوب اس بنا پر ہے کہ دوسرا شخص اس کے فعل سے مرا ہے اور کفارہ کے وجوب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے بوجھ کی وجہ سے مرا ہے اور میراث سے محرومی کا سبب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس نے اس کو قتل کرنے کا قصد کیا ہو اور خود کو سوتا ہوا ظاہر کیا ہو، اسے قتل خطا کے قائم مقام قرار دیا گیا گو کہ قتل خطاء کا ہی حکم اس سے متعلق ہوتا ہے، اس لیے کہ سونے والے کا کوئی قصد نہیں ہوتا، پس اس کے فعل کو نہ تو عمد (قصد) کے ساتھ متصف کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی خطاء کے ساتھ اس وجہ سے اس خطاء کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا گیا۔

قتل بالسبب

قتل بالسبب کی مثال جیسے کوئی شخص اپنے ملکیت والی جگہ میں کنواں کھودے یا غیر ملکیت والی جگہ میں پتھر رکھ دے یا کسی نے اپنی گاڑی راستہ میں کھڑی کردی، پس ایک آدمی اس کے ساتھ ٹکرا کر مرگیا یا اوپر سے کوئی آدمی اس پر گرا اور مرگیا تو کنواں کھودنے والا یا پتھر رکھنے والا نہ تو قصداً قتل کرنے والا ہے اور نہ ہی خطاء قتل کرنے والا ہے، وہ اس میں صرف مسبب کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس میں گر کر ہلاک ہو جائے تو دیت عاقلہ پر ہوگی اور اس قتل میں کفارہ نہیں ہے کیونکہ وہ بذات خود قتل کے فعل میں ملوث نہیں ہے اور مقتول اس کے بوجھ سے بھی نہیں مرا۔ اور یہ مسئلہ راکب علی الدابہ (چوپائے پر سوار شخص) کے بھی مشابہ نہیں ہے کہ جب وہ چوپایہ کسی آدمی کو روند کر مار ڈالے تو اس میں کفارہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں قتل راکب (سوار) کے ثقل اور جانور کو روندنے کے سبب ہوا۔

ایک شخص چوپائے پر سوار ہے اور اس چوپائے کو ایک شخص ہانکنے جا رہا ہے، اس چوپائے نے کسی انسان کو روند ڈالا جس سے وہ مر گیا تو ہانکنے والے پر کوئی کفارہ نہیں ہے کیونکہ اس نے قتل کا فعل خود انجام نہیں دیا اور مقتول اس کے ثقل کی وجہ سے بھی نہیں مرا۔

کنواں کھودنے، پتھر یا گاڑی یا موٹر سائیکل راستہ میں کھڑی کرنے کے سبب میراث سے محرومی نہ ہوگی کیونکہ یہ سب لوگ اس میں متہم نہیں ہیں، یہ سب صورتیں اس وقت ہیں جب لوگوں کی عام گزرگاہ میں کنواں وغیرہ کھودے لیکن اگر وہ عام گزرگاہ نہ ہو تو اس پر کوئی ضمان (تاوان) نہ ہوگا۔ اگر لوگوں کی عام گزرگاہ پر پتھر رکھا یا لوگوں کے عام راستہ میں گاڑی کھڑی کر دی تو نقصان ہونے پر ضامن ہوگا۔ اگر اپنی ملکیت والی جگہ میں کنواں کھودا ہو یا اپنی ملکیت والی جگہ میں پتھر یا گاڑی کھڑی کی ہو تو پھر اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔

جو امور موجب قصاص ہیں

آزاد آدمی کو آزاد کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ [البقرۃ: ۱۷۸] یعنی "آزاد کو آزاد کے بدلے قتل کیا جائے گا" اور قصاص قاتل پر ہوگا، دوسرے پر نہیں ہوگا چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مبارکہ: فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ﴾ [الاسراء: ۳۳] کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک کے بدلے دو کو قتل نہ کیا جائے گا۔ اور قاتل کے علاوہ کسی دوسرے کو قتل نہ کیا جائے گا اور اس کو مثلہ بھی نہیں کیا جائے گا۔[1]

حضرت قتادہؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ذی شان: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى [البقرۃ: ۱۷۸] کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں لوگ زیادتی کیا کرتے تھے اور شیطان کی پیروی

---

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ۲۵/۸

کرتے تھے، ایک قبیلہ کا حال یہ تھا کہ اگر اس کے پاس قوت وشوکت ہوتی اور دوسری قوم کا غلام ان کے غلام کو قتل کر دیتا تو کہتے کہ ہم تو اس (غلام) کے بدلے میں ان کا آزاد آدمی قتل کریں گے۔ تاکہ دوسرے قبیلہ پر ان کی برتری ظاہر ہو۔ اور جب ان کی کسی عورت کو دوسری قوم کی عورت قتل کر دیتی تو کہتے ہیں کہ ہم اس کے بدلے میں مرد ہی کو قتل کریں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اتارا اور خبر دی کہ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى یعنی غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت ہی قتل کی جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ظلم اور زیادتی سے منع فرمایا، پھر سورہ مائدہ نازل فرمائی چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ [المائدۃ:۴۵] ''اور ہم نے ان پر فرض کر دیا ہے کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہیں اور زخموں میں قصاص ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر مجرم کے جرم کو اسی پر لازم کیا ہے، کسی کے جرم کو دوسرے پر نہیں ڈالا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! ہر جنایت کرنے والا اپنے اوپر ہی جنایت کرتا ہے، والد اپنی اولاد پر جنایت نہیں کرتا اور نہ ہی بچہ اپنے والد پر جنایت کرتا ہے۔''[1]

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر محمد بن علیؒ سے پوچھا کہ جو صحیفہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے نیام میں تھا اس میں کیا احکام مرقوم تھے؟ انہوں نے کہا کہ اس صحیفہ میں تھا: **لعن الله القاتل غير قاتله والضارب غير ضاربه، ومن تولى غير ولي نعمته فقد كفر بما انزل الله على محمد صلى الله عليه وسلم**

آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ [المائدۃ:۴۵]

پس جب غلام مسلمان ہو تو اس کے بدلے آزاد آدمی کو قتل کیا جائے گا کیونکہ عصمت خون میں دونوں برابر ہیں لہٰذا قصاص واجب ہوگا۔ نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے ''**المسلمون تتكافأ دماؤهم**'' یعنی تمام مسلمانوں کے خون (جانیں) یکساں ہیں۔[2]

مرد کو عورت کے بدلے اور چھوٹے کو بڑے کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ نصوص مطلق ہیں۔ چنانچہ حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ مرد اگر عورت کو قتل کرے تو اس کو

---

[1] سنن البیہقی ۸/۲۷ [2] لسان العرب ۱/۱۳۰

عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ ''یعنی ہم نے ان پر فرض کیا ہے کہ جان کے بدلے جان ہوگی۔''[۱]

نیز عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مسلمان کے خون باہم برابر ہیں اور وہ دوسروں پر ایک قوت رکھتے ہیں۔[۲]

در حدیث علی رضی اللہ عنہ میں یہ الفاظ ہیں۔ ''تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور ان میں ادنیٰ شخص بھی ان کو پناہ دینے کی کوشش کر سکتا ہے اور وہ دوسروں پر ایک قوت رکھتے ہیں۔''[۳]

تندرست کو اپاہج، اندھے، دیوانے اور ناقص الاطراف کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ سابقہ نصوص میں تعمیم ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی آدمی نے ایسے شخص کو قتل کیا جس کے دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں کان اور آلہ تناسل مقطوع تھا اور دونوں آنکھیں بھی مفقود تھیں تو اگر عمداً قتل کیا ہو تو اس میں بھی قصاص واجب ہوگا۔

جب بیٹا اپنے باپ یا ماں یا دادا وغیرہ (اسی طرح اوپر تک) کو قتل کرے تو نفس اور مادون النفس قصاص دونوں میں واجب ہوگا اگر قتل عمداً ہو۔ اور اگر قتل خطاء ہو تو عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔

اگر ایک سے زیادہ افراد ایک شخص کے قتل عمد میں شریک ہوں تو اس ایک آدمی کے بدلے سب کو قتل کیا جائے گا چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''صنعاء میں ایک بچے کو دھوکے سے قتل کیا گیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بچے کے بدلے سات آدمیوں کو قتل کیا اور فرمایا کہ اگر صنعاء کے رہنے والے تمام لوگ بھی اس میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کروا دیتا۔''[۴]

اگر ایک آدمی ایک جماعت کو قتل کرے تو اسے اس جماعت کے بدلے قتل کیا جائے گا اور جماعت میں سے ہر ایک اپنا پورا حق لینے والا ہوگا۔

جب کوئی شخص کسی کو عمداً زخمی کرے اور وہ زخمی مر جائے تو اس میں قصاص ہوگا جبکہ کوئی اور ایسا عارض (سبب) پیش نہ آئے جس کی طرف اس کی موت کی نسبت ہو سکتی ہو کیونکہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس نے اس کو عمداً قتل کیا ہے۔

۱۔ السنن البیہقی ۸/۲۹ ۲۔ السنن الکبری ۸/۲۹
۳۔ السنن البیہقی ۸/۲۸ ۴۔ السنن الکبری ۸/۴۱

جب کوئی شخص ایک انسان پر گولی چلائے اور وہ گولی اس سے نکل کر دوسرے کو بھی لگ جائے اور وہ دونوں مرجائیں تو پہلا قتل عمداً ہوگا کیونکہ اس نے اس پر گولی چلانے کا قصد کیا ہے اور اس میں قصاص ہوگا اور دوسرا قتل خطاء ہوگا کیونکہ اس کو مارنا مقصود نہ تھا لہٰذا وہ خطاء ہوگا۔

جو امور موجب قصاص نہیں ہیں

(الف) باپ کو اپنے بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے، ''لایقاد الاب من ابنہ''[1] یعنی باپ سے اس کے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔'' بیٹے کے قتل کی صورت میں قاتل کے مال میں دیت واجب ہوگی کیونکہ یہ قتل عمد ہے اور عاقلہ قتل عمد کی دیت نہیں دیتی اور یہ دیت تین سال میں ادا کرنا واجب ہوگی۔

یہی حکم ہے جب باپ مادون النفس میں بیٹے پر کوئی جنایت کرے۔ دادے اور اوپر تک کے آباء کا بھی یہی حکم ہے کہ پوتے کے بدلے دادا کو قتل نہ کیا جائے گا۔ ماں کی طرف سے جو دادا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اگرچہ اوپر تک دادے کا اور پوتے کا نیچے تک سلسلہ چلا جائے۔ یہی حکم ہے ماں کا اگرچہ اس کا سلسلہ اوپر تک چلا جائے، حقیقی دادیوں کا بھی یہی حکم ہے اگرچہ اوپر تک سلسلہ چلا جائے۔

اس کی دلیل عمرو بن شعیب کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص فرماتے ہیں: ''میں نے بنو مدلج کے ایک آدمی کو ایک باندی بطور عطیہ دی، اس باندی سے اس کا بیٹا ہوا، وہ اس باندی سے کام لیتا رہا جب بچہ جوان ہوا تو ایک روز اس نے باندی کو بلایا اور کہا کہ تم فلاں فلاں کام کرو (یہ سن کر) اس کے بیٹے نے کہا کہ جب تک تم میری ماں کو باندی بنائے رکھو گے وہ تمہارے پاس نہیں آئے گی۔ اس پر اس کو غصہ آ گیا، اپنی تلوار نکالی اور اس کی ٹانگ پر ماری، اس وار سے لڑکا مر گیا ایک دن وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی قوم کے ساتھ پیش ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اے اپنی جان کے دشمن! تم وہی ہو جس نے اپنے بیٹے کو قتل کیا تھا؟ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ ''لایقاد الاب من ابنہ'' یعنی باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا تو میں تجھے ضرور قتل کر دیتا، اس کی دیت لاؤ (راوی) کہتے ہیں کہ وہ پھر ایک سو بیس یا تیس اونٹ لایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے سو اونٹ منتخب کیے اور اس کے ورثہ کو دے دیئے اور اس کے باپ کو چھوڑ دیا۔''[1]

1۔ السنن البیہقی ۸/۳۸

تنبیہ

ایسا کیوں ہے کہ باپ پر تو قصاص نہیں ہے لیکن بیٹے پر قصاص ہے؟ اس میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کے اجزاء کے حکم میں ہوتا ہے اور انسان کے اپنے بعض اجزاء میں قصاص واجب نہیں ہوتا لیکن باپ بیٹے کے جزء کے حکم میں نہیں ہے، پس وہ اس کے لیے اجنبی کی طرح ہے۔

(ب) ایک آدمی نے اپنی بیوی کے باپ (خسر) کو قتل کر دیا تو قصاص لینے کی دیت عورت کو حاصل تھی، پھر وہ عورت بھی مر گئی اور اس قاتل سے اس کی اولاد بھی ہے تو وہ اس قصاص کا وارث ہوگا جو (قصاص) اس کے باپ پر واجب تھا، پس جو اپنے باپ پر قصاص کا وارث ہوگا اس کا قصاص باپ کی حرمت کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا اور جب قصاص ساقط ہو گیا تو دیت واجب ہوگی۔

(ج) اگر دو آدمی ایک شخص کے قتل میں شریک ہوئے تو ایک پر قصاص واجب ہوگا اگر وہ منفرد تھا اور دوسرا اجنبی یا باپ کی طرح ہے، اس پر قصاص واجب نہ ہوگا۔ یا خطاء اور عمداً قتل کرنے والا ہے یا ایک نے تلوار سے اور دوسرے نے لاٹھی سے مارا تو دونوں پر قصاص واجب نہ ہوگا اور دیت واجب ہوگی، جس پر قصاص واجب نہ ہوا اگر وہ منفرد تھا تو دیت اس کی عاقلہ پر واجب ہوگی جیسا کہ قتل خطاء کرنے والے پر دیت ہوتی ہے اور جس پر قصاص واجب ہوا اگر وہ منفرد تھا تو اسی کے مال میں دیت واجب ہوگی۔

اگر باپ اور اجنبی دونوں قتل میں شریک ہوئے ہوں تو دونوں کے مال میں دیت واجب ہوگی کیونکہ اگر باپ منفرد ہو تو اس کے مال میں دیت واجب ہوگی۔

تلوار سے قصاص لینا

قصاص تلوار سے لیا جائے گا، خواہ قاتل نے تلوار سے قتل کیا ہو یا کسی اور دھاردار آلے سے یا آگ میں جلایا ہو، اس کی دلیل حضرت حسنؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لاقود الا بالسیف“ یعنی ”قصاص تلوار ہی سے ہوگا۔“

حضرت حسنؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ روایت کس سے لی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔[1]

[1] سنن البیہقی ۸/۶۲۔

تیز تلوار سے قتل کرنے میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کی تعذیب نہیں ہے کیونکہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں سماعت کی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان (خوبی سے کرنا) لکھ دیا ہے، پس جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو اور تمہیں اپنی چھری تیز کرنی چاہیے اور اپنے ذبیحہ کو راحت دینی چاہیے۔"[1]

قصاص فی الاطراف کا حکم

جس نے دوسرے کا ہاتھ پہنچے سے عمداً کاٹا، اگرچہ مقطوع کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ بڑا ہو تو ہاتھ ٹھیک ہونے کے بعد اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ٹھیک ہونے سے قبل قصاص نہیں لیا جائے گا، اگر پاؤں یا گھٹنا یا نرمۂ بینی یا کان کاٹا تو بھی یہی حکم ہے، اگر اس کی جڑ سے کاٹا تو قصاص واجب ہوگا۔ کیونکہ مماثلت کی رعایت ممکن ہے۔ اگر کچھ حصہ کاٹا اور مماثلت ممکن ہے تو اس کے بقدر تو قصاص واجب ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ اگر سارا ناک یا کچھ حصہ کاٹ دیا تو قصاص نہیں ہے کیونکہ ناک ایک ہڈی ہے اور ہڈی میں مماثلت ناممکن ہونے کی وجہ سے قصاص نہیں ہے۔ دانت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے کسی آدمی کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے اس کی آنکھ باہر نکل آئی تو قصاص نہیں ہے کیونکہ مماثلت کی رعایت ممکن نہیں ہے اور اس کا معاوضہ دینا واجب ہوگا۔ اگر آنکھ بیٹھی نہیں بلکہ قائم ہے صرف اس کی روشنی جاتی رہی تو قصاص ہوگا بایں طور کہ ضارب کے منہ پر بھیگی ہوئی روئی رکھ کر اس کی آنکھ کے مقابل گرم آئینہ رکھا جائے یہاں تک کہ اس کی روشنی زائل ہو جائے۔ یہ حکم خلافت عثمانیہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تجویز سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ بائیں آنکھ کے بدلے دائیں آنکھ اور دائیں آنکھ کے بدلے بائیں آنکھ، اسی طرح دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور ان کی انگلیاں قصاص میں ماخوذ نہ ہوں گی، دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے بدلے اور ایک ہاتھ کی انگشت شہادت دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت کے بدلے اور ایک ہاتھ کی درمیانی انگلی دوسرے ہاتھ کی درمیانی انگلی کے بدلے میں قصاص کے اندر ماخوذ نہ ہوگی۔ دائیں ہاتھ کا عضو اس کے مثل کے بدلے ماخوذ ہوگا اور بائیں ہاتھ کا بھی بائیں ہاتھ ہی کے بدلے میں ماخوذ ہوگا۔

---

1 (سنن البیہقی ۸/۶۰)

دائیں جانب کے دانت دائیں جانب کے دانت کے بدلے اور سامنے کے دانت سامنے کے دانت کے بدلے، ڈاڑھ، ڈاڑھ کے بدلے قصاص میں ماخوذ ہوں گے۔

اگر دو آدمی کسی کا ہاتھ عمداً کاٹ دیں تو کسی پر بھی قصاص نہ ہوگا اور ان دونوں پر تمام انسان کی نصف دیت ہوگی کیونکہ ہاتھ کی دیت جان کی دیت سے نصف ہوتی ہے اور یہ دیت ان دونوں پر آدھی آدھی ہوگی۔ اگر دو آدمی کسی پر مادون النفس میں جنایت کریں اور وہ جنایت ایسی ہو کہ اس میں ایک پر قصاص واجب ہوتا ہو تو اگر وہ منفرد تھا تو ان دونوں پر قصاص نہیں ہے جیسا کہ اگر دونوں مل کر کسی کا دانت نکال دیں یا ہاتھ یا پاؤں کاٹ دیں تو ان دونوں پر دانت کی دیت لازم ہوگی۔ اس کو ارش بھی کہتے ہیں اگر دو سے زیادہ ہوں تو ان سب پر قصاص نہیں ہوگا اور ان پر برابر طریقہ سے ان کی تعداد کے مطابق ارش (دیت) ہوگی۔

اگر ایک شخص نے دو آدمیوں کے دونوں دائیں ہاتھ کاٹ دیئے اور وہ دونوں حاضر ہوئے تو ان دونوں کو اختیار ہے کہ وہ اس کا بھی دایاں ہاتھ کاٹ دیں اور اس سے نصف دیت لے لیں جس کو وہ نصف نصف تقسیم کرلیں گے کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنا بعض حق لے لیا اور نصف حصہ باقی رہ گیا، پس وہ اس مقدار کے لیے آرش (دیت) کی طرف رجوع کرے گا۔ اگر ان دونوں میں سے ایک حاضر ہوا تو وہ اس کا ہاتھ کاٹے گا۔ اور دوسرے کے لیے نصف دیت ہوگی اور دوسرے کی عدم موجودگی کے باوجود اس کے لیے قطع کا حق ثابت ہوگا کیونکہ اس کا حق سارے ہاتھ میں ثابت ہے اور بعض سے اس کے حق کا سقوط مزاحمت کی وجہ سے ہے۔ پس جب دوسرا غائب تھا تو کوئی مزاحمت نہیں ہے لہٰذا اس کے لیے قصاص لینا جائز ہوگا اور اس پر لازم نہیں کہ وہ غائب کا انتظار کرے کیونکہ غائب شخص مطالبہ بھی کرسکتا ہے اور معاف بھی کرسکتا ہے۔ پس جب غائب شخص حاضر ہوگا تو اس کے ہاتھ کی دیت اس کے لیے تھی، جب ان میں سے ایک نے معاف کردیا تو اس کا حق باطل ہوگیا اور دوسرے کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کا ہاتھ کاٹے۔ جس پر قصاص واجب تھا وہ مرگیا تو محل فوت ہونے کی بنا پر قصاص ساقط ہوجائے گا۔

اگر قاطع کا ہاتھ آسمانی آفت کی وجہ سے ختم ہوگیا تو اس پر کچھ نہ ہوگا کیونکہ جس محل میں قصاص کا تعین تھا وہ موجود نہیں ہے۔ جس نے دوسرے کا ہاتھ قصداً کاٹ کر اس کو عمداً قتل بھی کردیا حالانکہ مقطوع کا ہاتھ ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا تو حاکم چاہے تو حکم دے دے کہ اس کا بھی ہاتھ کاٹ دو، پھر اس کو بھی قتل کردو اور اگر چاہے تو حکم دے کہ اس کو قتل کردو۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک ہاتھ کا حکم ساقط ہوگا اور اس کو قتل کیا جائے گا۔ اگر قاطع کا ہاتھ

شل ہو یا وہ ناقص الاصابع ہو تو مقطوع اگر چاہے تو اسی عیب زدہ ہاتھ کو کٹوا لے اور اگر چاہے تو اپنے ہاتھ کی دیت لے لے کیونکہ پورا حق لینا ناممکن ہے۔ اگر اس کا عیب زدہ ہاتھ گر گیا یا ظلماً کاٹ دیا گیا تو اس پر کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا حق قصاص میں متعین ہے اور وہ اس کے اختیار سے مال بن گیا ہے۔ لہذا فوات محل کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔ اگر ایک آدمی نے دوسرے کے سر پر کاری ضرب لگائی اور اسے زخمی کردیا اور زخمی کرنے والے کا سر چھوٹا ہے تو اس کا حکم بھی مسئلہ سابقہ کی طرح ہوگا اور اگر اس کا سر اس سے بڑا ہے تو زخمی آدمی چاہے تو اپنے زخم کے بقدر کچھ لے لے اور اگر چاہے اس کی ارش (دیت) لے لے۔ اگر زخم نے پیشانی سے اس کی گدی تک کے حصے کو گھیر لیا اور زخمی کرنے والے کی گدی کو نہیں پہنچا تو اسے اختیار ہوگا۔ جو شخص دوسرے کے ہاتھ کو کاٹ دے پھر مقطوع نے قطع یہ معاف کردیا پھر مقطوع مرجائے تو کاٹنے والے پر اسی کے مال میں دیت لازم ہوگی۔ اگر اس نے قطع ید اور اس سے پیش آنے والی صورتحال کو معاف کیا ہو تو وہ جان کی معافی ہوگی اور زخمی کرنے کا حکم وہی ہے جو کاٹنے کا ہے۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں مسئلوں میں عفو عن النفس ہوگا کیونکہ قطع سے معاف کرنا یا زخم سے معاف کرنا اصل میں اس کے حکم سے معاف کرنا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ٹھیک ہو جائے تو ہاتھ کاٹا جائے اور اگر سرایت کرے تو قتل کیا جائے، دونوں میں سے جو بھی متحقق ہوگا معافی اس سے ہوگی۔ اور یہ ایسا ہوگا جیسے اگر وہ جنایت کو معاف کردے تو وہ جنایت مقتصرہ کو شامل ہوگا اور جنایت ساریہ کا حکم بھی یہی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس نے معصوم جان کو عمداً قتل کیا ہے لہذا قیاساً قصاص واجب ہوگا۔ اور معافی قطع سے ہوئی ہے نہ کہ قتل سے۔ البتہ ہم یہ کہیں گے کہ اسی کے مال میں استحساناً دیت واجب ہوگی کیونکہ معافی کی صورت پائی گئی ہے اور یہ چیز ایسے شبہ کا موجب ہے جو قصاص کو ساقط کرنے والا ہے اور اگر اس نے جنایت کو ہی معاف کردیا ہو تو اس کا حکم اس کے خلاف ہے کہ یہ قتل کی معافی ہوگی۔ اسی طرح اگر اس نے اس قطع کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حالت کو معاف کردیا ہو تو یہ بھی اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ عفو عن القتل میں صریح ہے۔
زبان اور ذکر کے کاٹنے میں قصاص نہیں ہوگا، اگرچہ ان کو جڑ سے کاٹ دے کیونکہ زبان سکڑتی اور پھیلتی ہے اس لیے اس میں مساوات کی رعایت ممکن نہیں ہے لیکن اگر ذکر حشفہ (سپاری) کاٹ دی ہو تو قصاص ہوگا کیونکہ قطع کی جگہ مفصل (پہنچا) کی طرح متعین ہے۔ اگر ذکر یا حشفہ کا بعض حصہ کاٹا تو قصاص نہیں ہوگا کیونکہ بعض کی مقدار متعین نہیں ہے۔

اگر ہونٹ کا کچھ حصہ کاٹ دیا تو اس میں قصاص نہ ہوگا کیونکہ اس کا اعتبار کرنا ناممکن ہے لیکن اگر کاٹنے والے نے پورا ہونٹ کاٹ دیا تو قصاص واجب ہوگا۔

اسلحہ تاننے کا حکم

اگر کوئی شخص قتل کے ارادے سے مسلمانوں پر تلوار یا بندوق یا کوئی اور آلۂ حرب سونتے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو قتل کر دیں کیونکہ وہ آدمی باغی (ظالم) ہے اور اپنے سے ضرر کا دفعیہ واجب ہے اور وہ آدمی زیادتی کی وجہ سے معصوم الدم نہ رہا کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من سل السیف فلیس منا یعنی "جو (ہم پر) تلوار سونتے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"[1]

نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا من حمل علینا السلاح فلیس منا "یعنی جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"[2]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا من شہر سیفہ ثم وضعہ فدمہ ھدر یعنی "جو شخص اپنی تلوار نکالے پھر اس کو چلائے تو اس کا خون رائیگاں ہے۔"[3]

نیز حضرت علقمہ بن ابی علقمہ اپنی والدہ سے نقل کرتے ہیں کہ فلاں شخص میرے باپ کا غلام تھا اور میرے والد بعض کاموں پر اس کو ڈانٹتے اور سزا دیا کرتے تھے۔ اور وہ غلام اپنے آقا سے عداوت رکھتا تھا، پس میرے والد نے اس کو بیچ دیا، ایک دن اس غلام سے ان کی ملاقات ہوئی، اس وقت غلام کے پاس تلوار تھی اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے دور امارت کی بات ہے چنانچہ اس غلام نے میرے والد پر تلوار سونتی اور ان پر حملہ کیا تو لوگوں نے اس کو پکڑ لیا، میرے والد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور غلام کی حرکت کی ان کو خبر دی تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "من اشار بحدیدۃ الی احد من المسلمین یرید قتلہ فقد وجب دمہ یعنی "جو شخص کسی مسلمان پر ہتھیار تانے اور اس کا ارادہ اس کو قتل کرنے کا ہو تو اس کا خون واجب ہو جاتا ہے۔" (راویہ) کہتی ہیں کہ اس کے بعد میرے والد وہاں سے نکلے اور غلام کے اس آقا کے پاس گئے جس کے ہاتھ اس کو بیچا تھا، اس سے بیع فسخ کی اور غلام واپس لیا پھر اس کو پکڑا اور قتل کر دیا۔[4]

---

[1] صحیح مسلم ۱/۶۹ [2] صحیح البخاری ۲/۱۰۴۴ [3] المستدرک ۲/۱۵۹

[4] المستدرک ۴/۳۹۷، حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ وترجمہ للذہبی

اگر کوئی شخص رات کو یا دن کو کسی پر اسلحہ (ہتھیار) تانے یا شہر میں رات کے وقت کسی پر لاٹھی اٹھائے یا شہر سے سوا راستہ عام میں دن کو ایسا کام کیا اور دوسرے (جس پر اسلحہ تانا گیا) نے اس کو عمداً قتل کر دیا تو اس پر کچھ لازم نہ ہوگا کیونکہ اسلحہ وہتھیار میں مضروب کو قتل کرنے کیلئے کوئی مدت درکار نہیں ہوتی، پس دوسرے کے لیے جائز ہوگا کہ وہ قتل کے ساتھ اس کو دفع کرلے اور لاٹھی میں اگرچہ مضروب کو قتل کرنے کیلئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے، پس اگر ایسا واقعہ شہر سے باہر یا رات کے وقت پیش آئے تو مضروب کسی سے فریاد کرنے کی استطاعت کا متحمل نہ ہوگا اور کوئی مددگار اسے مل نہ پائے گا، پس وہ (مضروب) اس امر پر مجبور ہوگا کہ وہ ضارب کو قتل کرکے ہی اس سے نجات حاصل کرے۔

اگر کسی دیوانے نے دوسرے پر ہتھیار اٹھایا اور دوسرے (جس پر ہتھیار اٹھایا گیا) نے اس کو عمداً قتل کر دیا تو اس پر دیت ہوگی جو اس کے مال میں واجب ہوگی۔ جس نے دوسرے پر شہر میں ہتھیار اٹھایا اور دوسرے نے اس کو مارا پیٹا پھر کسی دوسرے نے اس کو قتل کر دیا تو دوسرے قاتل پر قصاص ہوگا۔

رات کے وقت کوئی شخص (گھر کے) اندر آیا اور اس نے سامان چرایا اور ساتھ لے گیا، پس وہ (گھر کا مالک) اس کے پیچھے گیا اور اس کو قتل کر دیا تو اس پر کچھ بھی لازم نہ ہوگا۔ اس کی دلیل فہد بن مطرفؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ایک آدمی بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر کوئی شخص میرا مال لوٹنے کیلئے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اسے خدا اور دین اسلام کا واسطہ دو'' اس آدمی نے کہا کہ اگر میں واسطہ بھی دے دوں تو کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اپنے مال کے دفاع میں اس کے ساتھ قتال کرو''۔ اس آدمی نے دریافت کیا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''فی الجنۃ'' یعنی اس صورت میں تم جنت میں جاؤ گے، اس نے عرض کیا کہ اگر میں نے اس کو قتل کر دیا تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''فی النار'' یعنی وہ جہنم میں جائے گا''[1]

دوسرے کے لیے قتل کا یہ جواز اس صورت میں ہے جبکہ قتل کے سوا اس کو ہٹانا اور دور کرنا ممکن نہ ہو۔

---

[1] نصب الرایہ ۴/۳۴۸

کتاب الدیات

دیت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) دیت مغلظہ (۲) دیت غیر مغلظہ۔ دیت مغلظہ کی ادائیگی صرف اونٹوں کے ساتھ ہوتی ہے اور جس دیت میں اونٹ نہ دیے جائیں وہ غیر مغلظہ ہوتی ہے۔

قتل شبہ عمد میں عاقلہ پر دیت مغلظہ واجب ہے۔ اور دیت مغلظہ شیخین کے نزدیک سو اونٹ ہیں، جن میں ایک چوتھائی دو سالہ ایک چوتھائی تین سالہ ایک چوتھائی چار سالہ اور ایک چوتھائی پانچ سالہ ہوں گے۔ جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک تیس اونٹ پانچ سالہ، تیس چار سالہ اور چالیس حاملہ اونٹنیاں ہونی چاہئیں۔ اس مسئلہ میں امام صاحبؒ کا قول ہی مفتی بہ ہے اور قاتل پر کفارہ ہے کہ وہ ایک مومن غلام آزاد کرے اور اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو مسلسل دو مہینے روزے رکھے۔

قتل خطاء میں عاقلہ پر دیت غیر مغلظہ واجب ہے اور قاتل پر کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔ دیت غیر مغلظہ سو اونٹ ہیں جو پانچ اقسام پر مشتمل ہوں گے۔ (۱) بیس عدد دو سالہ اونٹنیاں (۲) بیس عدد دو سالہ اونٹ (۳) بیس عدد تین سالہ اونٹنیاں (۴) بیس چار سالہ اونٹنیاں (۵) بیس پانچ سالہ اونٹنیاں۔

دیت میں سونے کی مقدار ایک ہزار دینار ہیں جو چار کلو گرام سونے کے برابر ہیں اور چاندی کی مقدار دس ہزار درہم یا بارہ ہزار درہم ہے جو ۳۴ کلو گرام اور آٹھ سو گرام چاندی کے برابر ہے۔

حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک دیت کی ادائیگی صرف اونٹ، سونے اور چاندی کی صورت میں ہی ہو سکتی ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک سو گائیوں، ایک ہزار بکریوں اور دو سو کپڑوں کے جوڑوں سے بھی دیت ادا ہو سکتی ہے جبکہ ہر جوڑے میں دو کپڑے ہوں۔

دیت کی قسطوں میں ادائیگی

سنت یہی ہے کہ دیت کو تین سالہ قسطوں میں ادا کیا جائے۔[1]

---

[1] [بیہقی: ۸/۷۰]

عورت کی دیت

حضرت شعبیؒ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ عورتوں کے زخموں کی دیت مردوں سے نصف ہے وہ زخم خواہ ہلکا ہو یا گہرا۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قتل اور زخم وغیرہ میں عورت کی دیت سے مراد ہے آدمی ہے۔ یہ حدیث منقطع ہے مگر امام شعبیؒ کی روایت کیلئے مؤکد ہے۔

قتل کے علاوہ میں دیت

قتل نفس میں دیت واجب ہے اور اس میں چھوٹا، بڑا، رذیل، شریف، مسلم اور ذمی سب برابر ہیں کیونکہ ان کی ذات حرمت اور حفاظت کے اعتبار سے برابر ہے۔

ناک کی نرم ہڈی توڑنے پر دیت واجب ہے کیونکہ اس کے ٹوٹنے سے خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور عضو کے جس حصے کے سبب، جنس منفعت فوت ہو جائے اس میں پوری دیت واجب ہوتی ہے کیونکہ اس سے جسم کیلئے استفادہ ممکن نہیں رہتا اور بدن اس عضو کے اعتبار سے بیکار اور ہلاک شدہ ہی متصور ہوگا۔ اگر ناک کا بانسہ (نتھنا) کاٹ دیا جائے تو اس کے ایک عضو ہونے کی وجہ سے ایک دیت واجب ہوگی۔

حضرت عبداللہ ابن ابی بکرؓ اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو خط لکھا جس میں درج تھا کہ ناک کاٹنے کی دیت سو اونٹ ہے۔[1]

بولنے والے کی زبان کو اگر کاٹ دیا جائے اور اس سے وہ بولنے یا اکثر حروف ادا کرنے سے عاجز آ جائے تو اس صورت میں زبان کاٹنے والے پر کامل دیت واجب ہوگی جبکہ گونگے کی زبان کاٹنے پر ایک عادل آدمی کا فیصلہ معتبر ہوگا۔ حضرت عاصم بن ضمرہؒ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا: زبان میں دیت واجب ہے۔[2]

دونوں آنکھیں ضائع ہونے میں دیت واجب ہے اور دونوں آنکھوں کی پلکیں اور بھنویں ضائع ہونے کی صورت میں بھی دیت واجب ہے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک آنکھ ضائع ہونے میں پچاس اونٹ ہیں۔[3] حضرت زید ابن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ایک آنکھ پلکوں میں ربع دیت واجب ہے۔[4]

---

1. [بیہقی ۸/۸۷]　　2. [بیہقی ۸/۸۲]
3. [بیہقی ۸/۸۲]　　4. [بیہقی ۸/۸۷]

ہونٹوں میں بھی دیت واجب ہے۔ حضرت ابوبکر بن محمدؒ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہل یمن کو خط لکھا جس میں مذکور تھا کہ ہونٹوں کے ضائع ہونے میں دیت واجب ہے۔[1]

کانوں میں بھی دیت واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو خط لکھا جس میں مذکور تھا کہ ایک کان میں پچاس اونٹ دیت ہے۔ ہاتھ اور پاؤں میں بھی دیت واجب ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو خط لکھا جس میں مذکور تھا کہ ہاتھ میں پچاس اونٹ دیت ہے اور پاؤں میں پچاس اونٹ دیت ہے اور ہاتھ پاؤں کی ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں۔[2] تمام انگلیاں خواہ ہاتھ کی ہوں یا پاؤں کی منفعت میں برابر ہونے کی وجہ سے دیت میں بھی برابر ہیں۔ تین جوڑوں والی انگلی کے ایک جوڑ میں انگلی کی دیت کا تیسرا حصہ ہے اور دو جوڑوں والی انگلی کے ایک جوڑ میں انگلی کی نصف دیت ہے۔

کمر میں بھی دیت واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو خط لکھا جس میں مرقوم تھا کہ کمر میں دیت واجب ہے۔[3]

ہر دانت میں پانچ اونٹ دیت ہیں۔ حضرت عاصم بن ضمرہؒ حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ دانت میں پانچ اونٹ دیت ہے۔[4] دانت اور داڑھیں دیت میں برابر ہیں۔ البتہ اگر نکلے ہوئے دانت کی جگہ نیا اگر اُگ آیا تو دیت ساقط ہو جائے گی۔

عورت کے پستان میں نصف دیت واجب ہے۔ حضرت ابن شہابؒ حضرت سعید ابن مسیبؒ سے روایت کرتے ہیں کہ عورت کے ایک پستان میں نصف دیت ہے اور دونوں پستانوں میں پوری دیت واجب ہے۔

سر، داڑھی اور بھنوؤں کے بالوں میں اگر دوبارہ نہ اگیں تو دیت واجب ہے۔ حضرت مکحولؒ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ بالوں میں اگر وہ دوبارہ نہ اگیں تو دیت واجب ہے۔[5]

اگر کسی آدمی کے کسی عضو پر چوٹ لگائی جائے جس سے اس کی افادیت ختم ہو جائے خواہ وہ عضو باقی ہی ہو تو عضو کی کامل دیت واجب ہوگی۔ یہ عضو مقطوع ہی متصور ہوگا۔ جیسے ضرب لگنے سے ہاتھ شل ہو جائے یا آنکھ کا نور چلا جائے کیونکہ عضو کی منفعت کا سلب ہونا خود عضو کے ختم ہونے کی مانند ہے۔

---

1. [بیہقی ۸/۸۸]
2. [بیہقی ۸/۹۱]
3. [بیہقی ۸/۹۵]
4. [بیہقی ۸/۸۹]
5. [بیہقی ۸/۸۹]

مونچھوں اور ٹھوڑی کے بالوں، مرد کے پستان، خصی اور عنین کے ذکر، گونگے کی زبان، شل ہاتھ، کانی آنکھ، لنگڑے پاؤں، سیاہ دانت اور زائد انگلی میں عادل آدمی کے فیصلے موافق دیت واجب ہوگی۔ بچے کے اعضاء کی ظاہری درستگی کو دیکھتے ہوئے ان کے صحیح ہونے کا حکم لگا کر دوسرے پر دیت لازم کرنا درست نہیں۔ بچے کا چیخنا چلانا اور آوازیں نکالنا کلام نہیں ہے بلکہ محض آواز ہے۔ زبان کا صحیح ہونا بات چیت سے ذکر کی درستگی حرکت سے اور آنکھ کی صحت بینائی سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ جب ان اعضاء کا صحیح اور تندرست ہونا معلوم ہو جائے تو بچہ بھی قتل عمد اور خطا میں بالغ کا حکم رکھتا ہے۔

انسانی جسم کے بالوں کی دیت عادل آدمی کے فیصلے کے مطابق ہوگی۔ اگر کان چوٹ لگنے کی وجہ سے بہرے ہو جائیں تو اس میں ایک عادل آدمی کا فیصلہ معتبر ہوگا۔ اسی طرح ناخنوں کے اکھاڑنے میں جب وہ دوبارہ نہ اگیں عادل آدمی کے فیصلے کے موافق دیت ہوگی۔

اگر آدمی کلائی سے ہاتھ کاٹ جائے تو ہتھیلی میں نصف دیت واجب ہوگی جبکہ زائد حصے میں عادل آدمی کے فیصلے کے مطابق دیت واجب ہوگی کیونکہ اس زائد حصے میں نہ تو خوبصورتی ہے اور نہ کوئی فائدہ ہی ہے اگر ہاتھ کہنی سے کاٹا جائے تب بھی یہی حکم ہے۔

اگر کسی آدمی کی ایک انگلی کاٹی گئی اور اس کے سبب دوسری انگلی شل ہوگئی یا کسی کا ایک ہاتھ گیا اور اس کے سبب دوسرا ہاتھ شل ہوگیا تو کاٹنے والے پر قصاص نہیں بلکہ دیت واجب ہوگی کیونکہ اس کا جرم ایک فعل سے متجاوز ہے۔ تو قصاص لینا اس صورت میں ممکن نہیں کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹا جائے اور دوسرا لازمی طور پر ناکام ہو جائے۔ لہٰذا اس صورت میں جان پر مال کی ادائیگی لاگو ہوگی۔ جبکہ صاحبین فرماتے ہیں کہ پہلے مسئلہ میں اس پر قصاص واجب ہوگا اور دوسرے مسئلہ میں دیت کیونکہ عمل جرم متعدد ہیں اور ایک میں سقوط قصاص سے ضروری نہیں کہ دوسرے میں بھی قصاص ساقط ہو جائے۔ اس کی مثال ایسے ہی کہ کوئی شخص ایک عضو کو عمداً اور دوسرے کو خطاءً نقصان پہنچائے۔

اگر کسی نے ایک یا دو انگلیوں والی ہتھیلی (ہاتھ) کاٹ دی تو اس پر انگلیوں کی دیت واجب ہوگی اور ہتھیلی کے بدلے میں کچھ بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ ہتھیلی انگلیوں کے تابع ہے اور گرفت انگلیوں کی مدد سے کی جاتی ہے اور انگلیوں کی کٹائی پر پوری دیت لاگو ہوتی ہے۔ امام صاحب کے نزدیک اصل کا اعتبار کیا جاتا ہے اگرچہ وہ قلیل ہو۔

اگر کسی نے تین انگلیوں والی ہتھیلی کو کاٹ دیا تو اس پر بالاجماع پوری انگلیوں کی دیت

واجب ہوگی کیونکہ امام صاحبؒ کے نزدیک اصول یہی ہے کہ اکثر ہی کل کا حکم لگتا ہے
مجنوں اور بچے کا جان بوجھ کر کوئی کام کرنا بھی غلطی سے کرنے کے حکم میں ہے۔
حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ مجنوں اور بچے کا عمداً کوئی کام کرنا بھی خطا کے حکم میں ہے۔ جب ان کا فعل خطاء کے حکم میں ہے تو ان کی عاقلہ پر صرف دیت واجب ہوگی ان پر قصاص واجب نہیں ہوتا جیسا کہ حدود میں ان پر حد جاری نہیں ہوتی اسی طرح قصاص بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ قصاص سزا ہے اور یہ سزا سے بری ہیں۔ قتل عمد میں قاتل گناہ گار ہوتا ہے لیکن دونوں گناہ گار نہیں ہوتے۔

سر اور جسم کے زخموں کی دیت

''شجعة'' ہر ایسے زخم کو کہتے ہیں جو سر اور چہرے پر لگے جبکہ باقی بدن کے زخموں کو ''جراحة'' کہا جاتا ہے اور یہ کل دس ہیں۔

(۱) الحارصة: ایسا زخم جس میں جلد چھل کر ہلکی سی پھٹ جائے اور خون نہ نکلے۔
(۲) الدامعة: جس میں خون ظاہر ہو جائے لیکن بہے نہ۔
(۳) الدامیة: جس میں خون رسنے لگے۔
(۴) الباضعة: جو کھال کو کاٹ دے۔
(۵) المتلاحمة: جو زخم گوشت تک پہنچ جائے۔
(۶) السمحاق: وہ زخم جو سمحاق تک پہنچ جائے اور سمحاق اس پتلی جھلی کو کہتے ہیں جو سر کی ہڈی اور گوشت کے درمیان ہوتی ہے۔
(۷) الموضحة: وہ زخم جو ہڈی کو ظاہر کر دے۔
(۸) الهاشمة: جو ہڈی کو توڑ دے لیکن ہڈی کا گودا ظاہر نہ ہو۔
(۹) المنقلة: جو ہڈی کو توڑ دے اور گودا ظاہر ہو جائے۔
(۱۰) الامة: وہ زخم جو دماغ تک پہنچ جائے ''امہ'' اس جھلی کو کہتے ہیں جو دماغ کے اندر ہوتی ہے۔

دانستہ سر پر زخم لگانے کا حکم

موضحہ اگر عمداً ہو تو اس میں قصاص ہے۔ نبی کریم ﷺ نے موضحہ میں قصاص کا حکم

ل (المحلی ۸/۹۱)

فرمایا تھا۔ [۱] کیونکہ جب چھری (وغیرہ) ہڈی تک پہنچ جائے تو اسے روکا جا سکتا ہے لہٰذا اس میں مساوات ممکن ہے جس کا اعتبار قصاص میں ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ" (اور زخموں میں بھی قصاص ہے)۔[۲]

موضحہ سے کم زخم میں عادل آدمی کے فیصلے کے مطابق دیت واجب ہوگی کیونکہ ان میں نہ تو کوئی دیت مقرر ہے اور نہ ہی جان کو بغیر سزا کے چھوڑا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ موضحہ سے کم زخم میں عادل آدمی کے فیصلے کے مطابق دیت واجب ہوگی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے موضحہ سے کم زخم میں کسی چیز کو واجب قرار نہیں دیا۔[۳] اور موضحہ کے بعد یعنی ہڈی ٹوٹنے میں بھی قصاص نہیں ہے۔ یہی امام اعظم ابوحنیفہؒ کی روایت ہے۔

خطأً سر پر زخم لگانے کا حکم

موضحہ جب خطا ہو تو اس میں دیت کا بیسواں حصہ واجب ہے ہاشمہ میں دسواں جبکہ منقلہ میں دیت کا دسواں اور بیسواں دونوں واجب ہیں اور آمہ میں اور جائفہ میں دیت کا ثلث واجب ہے۔ بشرطیکہ وہ پیٹ کے پہلوؤں میں سے کسی کی طرف متجاوز نہ ہو اور اگر متجاوز ہو تو اس میں دو ثلث واجب ہے۔ حضرت عمرو بن شعیبؒ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فی الواضح خمس خمس" یعنی موضحہ میں پانچ اونٹ دیت ہے۔[۴]

حضرت عمرو بن شعیبؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے موضحہ میں پانچ اونٹ یا ان کے برابر سونا چاندی یا بکریاں اور منقلہ میں پندرہ اونٹ یا ان کے برابر سونا، چاندی، بکریاں یا گائے دیت میں دینے کا فیصلہ فرمایا تھا۔[۵] حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جائفہ اور آمہ میں ثلث دیت واجب ہے۔[۶] حضرت سعد ابن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جائفہ میں دو ثلث دیت ادا کرنے کا حکم فرمایا تھا۔[۷] حضرت قبیصہ بن ذویبؒ سے روایت ہے کہ حضرت زید ابن حارثہؓ نے فرمایا: دامیہ میں ایک اونٹ، باضعہ میں دو اونٹ، متلاحمہ میں تین اونٹ، سمحاق میں چار اونٹ، موضحہ میں پانچ اونٹ، ہاشمہ میں دس اونٹ اور منقلہ میں پندرہ اونٹ دیت واجب

---

[۱] نصب الرایہ ۴/۳۷۳؛ [۲] المائدہ؛ [۳] نصب الرایہ ۴/۳۷۴؛ [۴] ترمذی ۱/۲۲۴؛
[۵] نصب الرایہ ۴/۳۷۵؛ [۶] المحلی ۸/۸۵؛ [۷] المحلی ۸/۸۵؛

ہے۔ مامومہ میں ثلث دیت واجب ہے اور جس آدمی کی ضرب کی وجہ سے عقل چلی جائے تو اس میں پوری دیت واجب ہے۔ آنکھ کے پپوٹے میں چوتھائی دیت واجب ہے اور پستان کے سرے میں بھی چوتھائی دیت واجب ہے۔[1] یہ روایت موقوف ہے۔

زخم اگر کسی عضو کے نقصان کا سبب بن جائے۔ زخم موضحہ لگنے کی وجہ سے اگر کسی کی عقل چلی گئی یا سر کے بال ختم ہونے کے بعد دوبارہ نہ اگے تو موضحہ کی جنایت دیت میں داخل ہو جائے گی۔ اور زخم لگانے والے فقط دیت واجب ہوگی اور اگر بال دوبارہ اگ آئے تو دیت ساقط ہو جائے گی۔

اور اگر موضحہ کی وجہ سے کسی کی بینائی، شنوائی یا گویائی سلب ہو گئی تو زخم لگانے والے پر دیت اور موضحہ کی جنایت واجب ہوگی۔ یہ حکم جب ہوگا جب جنایت کی وجہ سے موت واقع نہ ہو۔ اگر موت واقع ہوگئی تو پھر جنایت ساقط ہو جائے گی اور جان پر صرف دیت واجب ہوگی۔ اگر جنایت خطأ ہو تو دیت عاقلہ پر ہوگی اور اگر عمداً ہو تو اس کے مال میں سے ہوگی اور یہ احکام اس وقت جاری ہوں گے جب مضروب جراحت کے بعد تین سال کے اندر مر جائے۔

اگر موضحہ میں کسی کی بصارت زائل ہوگئی تو اس صورت میں قصاص واجب نہیں ہوگا اور مناسب یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں صرف دیت ہی واجب ہو۔

زخموں وغیرہ کا قصاص کب لیا جائے گا

موضحہ کا قصاص زخم کے مندمل ہونے تک نہیں لیا جائے گا کیونکہ زخم کی آخری حالت معتبر ہوتی ہے بسا اوقات زخم کی وجہ سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے اور اس پر قتل کے احکام لاگو ہوتے ہیں لہذا زخم ٹھیک ہونے پر ہی حتمی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے کے گھٹنے میں سینگ دے مارا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور قصاص کا مطالبہ کیا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے زخم کے ٹھیک ہونے تک انتظار کرنے کا فرمایا لیکن اس نے انکار کیا اور قصاص لینے میں جلدی کی جب وہ قصاص لے چکا تو اس کی ہڈی ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ ٹوٹ گئی اور وہ لنگڑا ہو گیا اور جس سے قصاص لیا تھا اس کی ٹانگ ٹھیک ہوگئی وہ نبی کریم ﷺ کے پاس دوبارہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تیری جلدی کا نتیجہ ہے۔ اب تیرے لیے کچھ نہیں پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ جس کو

۱۔ نصب الرایہ ۴/۳۷۵

زخم لگے تو وہ اس کے ٹھیک ہونے سے پہلے بدلہ نہ لے بلکہ ٹھیک ہونے کے بعد بدلہ لے۔

جنابت کب ساقط ہوگی

سر یا چہرے پر زخم لگنے کے بعد اگر گوشت مل جائے اور بال اگ آئیں تو دیت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ دیت کا موجب وہ عیب تھا اور وہ ختم ہو گیا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس پر تکلیف کی دیت لازم ہوگی۔ اگر چہ عیب بھی ہو جائے لیکن اس کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف باقی ہے لہٰذا تکلیف کے بدلے میں دیت واجب ہوگی۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس پر طبیب کی اجرت واجب ہوگی کیونکہ اس کے فعل کی وجہ سے اسے اپنے مال میں سے طبیب کو ادائیگی کرنی پڑی گویا اس نے اس کا مال لیا ہے۔ اگر کسی آدمی نے دوسرے کا دانت نکال دیا اب اس کی جگہ اگر دوسرا اگ آئے تو امام صاحب کے نزدیک دیت ساقط ہو جائے گی اور صاحبین کے نزدیک پوری دیت واجب ہوگی۔

بچے کی جنابت

اگر پیٹ پر ضرب لگنے کی وجہ سے عورت نے مردہ بچہ جنا تو اس میں غرہ ہے۔ اور غرہ کی مقدار دیت کا بیسواں حصہ یا پچاس دینار ہیں جو عاقلہ پر واجب ہیں خواہ مرنے والا بچہ ہو یا بچی۔

قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس میں کچھ واجب نہ ہو کیونکہ اس کا زندہ ہونا معلوم نہیں ہے اور ظاہر کو دیکھ کر کسی پر کوئی شے لازم قرار دینا لیکن ہم نے مذکورہ ذیل نص کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں ایک عورت نے اپنی حاملہ سوکن کو خیمے کی چوب مار کر قتل کیا تو نبی کریم ﷺ نے عاقلہ پر اس عورت کی دیت کو واجب قرار دیا اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کے بدلہ غرہ ادا کرنے کا حکم دیا۔[1]

نبی کریم ﷺ نے مذکر و مونث کی تفصیل بیان نہیں فرمائی کیونکہ جنین میں مذکر و مونث کی تمیز متعذر ہوتی ہے اس لیے دفع حرج کے سبب اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

غرہ کی قیمت پانچ سو درہم ہے۔ حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں کہ غرہ کی قیمت پانچ سو درہم ہے اور حضرت ربیعہ فرماتے ہیں کہ غرہ کی قیمت پچاس دینار ہیں۔[2]

---

[1] مسلم ۱۳۰۰/۳ | [2] ابو داؤد ۱۹۳/۴

جنین میں قاتل پر کفارہ نہیں کیونکہ اس کا قتل غیر محقق ہے اگر بچہ زندہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا تو اس صورت میں عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔ اور ضارب پر کفارہ ہوگا۔ کیونکہ اب وہ قاتل بن چکا ہے۔

اگر عورت نے مردہ بچہ جنا اور پھر خود بھی مر گئی تو اس صورت میں دیت اور غرہ دونوں واجب ہوں گے۔

اگر عورت نے مرنے کے بعد مردہ بچہ جنا تو اس صورت میں صرف عورت کی دیت واجب ہوگی اور بچے کے بدلے میں کچھ واجب نہیں ہوگا کیونکہ عورت کی موت بچے کی موت کا سبب ہے۔ بچہ عورت کے سانس لینے کی وجہ سے سانس لیتا ہے اور ماں کے مرنے کے بعد بچے کا زندہ رہنا محال ہوتا ہے اب یہ بات محض احتمال کے درجے میں ہے کہ اس کی موت ضرب کی وجہ سے ہوئی ہو اور شک کی بنا پر غرہ واجب نہیں ہوگا۔

اگر عورت مر گئی اور بچہ زندہ پیدا ہوا لیکن بعد میں مر گیا تو اس آدمی پر دو دیتیں واجب ہوں گی کیونکہ وہ دو انسانوں کے قتل کا سبب بنا ہے۔

اگر عورت نے دو مردہ بچے جنے تو اس صورت میں دو غرے واجب ہوں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنین میں ایک غرہ واجب قرار دیا تھا۔ تو دو جنین میں دو غرے ہوں گے کیونکہ جو شخص ایک ضرب میں دو جانیں لے لے تو اس پر بھی دو دیتیں واجب ہوتی ہیں۔

اگر عورت نے ایک مردہ بچہ جنا اور دوسرا زندہ لیکن بعد از اں وہ بھی مر گیا تو مردہ کے بدلے میں غرہ اور زندہ کے بدلے میں پوری دیت واجب ہوگی۔

اگر بچہ ایک سال کی مدت کے دوران مرا تو غرہ واجب ہوگا ورنہ نہیں۔

راستے سے متعلق کچھ مسائل

اگر کوئی آدمی شارع عام کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو معمولی آدمی کو بھی اعتراض کا اور اس کے تجاوزات ہٹانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ہر آدمی خود گزرنے اور اپنی سواری گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ تو جیسے ملک مشترک میں تجاوز سے روکنے کا ہر مالک کو حق حاصل ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی ہر شخص کو حق حاصل ہوتا ہے۔

جو آدمی راستے کو استعمال میں لاتا ہے یا راستے میں کوئی کام کر رہا ہے تو جب تک مسلمانوں کو اس سے نقصان نہ پہنچے وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ کیونکہ ممانعت نقصان کے پہنچنے کی وجہ

سے ہے اور اگر مسلمانوں کو نقصان پہنچے تو مکروہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "لا ضرر ولا ضرار" (نہ کسی نے نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ)۔

اگر کسی آدمی نے رستے میں گڑھا کھودا یا روشن دان، کنگرہ یا پرنالہ بنایا اور وہ کسی انسان پر گر گیا جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو گیا تو یہ چیزیں بنانے والی کی عاقلہ پر دیت واجب ہوگی کیونکہ مقتول کی موت کا سبب یہی بنا ہے۔ اور اس نے راستے کی فضا کو استعمال کر کے تعدی کی ہے اور قاعدے کے مطابق یہ اسباب ضمان میں سے ہے۔

اگر کوئی شخص گڑھے کے اندر گر جائے تو ضمان اس پر ہوگی جس نے گڑھا کھودا ہے یا کھدوایا ہے۔ اگر پرنالہ کسی آدمی پر گرا اور اس کی وجہ سے وہ مر گیا تو اگر تو پرنالے کا چھت کے باہر والا حصہ اس پر گرا ہے تو پھر اس کے مالک پر ضمان ہوگی۔ اگر چھت کے اندر والا حصہ جس کا وہ مالک ہے وہ اس پر گرا ہے تو پھر اس پر ضمان نہیں ہوگی کیونکہ اس نے پرنالہ اپنی ملک میں لگایا تھا اور اس میں اس نے کوئی تعدی نہیں کی ہے لہٰذا اگر وہ آدمی مر گیا تو اس پر کفارہ بھی نہیں ہوگا اور نہ ہی میراث سے محروم ہوگا کیونکہ حقیقتاً یہ قاتل نہیں ہے۔

اور اگر اس پر پرنالے کی دونوں اطراف اکٹھی گریں تو نصف دیت واجب ہوگی اور نصف ضائع چلی جائے گی۔

اگر کسی آدمی نے راستے کی طرف پرنالہ یا اس جیسی کوئی اور چیز بنائی یا کنگرہ بنایا اپنی ملک سے زائد جگہ پر تعمیر کی اور اس کے بعد مکان بیچ دیا پھر وہ کنگرہ یا زائد چیز کسی شخص پر گری اور وہ مر گیا تو ضمان بائع پر ہوگی کیونکہ اس ملک زائل ہونے کے ساتھ اس کا زائد عمارت بنانے کا فعل ختم نہیں ہوا۔

اگر کسی آدمی نے راستے میں آگ بھڑکائی اور اس نے کسی چیز کو جلا دیا تو یہ شخص ضامن ہوگا کیونکہ اس کام میں اس نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اگر ہوا آگ کو کسی دوسرے مقام پر لے گئی اور پھر آگ نے کسی چیز کو جلا دیا تو یہ ضامن نہیں ہوگا کیونکہ ہوا نے اس کے فعل کو ختم کر دیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اگر اس دن ہوا چل رہی تھی تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ اس کو اس کام کے انجام کا پتہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے یہ کیا تو گویا اس نے خود اس چیز کو جلایا۔

اگر مالک مکان کو گرانے یا ملبہ اٹھانے کیلئے مزدوروں کو لایا اور عمارت گرنے کی وجہ سے کوئی آدمی مر گیا تو اس کی ضمان مزدوروں پر آئے گی کیونکہ یہ ہلاکت ان کے فعل کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور جب تک وہ کام سے فارغ نہیں ہوتے اس وقت تک مالک ان کے کسی بھی

فعل کا ذمہ دار نہیں ہے اور ان کا فعل قتل میں بدل جانے کی بناء پر ان پر کفارہ ہوگا کیونکہ قتل عقد میں داخل نہیں ہے۔

اور اگر مزدوروں کے فارغ ہونے کے بعد مکان گرا تو مالک استحساناً ضامن ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اپنا کام درست طریقے سے انجام دے کر مکان اس کے حوالے کر دیا ہے۔ اب اگر کسی پر مکان گرتا ہے تو یہ مالک کا فعل شمار ہوگا لہٰذا وہ ضامن ہوگا۔

اگر کسی آدمی نے راستے میں پانی بہایا اور وہ جم گیا پھر اگر اس کی وجہ سے کوئی آدمی ہلاک ہوگیا تو اس کی ضمان پانی بہانے والے پر ہوگا کیونکہ اس نے گزرنے والوں کو نقصان پہنچانے کی تعدی کی ہے۔ لیکن یہ حکم اس وقت ہوگا جب پانی زیادہ ہو۔ اگر اس نے عادت کے موافق تھوڑا پانی ڈالا ہو جس سے عام طور پر آدمی نہیں پھسلتا تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔

اگر آدمی جان بوجھ کر اس جگہ سے گزرا جہاں پانی پھیلا ہوا تھا تو پانی گرانے والے ضامن نہیں ہوگا۔ یہ حکم اس وقت ہوگا جب راستے کے کچھ حصے میں پانی ڈالا گیا ہو اور گزرنے والے کیلئے خشک راستے موجود ہو۔ اور اگر سارے راستے میں پانی ڈالا گیا ہو تو ضامن ہوگا کیونکہ رستے سے گزرنا تو مجبوری ہے۔

اگر کسی آدمی نے راستے میں پتھر، مٹی یا ملبہ پھینکا اور اس وجہ سے کوئی آدمی ہلاک ہوگیا تو یہ شخص ضامن ہوگا کیونکہ اس نے تعدی کی ہے۔

ایک آدمی نے راستے کے ایک طرف پتھر پھینکا اور دوسرے آدمی نے اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا پھر اس پتھر کی وجہ سے کوئی آدمی ہلاک ہوا تو ضمان دوسرے شخص پر ہوگی۔ کیونکہ پہلے کے اپنے کام سے فارغ ہونے کی وجہ سے اس کے فعل کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ویسے بھی دوسرے شخص کے فعل کی وجہ سے ہلاک ہوا ہے۔

اگر کسی آدمی نے اپنی ملک میں گڑھا کھودا اور اس میں کوئی آدمی گر گیا تو مالک ضامن نہیں ہوگا کیونکہ اس نے کوئی تعدی نہیں کی۔ اسی طرح اس نے اگر اپنے مملوکہ مکان میں گڑھا کھودا تو بھی یہی حکم ہوگا لیکن اگر اس نے مسلمانوں کی زمین یا تنگ گلی میں مشترکہ زمین میں گڑھا کھودا تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ وہ اس کی ہلاکت کا سبب بننے والا اور تعدی کرنے والا ہے۔

اگر مزدوروں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اس آدمی کا مکان ہے کسی دوسرے کے مکان میں گڑھا کھود دیا تو ان کے نہ جاننے کی وجہ سے یہ اجارہ ظاہراً درست ہے۔ اگر اس گڑھے میں کوئی آدمی گر کر ہلاک ہوگیا تو ضمان جس آدمی نے گڑھا کھدوایا ہے اس پہ ہوگی اور مزدوروں پہ

کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ اگر مزدوروں کو یہ معلوم ہو کہ کھدائی اس آدمی کے مکان میں نہیں ہو رہی تو یہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ کام اس آدمی کی مملوکہ زمین میں نہیں ہو رہا۔ اب اگر اس گڑھے میں گر کر کوئی ہلاک ہوگیا اس کی ضمان مزدور پہ ہوگی۔

اگر مالک نے مزدوروں سے کہا کہ یہ میرا مکان ہے لیکن مجھے اس میں کھدائی کا حق نہیں۔ مزدوروں نے وہ کنواں کھود دیا پھر اس میں کوئی آدمی گر کر مر گیا تو قیاساً ضمان مزدوروں پہ اور استحساناً مالک پہ ہوگی۔

اگر کوئی آدمی راستے میں سامان اٹھائے جا رہا ہو اور وہ سامان کسی شخص پہ گر جائے جس کی وجہ سے وہ مر جائے تو سامان اٹھانے والا ضامن ہوگا۔ اگر وہ شخص خود کسی پہ گر گیا اور دوسرا شخص ہلاک ہوگیا تو بھی اس شخص پر ضمان واجب ہوگی۔ اگر کسی آدمی نے چادر اوڑھی ہوئی تھی اور وہ اس پر اس سے گر گئی جس کی وجہ سے کوئی شخص مر گیا تو اس پر ضمان نہیں ہوگی۔

باب القسامۃ

قسامہ، قسم یقسم قسامہ کا مصدر ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قتل کے بارہ میں قسمیں اٹھانا۔

مقتول ہر ایسی میت کو کہتے ہیں جس پر نشان قتل موجود ہو۔ اگر اس پر نشان قتل موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی طبعی موت مرا ہے۔ قتل کا نشان زخم، چوٹ، گلا گھٹنا، یا آنکھوں یا کانوں سے خون نکلنا ہے۔ کیونکہ ان سے عادۃً خون نہیں نکلتا بلکہ کسی کے فعل کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور اگر خون اس کے منہ، دبر یا ذکر سے نکلے تو وہ مقتول نہیں ہوگا کیونکہ ان مقامات سے بغیر کسی فعل کے عادۃً خون نکل سکتا ہے اور اگر وہ آدمی مقتول نہ ہو تو اس میں قسامہ اور دیت نہیں ہوگی۔ اگر مقتول یا اس کا نصف بدن سے زائد یا نصف بدن اور اس کا صرف سر کسی محلہ میں پایا گیا اور اس کا قاتل معلوم نہیں اور اس کا ولی تمام اہل محلہ یا بعض پر عمداً یا خطاً قتل کا دعویٰ کرے لیکن اس کے پاس کوئی بینہ موجود نہ ہو۔ تو اس محلے میں سے پچاس آدمی چنے جائیں گے جو ان الفاظ کے ساتھ قسم کھائیں گے۔ اللہ کی قسم نہ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں۔

ولی اپنے حق کی وجہ سے دعویٰ ضرور دائر کرے گا اور اگر اس کے پاس بینہ موجود ہوں تو پھر قسم کی ضرورت نہیں جب اہل محلہ پچاس قسمیں اٹھالیں تو مدعیٰ علیہم کی عاقلہ پر دیت ادا کرنا لازم قرار دے دیا جائے گا۔ حضرت سہل بن ابی حثمہ سے روایت ہے حضرت ابن مسعود اور

حضرت عبداللہ بن سہل خیبر گئے اور کھجوروں کے باغ میں دونوں جدا جدا ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن سہل کو اس باغ میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے ورثاء نے یہود پہ قتل کا الزام لگایا۔ ان کے بھائی حضرت عبدالرحمنؓ اور ان کے دو چچازاد حضرت حویصہؓ اور حضرت محیصہؓ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے جو ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ نبی کریم ﷺ سے اپنے بھائی کے قتل کے معاملے میں گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا بڑوں کی تعظیم کرو۔ یا آپ ﷺ نے فرمایا بڑا آدمی بات شروع کرے۔ پھر ان دونوں نے آپ ﷺ سے اپنے بھائی کے بارے میں گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے پچاس آدمی ان کے کسی ایک آدمی پر قسم کھائیں تو اس کی دیت اس پر لازم ہو جائے گی۔ انہوں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جس کام میں ہم موجود نہیں تھے اس پہ قسم کیسے اٹھائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر یہود اپنے پچاس آدمیوں کی قسموں کے ساتھ قسم سے بری ہو جائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ تو کافر ہیں پھر آپ ﷺ نے اپنی طرف سے اس کی دیت ادا کی۔

اگر کوئی شخص جنگل یا دریا میں مقتول پایا جائے تو اس کا خون ضائع ہے۔ اگر اسے کسی دریا یا سمندر کے کنارے قید کیا گیا تو اس کی قسامت و دیت وہاں سے قریبی بستی پہ ہوگی اگر وہاں تک اس کی آواز پہنچ سکتی ہو۔

اگر مقتول کسی گھر میں پایا گیا تو قسامت اس گھر کے مالک اور اس کی عاقلہ پر ہوگی۔ اگر عاقلہ موجود ہو کیونکہ ان پر بھی مالک کی طرح مدد ضروری تھی اس لیے وہ قسامت میں شریک ہوں گے اور اگر عاقلہ موجود نہ ہو تو اسی گھر کے مالک پر قسمیں لوٹائی جائیں گی اور دیت عاقلہ پر لازم ہوگی۔

اگر مقتول کو بستیوں یا دو محلوں کے درمیان پایا گیا تو ان میں سے قریبی بستی یا محلے پر قسامت ہوگی اگر وہاں تک اس کی آواز پہنچ سکتی ہو۔

اگر مقتول بحری جہاز میں پایا گیا تو قسامت ملاحوں اور سواروں پہ ہوگی۔

اگر مقتول محلے کی مسجد میں پایا گیا تو قسامت اہل محلہ پر ہوگی۔

اگر مقتول جامع مسجد یا بڑی سڑک پر پایا گیا تو اس کی دیت بیت المال میں سے ادا کی جائے گی۔ اور قسامت نہیں ہوگی۔

اگر کسی انتہائی زخمی آدمی کو جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا کسی آدمی نے اس کے گھر پہنچا دیا اور وہ اپنے گھر ایک دو دن بعد مر گیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک اسے گھر

پہنچانے والا ضامن نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ کے قیاس کے مطابق وہ ضامن ہوگا کیونکہ وہ آدمی بمنزلہ محلے کا ہے اور اس کا اس کے پاس زخمی حالت میں موجود ہونا محلے میں زخمی حالت میں پائے جانے کے مترادف ہے۔ کسی کے گھر صرف دو آدمی تھے تیسرا کوئی نہیں تھا ان میں سے ایک کو ذبح کر دیا گیا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دوسرا ضامن ہوگا۔

اگر اہل محلہ میں سے دو آدمی اپنے محلے کے علاوہ کسی اور شخص کے خلاف قتل کی گواہی دے دیں تو امام صاحب کے نزدیک ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ذمے سے قتل کے الزام کو ساقط کرنے کیلئے جھوٹ بول رہے ہوں۔

اگر کوئی شخص ایک جگہ زخمی ہوا پھر اسے اس کے گھر منتقل کر دیا گیا بعد میں انہیں زخموں کی وجہ سے اس کا انتقال ہوگیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک قسامت ودیت جہاں وہ زخمی ہوا تھا اس جگہ والوں پر ہوگی۔

قسم کی ابتداء کس سے ہوگی؟

حدیث سابق کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ قسموں کی ابتداء ولی سے ہوگی۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یقسم خمسون منکم علی رجل منهم''۔

جب ظاہر حالات سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مقتول کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔ جیسے مقتول کے ساتھ محلے والوں کی دشمنی اور ان کے درمیان اس کا قتل ہونا تو قسم کی ابتداء ولی سے ہوگی۔ اس کے بعد وہ لوگ ولی کے جواب میں قسمیں اٹھائیں گے اور کہیں گے اللہ کی قسم نہ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک مدعیٰ علیہ قسم اٹھانے کی وجہ سے بری ہو جائے گا اور اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ ہماری دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ قول ہے: ''البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه''[1] گواہ مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدعیٰ علیہ کے ذمے ہے۔ اس حدیث کا نصف حضرت ابن عباس سے مسلم شریف میں مروی ہے۔ نبی کریم نے مدعیٰ علیہ پر قسم کھانے کو لازم قرار دیا۔[2]

حضرت سعید بن مسیبؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قسامۃ کی ابتداء یہود سے کی اور مقتول کی ان کے درمیان موجودگی کی وجہ سے ان پر دیت کو لازم قرار دیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے قسامۃ اور دیت دونوں کو جمع کیا۔ قسامت کو اس وجہ سے شروع کیا گیا ہے تاکہ

---

[1] [ترمذی: ۳۹۸/۲] [2] [مسلم: ۱۳۳۶/۲]

لوگ جھوٹی قسم سے بچنے کیلئے قتل کا اقرار کرلیں اور ان سے قصاص لیا جاسکے نہ کہ اس وجہ سے کہ جب وہ انکار کریں تو ان پر دیت کو واجب قرار دے دیا جائے۔ جب وہ قسم اٹھالیں گے تو وہ قصاص سے بری ہو جائیں گے اور دیت ان پر واجب ہوگی کیونکہ ظاہری طور پر قاتل انہیں میں سے کوئی ہے کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ انہوں نے اس مقتول کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے جیسے قتل خطأ میں ہوتا ہے۔ یہ دیت ان کے انکار کی وجہ سے ان پر واجب نہیں ہوگی۔

اور ولی کی طرف سے قسم کی ابتداء نبی کریم ﷺ کے قول "البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه" کے خلاف ہے اور آپ ﷺ کے انصاری صحابہ کو فرماتے ہوئے اس قول "تحلفون خمسين يميناً وتستحقون قاتلكم" کا مطلب یہ ہے کہ یہ علی سبیل الانکار تھا۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم کافروں کی قسمیں کیسے قبول کرلیں؟ اس وجہ سے اس کلام میں "نون" مذکور ہے اور اگر یہ امر ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے "احلفوا تستحقوا دم صاحبكم" اور اس پر نبی کریم ﷺ کا یہ قول بھی شاہد ہے۔ "اتحلفون خمسين عينا فتستحقون صاحبكم"[1] "جس آدمی کے خلاف تم قسم کھاؤ گے اس پر تمہارا حق ثابت ہو جائے گا۔

قسم کس سے لی جائے گی

قسم اٹھانے کیلئے پچاس آدمیوں کو چننے کا اختیار ولی کو حاصل ہے کیونکہ یمین اس کا حق ہے۔ اور وہ اس کو چنے گا جس پر قتل کا الزام ہے یا ایسے نیک اہل محلّہ کو چنے گا جن کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ وہ جھوٹی قسم سے احتراز کرتے ہیں۔ اور قسم اس لیے لی جاتی ہے تا کہ قاتل معلوم ہو جائے۔ جب اہل محلّہ قسم اٹھالیں گے تو قاضی ان پر دیت لازم قرار دے گا اور نبی کریم ﷺ نے بھی قسامت اور دیت کو جمع فرمایا ہے۔ جیسا کہ حدیث سابق میں گزر چکا ہے۔ اہل محلّہ میں سے اگر کوئی قسم اٹھانے سے انکار کر دے تو اسے قید کرلیا جائے گا۔ کیونکہ قسامت میں یمین نفس حق ہے اور جب وہ اس کے ادا کرنے پر قادر ہے تو دیت ادا کرنے سے یمین اس سے ساقط نہیں ہوگی کیونکہ ولی کا حق یمین ابھی باقی ہے۔ اور دیت اہل محلّہ پر ان کے انکار کی وجہ سے نہیں بلکہ مقتول کی ان کے درمیان موجودگی کی وجہ سے لازم ہوتی ہے۔ بچے، مجنوں اور عورتیں قسامت

---

[1] مسلم: ۳/ ۱۲۹۱]

میں داخل نہیں ہوں گے۔ پہلے دو تو اس وجہ سے کہ وہ قسم اٹھانے کے اہل ہی نہیں اور عورتیں اس وجہ سے کہ وہ اہل نصرت میں سے نہیں۔ جو آدمی قسامت کیلئے چنے گئے ہیں اگر ولی ان کے علاوہ کسی کے اوپر دعویٰ قتل کردے تو ان سے قسامت ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر یہ افراد پچاس سے کم ہوں تو پچاس کا عدد پورا کرنے کیلئے ان افراد پر قسم کو لوٹایا جائے گا۔

ولی سے نہ تو قسم لی جائے گی اور نہ ہی اس کی قسم سے دیت کا فیصلہ لیا جائے گا کیونکہ شریعت میں قسم دفع ضرر کیلئے مشروع ہوتی ہے نہ کہ کسی چیز کے استحقاق کیلئے۔ اور نبی کریم ﷺ نے منکر پر قسم کو اس سے ضرر دور کرنے کیلئے واجب قرار دیا ہے اور آپ ﷺ نے مدعی علیہ پر یمین کو لازم قرار دیا ہے ولی چونکہ محتاج استحقاق ہے اس لیے اس کے حق میں قسم مشروع نہیں کی گئی۔

المعاقل

المعاقل: معقلہ کی جمع ہے یعنی دیات۔ اور دیت کا نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ خون بہنے سے روکتی ہے۔ اور عاقلہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو قاتل کیلئے معین و مددگار ہوں۔ ان کی تعریف گزر چکی ہے اور اگر مجرم کیلئے عاقلہ نہ ہو تو دیت اسی کے مال میں سے ادا نہیں کی جائے گی اور خون ضائع چلا جائے گا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے اگر اس کی عاقلہ بالکل موجود نہ ہوں تو دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی اور مقتول کا خون ضائع نہیں جائے گا۔ اور فقہاء یہ بھی فرماتے ہیں کہ آج کل اگر کچھ لوگ ایک ہی پیشے سے منسلک ہوں تو قاتل کے ہم پیشہ افراد اس کی عاقلہ ہوں گے۔

اگر موجودہ زمانے میں کوئی کسی تنظیم کا رکن ہو اور وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں تو وہ ان کی عاقلہ ہوں گے۔ دیت تین سال قسطوں میں ادا کی جائے گی۔ کسی شخص سے چار درہم سے زائد نہیں لیے جائیں گے اور ہر شخص سے ہر سال درہم وصول کیا جائے گا۔ اگر اس کے ہم پیشہ افراد یا مرد پوری دیت ادا نہ کرسکیں تو ان کے ساتھ عصبات کی ترتیب سے قریبی لوگوں کو ملا لیا جائیگا۔ سب سے پہلے قاتل کے علاتی بھائیوں کو ساتھ ملا یا جائے گا اگر وہ تین سال میں دیت ادا کر سکتے ہیں تو پھر دادا کی اولاد اس میں شریک ہوگی۔ اور اگر وہ بھی ادا نہ کرسکیں تو پھر دادا کے دادا کی اولاد شریک ہوگی حتی کہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ یہ دیت کسی بھی باپ کی اولاد سے ساقط نہیں ہوگی جب تک کہ وہ عاجز نہ آجائے۔ چار درہم آج کل ایک گرام سونے کے برابر ہیں۔

جو تین سالہ قسطوں میں ادا کیا جائے گا۔ قاتل بھی عاقلہ میں موجود ہوگا اور عاقلہ کے ایک مرد کے برابر وہ دیت دے گا۔ عورتوں اور بچوں پر دیت واجب نہیں ہوگی کیونکہ وہ اہل نصرت میں سے نہیں ہیں۔ مسلمان کافر کی اور کافر مسلمان کی عاقلہ میں داخل نہیں۔ عاقلہ دیت کے بیسویں حصے سے کم کی ادائیگی میں شریک نہیں ہوگی اور اس کی مقدار پچاس دینار کے برابر ہے اور یہی مقدار غرہ کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاقلہ کو غرہ ادا کرنے کا حکم تو فرمایا ہے لیکن اس سے کم کا ذکر روایات میں نہیں ملتا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے ایک عورت نے اپنی سوکن اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو قتل کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے بدلہ میں اس عاقلہ کو غرہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔[1]

حضرت شعبی فرماتے ہیں غرہ کی مقدار پانچ سو درہم ہے۔ امام ابو داؤد نے حضرت ربیعہ سے نقل کیا ہے غرہ کی مقدار پچاس دینار ہے۔[2]

عاقلہ دیت کا بیسواں حصہ یا اس سے زائد ہو تو ادا کرے گی۔

اگر دیت کے بیسویں حصے سے کم جنایت ہو تو وہ مجرم کے مال سے ادا کی جائے گی۔

---

[1] ابوداؤد: ۴/۱۹۱ [2] ابوداؤد: ۴/۱۹۳

﴿کتاب الوصایا﴾

وصایا وصیۃ کی جمع ہے۔ وصیت موصی الیہ سے سے وہ کام کا چاہتا ہے جس کا فائدہ موصی کو ہو۔ اور موصی الیہ یہ کام موصی کی غیر موجودگی یا اس کی وفات کے بعد کرے گا۔ جیسے اس کا قرض ادا کرنا یا اس کی ضروریات پوری کرنا اور اس کے بعد اس کے ورثاء کے مصالح کا خیال رکھنا اور اس کی وصیتوں کو نافذ کرنا۔

''استیصاء'' وصیت کے قبول کرنے کو کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کی وصیت کو قبول کرے تو کہا جاتا ہے فلان استوصی من فلان نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''استوصوا بالنساء .....'' (یعنی عورتوں کے بارے میں میری وصیت قبول کرو)۔[1]

وصیت کرنا سنت ہے اس کا مشروع ہونا کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ''

یہ اس کے مشروع ہونے کی دلیل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ میں مکہ میں بیمار تھا نبی کریم ﷺ میری عیادت کیلئے تشریف لائے اور آپ ﷺ اس کو ناپسند فرماتے تھے کہ آدمی کی موت وہاں آئے جہاں سے وہ ہجرت کر چکا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ ابن عفراء پر رحم فرما۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے تمام مال کی وصیت کردوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، پھر میں نے عرض کیا میں آدھے مال کی وصیت کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے کہا میں اپنے تہائی مال کی وصیت کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا تہائی مال کی وصیت کرنا بہت ہے۔ تو اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں محتاج چھوڑ جائے اور لوگ ان کی ہتھیلیوں پر خیرات رکھتے پھریں۔ تو جو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے۔ حتیٰ کہ جو لقمہ تو اپنی بیوی کے منہ میں رکھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ اور قریب ہے کہ تجھے موت آجائے اور کچھ لوگوں کو تجھ سے نفع پہنچے اور کچھ لوگ تیری وجہ سے نقصان اٹھائیں اور اس وقت ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔[2]

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ان اللہ عزوجل حد تصدق علیکم بثلث اموالکم عند وفاتکم زیارۃ فی حسناتکم لیجعلھالکم زکوۃ فی اعمالکم''

---

[1] [بخاری ۹،۴۷ [2] [بخاری: ۵۵۵]

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے اعمال کی زکوٰۃ کیلئے تمہیں وفات کے وقت ثلث مال کی وصیت کی اجازت دے دی ہے"۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن سابقہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ماحق امری مسلم یبیت لیلتین وله مایوصی فیه الاوصیة مکتوبة عنده"[1] "کسی مسلمان کیلئے یہ درست نہیں کہ وہ دو راتیں اس حال میں گزارے کہ اس کے پاس قابل وصیت چیز موجود ہو اور وہ اس میں وصیت نہ کرے"۔

یہ تمام روایات وصیت کے مستحب وپسندیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

قرض وصیت پر مقدم ہوتا ہے

دین میراث اور وصیت پر مقدم ہوگا کیونکہ دین واجب ہے اور وصیت مستحب ہے اور واجب مستحب پر مقدم ہوتا ہے پھر وصیت اور دین میراث سے مقدم ہوں گے کیونکہ قرآن میں میراث کا ذکر ان دونوں کے بعد ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ" "وصیت کے بعد جو کر کے مرے یا ادائے قرض کے بعد" (النساء ۱۱) اگر اعتراض ہو کہ یہاں پر وصیت کا ذکر دین سے پہلے ہوا ہے لیکن وصیت دین سے مقدم نہیں ہوگی۔ اس کا جواب ہے کہ کلمہ "او" ترتیب کو ضروری قرار نہیں دیتا بلکہ اس آیت میں او کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب یہ دونوں الگ الگ ہوں تو میراث کو ان میں سے ہر ایک کے بعد تقسیم کیا جائے گا اور جب یہ دونوں اکٹھے ہوں تو دونوں کے بعد میراث کو تقسیم کیا جائے گا۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وصیت پوری کرنے سے پہلے دین ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وارث کیلئے وصیت نہیں ہے۔[2]

وصیت بہتر ہے یا ترک وصیت

اگر ورثاء فقیر ہوں اور میراث کی ان کو ضرورت ہو تو وصیت نہ کرنا اولیٰ ہے۔ اور اگر ورثاء غنی ہوں یا اپنے حصے کی میراث کی انہیں ضرورت نہ ہے تو وصیت کرنا اولیٰ نہیں ہے۔ امام ابو یوسف سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس کے بچے چھوٹے ہوں آیا وہ وصیت کرے یا نہ کرے۔ آپ نے فرمایا اس کا ورثاء کیلئے مال چھوڑنا افضل ہے۔

۱۔ ترمذی ۲۹۲/۳ ۲۔ نصب الرایہ ۴۰۵/۴

وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی

وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عثم عمرو بن خارجہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ دیا اور میں اس کی گردن کے نیچے کھڑا تھا وہ جگالی کررہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں کندھوں کے درمیان گررہا تھا' میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: "ان اللہ عزوجل اعطی کل ذی حق حصہ فلاوصیۃ لوارث والولد للفراش وللعاھر الحجر"۔

"اللہ پاک نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے اور وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں اور بچہ خاوند کا ہے اور زانی کیلئے پتھر ہیں۔"

وصیت میں کسی کو ضرر پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ اس کی تشریح کی گئی ہے کہ وارث کیلئے وصیت کرنا یا ثلث مال سے زیادہ میں وصیت کرنا کسی کو ضرر پہنچانا ہے۔ وارث کا وصیت کے وقت وارث ہونا معتبر نہیں بلکہ مورث کی موت کے وقت وارث ہونا معتبر مانا جائے گا جو آدمی وصیت کے وقت غیر وارث تھا اور موت کے وقت وارث بن گیا تو اس کیلئے وصیت صحیح نہیں ہوگی۔

جیسے ایک آدمی نے اپنی بیوی کیلئے وصیت کی پھر اسے طلاق دے دی جس سے بائنہ ہوگئی تو اس کیلئے وصیت درست ہوگی اور اگر اس نے کسی اجنبیہ کیلئے وصیت کی اور پھر اس کے ساتھ شادی کی اور اس کے ساتھ حالت میں ہی خاوند فوت ہوگیا تو وہ وارث نہیں ہوگی۔

اگر مورث کی موت کے بعد ورثاء اجازت دے دیں تو وارث کیلئے وصیت صحیح ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ وارث بالغ اور صحیح العقول ہوں۔ اگر کوئی شخص ایک وارث اور ایک اجنبی کیلئے وصیت کرے تو اجنبی کو اس وصیت کردہ مال میں سے آدھا ملے گا اور وارث کیلئے وصیت باطل ہو جائے گی۔ اسی طرح ہے اگر کوئی شخص کسی اجنبی اور قاتل وارث کیلئے وصیت کرے۔

ایک تہائی مال سے زیادہ کے بارہ میں وصیت کا حکم

اگر مورث کی موت کے بعد ورثاء اجازت دے دیں تو ثلث مال سے زائد میں بھی وصیت درست ہوگی بشرطیکہ ورثاء بالغ اور کامل العقل ہوں۔

اگر ورثاء میں سے بعض نے بعض کیلئے یا موصی لہ کیلئے اجازت دے دی اور بعض نے

ل [ترمذی: ۲۹۳/۲]

نہیں دی تو جس نے اجازت دی ہے اس کے حصے کی بقدر وصیت نافذ ہو جائے گی اور جس نے اجازت نہیں دی اس کے حق میں یہ وصیت باطل ہوگی اور جس نے اجازت دے دی ہے اس کے حق میں ایسا سمجھا جائے گا گویا سب نے اجازت دے دی ہے اور جس نے اجازت نہیں دی اس کے حق میں یہ سمجھا جائے گا گویا سب نے اجازت نہیں دی۔

صورت مسئلہ: مورث نے دو بیٹے چھوڑے اور اپنے آدھے مال کی وصیت کی۔ اب اگر سب نے اجازت دے دی تو مال ان کے درمیان ارباعاً تقسیم ہوگا۔ دو ربع موصی لہ کیلئے ہوں گے اور دو ربع دونوں بیٹوں کیلئے ہوں گے اور اگر دونوں نے اجازت نہ دی تو مال ان کے درمیان اثلاثاً تقسیم ہوگا۔ ایک ثلث موصی لہ کیلئے ہوگا اور دو ثلث دونوں بیٹوں کیلئے ہوں گے۔ اگر ایک نے اجازت دے دی اور دوسرے نے اجازت نہیں دی تو جس نے اجازت دے دی ہے تو اس کے حق میں یہ سمجھا جائے گا گویا سب نے اجازت دے دی ہے اور مجیز کو ربع مال ملے گا اور جس نے اجازت نہیں دی ہے اس کے حق میں یہ سمجھا جائے گا گویا سب نے اجازت نہیں دی ہے اور اس کو ثلث مال ملے گا اور باقی موصی لہ کیلئے ہوگا۔ گویا لڑکے میں ۱۲/۳ مجیز کیلئے ہوگا اور ۱۲/۴ غیر مجیز کیلئے اور ۱۲/۵ موصی لہ کیلئے ہوگا۔

اگر کوئی وارث ایسا ہو جو جمیع میراث کا مستحق ہو تو اس وقت ثلث سے زائد مال میں وصیت کرنا بالکل جائز نہیں۔

اگر وارث ایسا ہو جو جمیع میراث کا مستحق نہ ہو جیسے میاں بیوی تو پھر مورث کو ثلث مال سے زائد میں وصیت کرنا بھی جائز ہے کیونکہ ان کیلئے میراث میں ایک حصہ مقرر ہے اور وہ کسی مال میں بھی اس سے زائد کے حق دار نہیں ہو سکتے اور جو اس سے زائد مال ہے وہ موصی کا ہے اور اس میں کسی کا حق نہیں ہے لہٰذا اس کیلئے اس میں وصیت کرنا جائز ہے۔ اسی وجہ سے امام محمدؒ فرماتے ہیں اگر بیوی نے ورثاء میں صرف خاوند چھوڑا اور کسی اجنبی کیلئے اپنے نصف مال کی وصیت کر دی تو یہ وصیت جائز ہے۔ اور زوج کیلئے ثلث مال ہوگا۔ اور موصی لہ کیلئے نصف مال ہوگا اور باقی سدس بیت المال کا ہوگا۔ زوج ثلث کا حق دار اس لیے ہوگا کیونکہ وہ اخراج وصیت کے بعد مستحق میراث ہوتا ہے تو پہلے موصی لہ کیلئے ثلث مال نکالا جائے گا کیونکہ وہ ہر حال میں اس کا مستحق ہے۔ اس کے بعد دو ثلث باقی بچیں گے ان میں نصف کا زوج اور ثلث کا نصف مال کو پورا کرنے کیلئے موصی لہ اور باقی سدس جس کا کوئی مستحق نہیں بیت المال مالک ہوگا۔

کیا بیوی خاوند کیلئے وصیت کر سکتی ہے

اگر بیوی کا وارث صرف خاوند ہو تو بیوی اس کیلئے وصیت کر سکتی ہے اگر بیوی نے خاوند کیلئے آدھے مال کی وصیت کی تو سارا مال خاوند کا ہوگا آدھا بطور میراث اور آدھا بطور وصیت کیونکہ خاوند میراث سے پہلے وصیت کا مستحق نہیں۔ بخلاف اجنبی کے کیونکہ خاوند وارث ہے۔

خاوند کیلئے وصیت اس لیے جائز ہے کیونکہ اور کوئی ایسا وارث موجود نہیں جس کی اجازت پر صحت وصیت موقوف ہو۔

اگر خاوند کی وارث صرف بیوی اور خاوند کسی دوسرے شخص کیلئے اپنے جمع مال کی وصیت کر دے تو بیوی کیلئے سدس ہوگا اور باقی پانچ سدس موصی لہ کیلئے ہوں گے کیونکہ عورت کو وصیت کردہ ثلث مال نکالنے کے بعد باقی میراث میں سے حصہ ملے گا اور ثلث نکالنے کے بعد باقی مال کے ربع کی مالک بیوی ہوگی اور باقی موصی لہ کیلئے ہوگا۔

کافر اور ذمی کیلئے وصیت

مسلمان کا ذمی کیلئے اور ذمی کا مسلمان کیلئے وصیت کرنا جائز ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ“ (الممتحنة: ۸) ”اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑے نہیں تم سے دین میں اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی۔“

موت کے بعد قبول وصیت

وصیت موصی لہ کے قبول کرنے پر موقوف ہوتی ہے۔ اور وصیت کہتے ہیں کہ عقد کے ذریعے مالک بنانا ہے اس لیے یہ بھی ہبہ اور بیع کے ذریعے مالک بنانے کی طرح قبول پر موقوف ہوگی۔ اگر قبول کرنا موت کے بعد پایا گیا تو وصیت پوری ہو جائے گی اور اگر قبول کرنا موت سے پہلے پایا گیا تو اس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوگا۔ جب موصی فوت ہو جائے تو موصی لہ سے اس کی ملک زائل ہو جائے گی کیونکہ موت کی وجہ سے ملک ختم ہو جاتی ہے اور یہ موصی بہ موصی لہ کی ملک میں بھی داخل نہیں ہوگی کیونکہ یہ اس کے قبول کرنے پر موقوف ہے اور ورثاء بھی موصی لہ کا اس میں حق ہونے کی وجہ سے اس کے مالک نہیں ہوں گے۔ اور اگر موصی لہ نے موصی کی حیات میں وصیت کو قبول کر لیا یا رد کر دیا تو یہ باطل ہے کیونکہ اس کی ملکیت تو اس میں موت کے

بعد ثابت ہوئی ہے۔ پھر اگر اس نے موصی کی موت کے بعد وصیت کو قبول کیا تو اس کی ملک اس میں ثابت ہو جائے گی خواہ وہ وصیت پر قبضہ کرے یا نہ کرے۔

وصیت کو قبول کرنا اور رد کرنا

اگر موصی نے کسی کیلئے وصیت کی موصی لہ نے موصی کے سامنے تو اسے قبول کر لیا لیکن اس کی غیر موجودگی میں رد کر دیا تو اس رد کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اگر اس کے سامنے رد کر دے تو وصیت باطل ہو جائے گی اور اگر وہ نہ قبول کرے اور نہ ہی رد کرے حتیٰ کہ موصی مر جائے تو اسے اختیار ہے۔ اگر چاہے تو قبول کرے اور اگر چاہے تو رد کر دے۔

موصی لہ موصی بہ کا کب مالک بنتا ہے

موصی لہ موصی بہ کا قبول کے بعد مالک بن جاتا ہے سوائے ایک مسئلہ کے کہ اس میں موصی لہ بغیر قبول کیے بھی مالک بن جاتا ہے۔

وہ مسئلہ یہ ہے کہ موصی فوت ہو جائے اور موصی لہ بھی قبول اور رد سے پہلے فوت ہو جائے تو موصی بہ موصی لہ کے ورثاء کی ملک میں چلا جائے گا کیونکہ موصی کی موت کی وجہ سے اس کی طرف سے تو وصیت تمام ہوگئی۔ اب موصی لہ کے قبول ورد پر موقوف تھی لیکن اس کی موت کی وجہ سے اس کی ملک میں داخل ہوگئی۔

کیا موصی وصیت سے رجوع کر سکتا ہے

موصی اپنے قول وفعل کے ذریعے وصیت سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور جواز رجوع اس وجہ سے ہے کہ یہ تبرع ہے جو موصی کی موت اور موصی لہ کے قبول پر تام ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے تام ہونے سے پہلے رجوع جائز ہے اور اگر اس کو اس کے تام ہونے سے پہلے لازم قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تبرع نہ ہوا اگر موصی نے رجوع کرنا ہو تو یہ کہہ کر رجوع کرے کہ میں نے اپنی وصیت سے رجوع کیا یا میں نے اسے باطل کیا یا ایسے اور الفاظ استعمال کرے۔ فعل کے ذریعے رجوع ایسے ہو سکتا ہے کہ موصی کوئی ایسا فعل کرے جس کے ذریعے موصی بہ سے اس کی ملک زائل ہو جائے جیسے بیع اور ہبہ وغیرہ اور جب اس کی ملک زائل ہوگی تو وصیت باطل ہو جائے گی۔

امام محمدؒ کے ہاں جس نے وصیت سے انکار کر دیا تو اس کا انکار رجوع نہیں ہوگا۔ امام

ابو یوسفؒ کے ہاں انکار رجوع شمار ہوگا لیکن امام محمدؒ کے قول کو امام ابو یوسفؒ کے قول پر ترجیح دی گئی ہے۔

دو افراد کے بارے میں وصیت کا حکم

طرفین کے نزدیک وصیین میں سے ایک کو دوسرے کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق حاصل نہیں جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر تصرف کرسکتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ وصی بنانا ولایت ہے اور یہ ایک وصف شرعی ہے جو تقسیم نہیں ہوسکتا اس وجہ سے ان دونوں میں ہر ایک کیلئے ولایت کاملہ ثابت ہوگی جیسے نکاح کرانے میں دونوں بھائیوں کو برابر کی ولایت کاملہ حاصل ہوتی ہے۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ یہ ولایت تفویض کے ساتھ ثابت ہوئی ہے اور اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے ان دونوں کو تفویض کس وجہ سے کی ہے؟ اس نے تفویض اس وجہ سے کی ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں مل کر اکٹھے تمام تصرفات کریں اور ایک آدمی کا تصرف دو کا تصرف نہیں ہوسکتا۔ بخلاف ولایۃ النکاح بالاخوین کے کیونکہ وہاں سبب قرابت ہے جو کامل طریقے سے ہر ایک کے ساتھ قائم ہے۔

اس میں سے اشیاء ضرور یہ جو ولایت سے تعلق نہیں رکھتیں مستثنیٰ ہوں گی جیسے میت کی تجہیز وتکفین کا سامان خریدنا کیونکہ اس کی تاخیر سے میت کے خراب ہونے کا خدشہ ہے اور بچوں کے نقصان سے بچاؤ کیلئے ان کا کھانا اور کپڑے خریدنا اور ودیعت کا بعینہ لوٹانا اور مغصوب شدہ شے اور شراء فاسد کے ذریعے خریدی ہوئی چیز کو لوٹانا اور موصی کے مال کی حفاظت کرنا اور اس کے قرض کو ادا کرنا اور اس کی کسی معینہ وصیت کو نافذ کرنا اور میت کے حقوق کیلئے جھگڑنا اور میت کے بکھرے ہوئے اموال کو جمع کرنا کیونکہ تاخیر سے ان کے نا ملنے کا خدشہ ہے کیونکہ جس کے ہاتھ بھی آئیں گے وہ ان کا مالک بن جائے گا۔ ان ذکر کردہ اشیاء میں چونکہ اجتماع متعذر ہے اس لیے وصیین میں سے ہر ایک الگ سے تصرف کرسکتا ہے۔

متفرق مسائل

موصی نے پہلے ایک آدمی کیلئے ثلث مال کی وصیت کی اور پھر ایک دوسرے شخص کیلئے بھی ثلث مال کی وصیت کی لیکن ورثاء نے اس کی اس وصیت کو جائز نہ رکھا تو ان دونوں کے درمیان ایک ثلث آدھا آدھا تقسیم ہوگا۔

موصی نے ایک شخص کیلئے ثلث مال اور دوسرے کیلئے سدس مال کی وصیت کی لیکن ورثاء نے اس کی وصیت کو جائز نہ رکھا تو ثلث ان دونوں کے درمیان اثلاثاً تقسیم ہوگا پہلے کو دو حصے اور دوسرے کو ایک حصہ ملے گا۔

موصی نے ایک شخص کیلئے اپنے جمیع مال اور دوسرے کیلئے ثلث مال کی وصیت کی لیکن ورثاء نے اس کی وصیت کو جائز نہ رکھا تو صاحبین کے نزدیک ثلث ان دونوں کے درمیان چار حصوں میں تقسیم ہوگا۔ پہلے کیلئے تین حصے ہوں گے اور دوسرے کیلئے ایک حصہ ہوگا۔

کیونکہ اس نے اول کیلئے کل مال کی وصیت کی اور وہ تین اثلاث ہیں اور دوسرے کیلئے ثلث کی وصیت کی تو کل مجموعہ چار اثلاث ہو گئے۔ جب ورثاء نے اس کی وصیت کو جائز نہ رکھا تو میت کیلئے صرف ثلث مال میں تصرف باقی رہا تو ہم نے اس ثلث کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ دوسرے کو دے دیا اور تین حصے پہلے کو دے دیئے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ثلث ان دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا کیونکہ عدم اجازت کی وجہ سے اس نے غیر مشروع وصیت کی لہٰذا یہ وصیت بالکل باطل ہو جائے گی اور ان میں سے ہر ایک کیلئے ثلث مال کی وصیت رہ جائے گی۔

موصی پر قرض اس قدر تھا جو اس کے جمیع مال کا احاطہ کیے ہوئے تھا تو اس کی وصیت جائز نہیں ہوگی کیونکہ قرض وصیت پر مقدم ہے اور قرض کا ادا کرنا فرض ہے اور وصیت پر عمل کرنا تبرع ہے لیکن اگر قرض خواہ اپنا قرض معاف کر دیں تو پھر قرض باقی نہ رہنے کی وجہ سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی۔

موصی نے اپنے بیٹے کے حصے کی وصیت کی تو اس وصیت مال غیر میں ہونے کی وجہ سے باطل ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس نے اپنے بیٹے کے حصے کے مثل مال کی وصیت کی تو یہ وصیت جائز ہوگی۔ اگر موصی کے دو بیٹے ہوں تو موصی لہ کیلئے ثلث ہوگا اگر ایک بیٹا ہو اور وہ اجازت دے دے تو موصی کیلئے نصف مال ہوگا ورنہ اس کیلئے ثلث مال ہوگا۔ حضرت ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں سہم کلام عرب میں سدس کو کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب بن قعقاع نے امام حسن سے روایت کیا ہے جس جس شخص کیلئے ایک سہم کی وصیت کی جائے اس کیلئے ہر حال میں سدس ہوگا۔[1]

اور یہی قول امام ابوحنیفہ کا ہے اور یہی اصح ہے۔ صاحبین کے نزدیک اس سے کم از کم

[1] نصب الرایہ ۴۰۸/۴

حصہ ہوگا لیکن اگر وہ ثلث سے بڑھ جائے تو اسے ثلث دیا جائے گا۔

موصی نے اگر کسی کیلئے اپنے مال میں سے ایک جز کی وصیت کی تو ورثاء جو چاہیں موصی لہ کیلئے دے سکتے ہیں۔ یہ ایسے بھی ہوگا کہ موصی نے جز کے مقرر کرنے کو ورثاء پر چھوڑ دیا ہے اور یہ قلیل وکثیر سب کو شامل ہوگا اور اس میں جہالت صحت وصیت سے مانع نہیں ہے۔ موصی نے حقوق اللہ ادا کرنے کی وصیت کی لیکن ثلث مال سے ان کی ادائیگی نہ ہوسکی تو فرائض کو غیر فرائض پر مقدم کیا جائے گا خواہ موصی نے ان کو مقدم کیا ہو یا موخر کیا ہو کیونکہ ان کا ادا کرنا اہم ہے۔ جیسے حج، زکوٰۃ، کفارات وغیرہ اور اگر یہ سب برابر ہوں یعنی سب فرائض یا واجبات ہوں تو اسے شروع کیا جائے گا جس کو موصی نے مقدم کیا ہے اور اگر حقوق غیر واجبہ ہوں تو جس کو موصی نے مقدم کیا ہے اسے مقدم کیا جائے گا۔

موصی نے حج کرانے کی وصیت کی تو اس کے شہر میں سے ایک شخص اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ موصی پر اسی شہر سے حج کرنا واجب ہے اور وصیت خود پر واجب شدہ چیز کو ادا کرنے کیلئے کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے مال سے اتنے کا اعتبار کیا جائے گا جو اس کے شہر سے حج کرنے کیلئے کافی ہو جائے۔

اگر اس کے شہر سے اس کے ثلث مال میں حج نہ ہو سکے تو امکانی حد تک وصیت نافذ کرنے کیلئے جہاں سے ثلث مال کافی ہو وہیں سے کسی کو حج کرا دیا جائے۔

جو آدمی اپنے گھر سے حج کرنے کیلئے نکلا لیکن مناسک حج ادا کرنے سے پہلے فوت ہوگیا اور اس نے اپنی طرف سے حج کرنے کی وصیت کی تو امام صاحب کے نزدیک اس کی طرف سے اس کے شہر سے حج ادا کیا جائے گا۔ اور اس کی وصیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے شہر سے کسی کو حج کرایا جائے۔ صاحبین کے نزدیک جہاں وہ فوت ہوا ہے وہیں سے کسی کو حج کرایا جائے لیکن صحیح قول امام صاحب کا ہے۔

اگر کسی نے اپنے پڑوسیوں کیلئے وصیت کی تو امام صاحب کے نزدیک یہ صرف ان کیلئے ہوگی جن کے گھر ان کے ساتھ ملے ہوئے ہوں کیونکہ جوار کا معنی قریبی لوگ ہیں اور حقیقت میں قریبی لوگ وہی ہیں جن کے گھر متصل ہوں۔ اور صاحبین کے نزدیک جو لوگ محلہ کی مسجد میں جمع ہوتے ہیں وہ سارے اس میں شریک ہوں گے خواہ ان کے گھر ساتھ ملے ہوئے ہوں یا نہ ملے ہوئے ہوں اور صحیح قول امام صاحب کا ہی ہے۔

جس شخص نے اپنے سسرالیوں کیلئے وصیت کی تو اس کی وصیت اس کی بیوی کے ہر ذی

رحم محرم باپ، چچا، ماموں اور خالہ وغیرہ کیلئے ہوگی۔

جس شخص نے اپنے داماد کیلئے وصیت کی تو اس کی وصیت اس کی ہر ذی رحم محرم عورت کے خاوند کے ملئے ہوگی یعنی اس کی بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کے خاوندوں کیلئے۔

امام قہستانی فرماتے ہیں مناسب یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں سسرال کیلئے کی گئی وصیت کو سسر کے ساتھ اور داماد کیلئے کی گئی وصیت کو بیٹی کے خاوند کے لئے خاص کر دیا جائے کیونکہ ہمارے ہاں یہی مشہور ہے۔

جس شخص نے اپنے اقارب اور ارحام کیلئے وصیت کی تو اس شخص کی وصیت ہر ذی رحم محرم کیلئے الاقرب فالاقرب کے اعتبار سے نافذ ہوگی۔ اور اس میں اس کے والدین اور اولاد شامل نہیں ہوگی کیونکہ ان کو اقارب نہیں کہتے۔ جو شخص والد کو اقارب میں شمار کرتا ہے تو یہ اس کی طرف نافرمانی سمجھی جائے گی کیونکہ اقارب ان کو کہتے ہیں جو آدمی کے کسی واسطہ کے ساتھ قریب ہوں اور والد اور اولاد بندے سے بغیر کسی واسطے کے از خود قریب ہوتے ہیں۔

اور اس صورت میں اس کی وصیت دو یا زیادہ افراد کیلئے ہوگی کیونکہ اس نے لفظ جمع ذکر کیا ہے اور وصیت میں میراث کی طرح اقل جمع دو افراد ہوتے ہیں۔

اگر موصی نے اپنے اقرباء کیلئے وصیت کی اور اس کے دو چچا اور دو ماموں ہوں تو امام صاحب کے نزدیک اس کی تمام وصیت چچاؤں کیلئے ہوگی۔ اقرب کا اعتبار کرتے ہوئے جیسے کہ میراث میں کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا ایک چچا اور دو ماموں ہیں تو پھر چچا کیلئے نصف وصیت اور نصف وصیت ماموؤں کیلئے ہوگی۔ چچا کو باوجود زیادہ حق دار ہونے کی وجہ سے ساری وصیت نہیں دی جائے گی کیونکہ کم از کم دو افراد کا ہونا ضروری ہے۔

اور اگر اکیلا اس کا چچا ہو تو امام صاحب کے نزدیک اس کو نصف ثلث ملے گا اور صاحبین کے نزدیک اس کو پورا ثلث ملے گا۔ اگر اس کا چچا چچی اور ماموں ہوں تو چچا اور چچی کیلئے وصیت برابر برابر ہوگی کیونکہ وہ قرابت میں برابر ہیں اور یہ قرابت ننھیالی قرابت سے قوی ہے چچی اگرچہ وارث نہیں ہوتی لیکن وہ میت کے قریبی ہونے کی وجہ سے وصیت کی مستحق ہوگی۔

اگر اس نے اپنے ذی قرابت یا ذی نسب کیلئے وصیت کی تو پھر بھی تقسیم کی صورت یہی ہوگی۔ مگر اس صورت میں اکیلا شخص بھی بالا جماع کل وصیت کا مستحق ہوسکتا ہے کیونکہ لفظ "ذی" مفرد ہے۔ جب اس نے اپنے رشتہ داروں کیلئے اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے اعتبار سے وصیت کی تو ایک شخص اکیلا ہونے کی وجہ سے جمیع وصیت کا مستحق ہوگا کیونکہ اس کا قول الاقرب فالاقرب اسم

منفرد ہے اس لیے اس میں اس کے ذی رحم محرم اور غیر محرم شامل ہو جائیں گے۔ اگر اس کا کوئی ذی رحم محرم نہ ہو تو امام صاحب کے نزدیک وصیت باطل ہو جائے گی اور صاحبین کے نزدیک باطل نہیں ہوگی۔

موصی نے اگر کسی کی اولاد کیلئے وصیت کی تو اس میں اس کے بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں اور اس میں فقیر اور غنی برابر ہوں گے کیونکہ اولاد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں پر برابر بولا جاتا ہے۔

موصی نے اگر کسی کے ورثاء کیلئے وصیت کی تو وصیت ان کے درمیان لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ کے اعتبار سے تقسیم ہوگی کیونکہ لفظ میراث کا استعمال یہاں تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔

موصی نے اگر کسی کے یتیموں اور بیواؤں کیلئے وصیت کی تو وہ ان کے فقیروں اغنیاء مردوں اور عورتوں کیلئے ہوگی۔ یتیم ہر اس شخص کو کہتے ہیں جس کا باپ اس کے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو چکا ہو۔

ارملہ ہر اس بالغہ فقیرہ عورت کو کہتے ہیں جس کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا ہو یا فوت ہو گیا ہو اس نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو اور مرد کو بھی مجازاً ارمل کہتے ہیں۔

ایّم: ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو لیکن اس کے ساتھ جماع ہو چکا ہو وہ بالغہ ہو یا غیر بالغہ فقیر ہو یا غنی۔

الشاب والفتی: پندرہ سال کی عمر سے لے کر تیس سال تک کی عمر کے جوان کو شاب اور فتی کہتے ہیں اور غلام اس کو کہتے ہیں جو نا سمجھ ہو بالغ نہ ہوا ہو۔

کھل: تیس سال کی عمر سے لے کر سفید بالوں کے آجانے تک کی عمر کو کہتے ہیں اور صاحبین فرماتے ہیں کھل چالیس سے پچاس سال تک کی عمر کو کہتے ہیں اور جب سفید بال غالب آجائیں تو پھر اس کو شیخ کہتے ہیں۔

شیخ پچاس سال کی عمر سے لے کر آخر عمر تک والے کو کہتے ہیں۔

مسائل

موصی نے کسی کو وصیت کی کہ میرا ثلث مال جہاں چاہو خرچ کر دو۔ وہ اس مال کو خود پر بھی خرچ کر سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں بھی موصی کا امتثال امر پایا جا رہا ہے۔ موصی نے اگر

کسی کو وصیت کی کہ میرا ثلث مال جسے چاہو دے دو تو وہ یہ مال خود کو نہیں دے سکتا کیونکہ اعطاء (دینا) کسی دوسرے کو دینے سے ہی متحقق ہوگا۔ لینا اور دینا کسی ایک آدمی سے متحقق نہیں ہو سکتے بخلاف خرچ کرنے کے کہ وہ ایک آدمی سے بھی متحقق ہو سکتا ہے۔

اگر موصی نے کہا میری طرف سے دس مسکینوں پر ہزار درہم خرچ کر دو لیکن اس ایک مسکین پر ہزار درہم خرچ کر دیئے تو امام ابو حنیفہؒ سے اس مسئلہ میں دو قول مروی ہیں۔ قول اول یہ ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ صدقہ کہتے ہیں اللہ کیلئے نیکی کرنا اور زکوٰۃ کی طرح مساکین اس کے مصارف نہیں اور ایک میں اگرچہ لفظ جمع استعمال ہوا ہے لیکن وہ جنس فقیر اور مسکین کو بھی شامل ہے۔

اس لیے اگر اس نے اپنی ساری زکوٰۃ ایک فقیر کو دے دی تو بھی جائز ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ایک ہی مسکین پر خرچ کرنا جائز نہیں۔ دل اسی قول کی طرف راغب ہے۔

اگر موصی نے کہا کہ میری طرف سے ہزار روپیہ صدقہ کر دو یا یہ کپڑا صدقہ کر دو تو وصی اس کی قیمت صدقہ نہیں کر سکتا۔ لیکن قول مختار میں وہ قیمت بھی صدقہ کر سکتا ہے۔

لیکن دفن کرنے کی یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی وصیت باطل ہے۔

کتاب الفرائض

فرائض فریضۃ کی جمع ہے بمعنی مقرر کرنا اور بیان کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
''فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ'' [البقرہ: ۲۳۷] ''آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے۔''

نیز ارشاد ہے: ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا'' [النور: ۱] ''یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اتاری اور ذمہ پر لازم کی۔''

فرض کا شرعی معنی ہے کہ جو دلیل قطعی کتاب سنت متواترہ اور اجماع وغیرہ سے ثابت ہو۔ فقہ کے اس حصہ کو فرائض اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مقررہ حصص ہیں جو دلیل قطعی سے ثابت ہیں۔

یہ نام دو وجہ سے رکھا گیا ایک تو اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی تقسیم کے بعد فرمایا: ''فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ'' [النساء: ۱۱] ''حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے۔''

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ''تعلموا الفرائض وعلموها الناس فانی امرأ مقبوض الی آخرۃ'' ''فرائض کا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ میں تو اس دنیا سے جانے والا ہوں۔''[1]

دوسرا اس وجہ سے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نماز وروزہ وغیرہ کا اجمالاً ذکر فرمایا ہے ان کی مقادیر کو ذکر نہیں فرمایا لیکن فرائض کو ذکر کرنے کے بعد اس کے حصص اور مقادیر بھی بیان فرما دیا اس لیے اس علم کا نام علم الفرائض رکھ دیا گیا۔

ارث کا لغوی معنی ہے بقاء اور وارث کا لغوی معنی باقی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک صفتی نام بھی وارث ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوقات کے فنا ہونے کے بعد باقی رہیں گے اس لیے انہیں وارث کہتے ہیں۔

اور ارث کا شرعی معنی ہے کہ ایک کا مال نیابت کے سبب دوسرے کی طرف منتقل ہو؛ یعنی وارث کے باقی ہونے کی وجہ سے دوسرے کا مال اس کی طرف منتقل ہو گیا۔

اس علم کی بڑی شرافت ہے کیونکہ اللہ پاک نے اسے خود بیان فرمایا ہے اور خود تقسیم کیا ہے اور خوب روز روشن کی طرح واضح کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ

[1] المستدرک: ۳۳۳/۴

اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" [النساء: ۱۱] "حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرائض کے اہم حصوں کو بیان فرما دیا ہے اور باقی حصے آدمی اس میں غور وفکر کر کے مستنبط کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرائض کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کی رغبت دلائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "یا ابا هريرة تعلموا الفرائض وعلموه فانه نصف العلم وانه ينسى وهو اول ما ينزع من امتى"

"اے ابو ہریرہ علم فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ یہ نصف علم ہے اور یہ بھلا دیا جائے گا اور میری امت میں سب سے پہلے یہ علم اٹھایا جائے گا۔"[۱]

یہ حدیث ضعیف ہے لیکن ماقبل کی حدیث صحیح اس کی تائید کرتی ہے۔

میت کے ترکہ میں سب سے پہلے کیا کیا جائے

میت کے ترکہ میں سب سے پہلے اس کی رہن کو چھڑایا جائے گا۔ پھر اس کے حالات کے مطابق اس کی تجہیز وتکفین کی جائے گی کیونکہ لباس اور ستر عورت لازمی اور ضروری ہے اور جس طرح یہ دیون متعلقات اور جمیع واجبات سے اس کی زندگی میں مقدم تھے۔ اسی طرح اس کے مرنے کے بعد بھی مقدم ہوں گے۔ اور اس کو جیسے حلال کپڑے وہ اپنی زندگی میں پہنتا تھا اسی جیسا کفن اس کے ترکے میں سے بغیر کنجوسی اور فضول خرچی کے دیا جائے گا۔

پھر اس کے باقی بچے ہوئے جمیع مال میں سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ" [النساء: ۱۱] "وصیت کے بعد جو کر کے مرا یا بعد ادائے قرض کے۔"

حضرت علی سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے وصیت پورا کرنے سے پہلے دین ادا کرنے کا حکم دیا اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "الدين قبل الوصية وليس لوارث وصية" دین ادا کرنا وصیت سے مقدم ہے اور وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں۔"[۲]

حضرت ابن عباس سے لوگوں نے پوچھا آپ حج سے پہلے عمرہ کا حکم کیسے دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" [البقرۃ: ۱۹۶] "اور پورا کرو حج اور

---

[۱] [مستدرک ۴/۳۳۲] [۲] [بیہقی: ۶/۲۶۷]

عمرہ اللہ کے واسطے۔"

حضرت ابن عباس نے ان سے فرمایا تم کیسے پڑھتے ہو دین کو وصیت سے پہلے پڑھتے ہو یا وصیت کو دین سے پہلے پڑھتے ہو؟ تو لوگوں نے کہا وصیت کو دین سے پہلے پڑھتے ہیں پھر ان سے پوچھا تم کس چیز سے ابتداء کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم دین سے ابتداء کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا عمرہ حج سے پہلے کرنا بھی ایسے ہی ہے۔[1]

الغرض دین وصیت پر مقدم ہوگا کیونکہ یہ میت پر لوگوں کا حق ہے اور وصیت کا مطلب ہے کہ میت کی طرف سے لوگوں کو حق دار بنانا۔

بہرحال سب سے پہلے اس کے رہن کو چھڑایا جائے گا پھر اس کی تجہیز وتکفین کی جائے گی پھر اس کا قرض ادا کیا جائے گا۔ پھر اس کے ثلث مال سے اس کی وصیتوں کو نافذ کیا جائے گا۔ اگر اس نے وصیت بالمال کی ہو یا کسی معین چیز کی کی ہو تو اس میں ثلث مال کا اعتبار کر کے اس وصیت کو نافذ کیا جائے گا۔

اگر اس نے وصیت مشترک حصہ جیسے ثلث ربع میں کی ہو تو موصی لہ ورثاء کے ساتھ شریک ہوگا۔ ترکہ کے بڑھنے سے اس کا حصہ بھی بڑھ جائے گا اور ترکہ کے کم ہونے سے اس کا حصہ بھی کم ہو جائے گا۔ اس لیے مال کا حساب لگایا جائے گا اور اس میں وارث کی طرح وصیت کا حصہ نکالا جائے گا اور وصیت کو ورثاء میں ترکہ تقسیم کرنے پر مقدم کیا جائے گا۔ پھر باقی ترکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے تین آیتوں میں مقرر کردہ حصوں کے مطابق ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

انسان وراثت کا کب مستحق ہوگا

آدمی رشتہ داروں اور نکاح کی وجہ مستحق میراث ہوتا ہے اور اس پر آیات منصوصہ دال ہیں اسی طرح آدمی ولاء سے بھی مستحق میراث ہوتا ہے لیکن آج کل ولاء کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس کتاب میں اس سے بحث نہیں کی گئی۔

موانع ارث

موانع ارث چار ہیں۔ (۱) قتل، (۲) غلامی (۳) اختلاف مذاہب (۴) اختلاف دارین۔

---

[1] (محلی: ۲۶۸/۹)

مستحق وراثت

نمبر دو ذوالسہام انہیں اصحاب الفروض بھی کہتے ہیں۔ اور اصحاب فروض وہ ہیں جن کیلئے کتاب وسنت یا اجماع کے ذریعے حصہ مقرر کر دیا گیا ہو۔ میراث کی تقسیم کی ابتداء انہیں سے کی جائے گی۔

ارشاد نبوی ہے: ''الحقوا المال بالفرائض فما ابقت الفرائض فهو لاولی رجل ذکر''[1] ''سب سے پہلے مال اصحاب الفروض میں تقسیم کرو جو ان سے بچ جائے وہ میت کے سب سے قریبی مرد کا ہے۔''

اصحاب الفرائض بارہ ہیں دس نسبی اور دو نسبی۔

نسبی ذو الفروض میں ہیں جن میں تین مرد اور سات عورتیں ہیں۔ مردوں میں سب سے پہلے متوفی کا والد ہے۔ اگر اس کے ساتھ میراث میں متوفی کے بیٹے اور پوتے بھی شریک ہوں تو والد کو صرف فرض حصہ یعنی سدس ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ'' [النساء:۱۱] ''اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت سے اولاد ہے۔''

اگر والد کے ساتھ بیٹے اور پوتے نہ ہوں تو پھر یہ عصبہ محض ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ'' [النساء:۱۱] ''اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ باقی مال باپ کا ہوگا۔

متوفی کے والد کے ساتھ متوفی کی بیٹیاں یا پوتیاں بھی میراث میں شریک ہوں تو والد کو سدس بطور فرض کے ملے گا اور بیٹی اگر ایک ہے تو اس کیلئے نصف ہے اور اگر دو یا زیادہ ہیں تو پھر ان کیلئے دو ثلث ہیں اور باقی مال عصبہ ہونے کی وجہ سے والد کو ملے گا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''فما ابقت الفرائض فلاولی رجل ذکر'' ''جو اصحاب فروض سے بچے وہ میت کے سب سے قریبی مرد کیلئے ہے۔'' اب متوفی کے والد کی تین حالتیں ہوئیں (۱)۔ صرف مقرر کردہ سدس اس ملے گا۔ اگر متوفی کے بیٹے یا پوتے ہوں۔ (۲)۔ صرف عصبہ ہوگا جب متوفی کے بیٹے یا پوتے نہ ہوں۔ (۳) مقرر کردہ سدس بھی ملے گا اور عصبہ بھی ہوگا جب متوفی کی بیٹیاں یا

---

[1] [مستدرک: ۴/۳۳۸]

پوتیاں ہوں۔

اصحاب فروض میں دوسرا مرد متوفی کا دادا ہے۔ اور اس سے مراد جد صحیح ہے۔ جد صحیح اس کہتے ہیں جس کے میت کے ساتھ رشتے میں عورت کا واسطہ نہ ہو اس میں میت کا دادا اور میت کا پردادا بھی شامل ہے اور والد کی عدم موجودگی میں یہ بمنزلہ والد کے ہے۔ اس کے حالات ابھی آگے آئیں گے اور لفظ اب کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ'' [یوسف: ۳۸] ''اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحاق کا۔''

حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت یوسف کے دادا تھے اور حضرت ابراہیم ان کے پردادا تھے۔

اصحاب فروض میں تیسرا مرد اخیافی بھائی ہے اگر متوفی کا ایک اخیافی بھائی یا بہن ہو تو اسے سدس ملے گا اور اگر وہ دو بھائی ہوں یا دو سے زیادہ ہوں خواہ بہنیں ہوں یا بھائی ہوں تو اسے ثلث ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ'' [النساء: ۱۲] ''اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا عورت ہو ایسی ہی اور اس میت کے ایک بھائی ہے یا بہن ہے تو دونوں میں سے ہر ایک چھٹا حصہ ہے اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو سب شریک ہیں ایک تہائی میں۔''

حضرت ابی اور سعد بن ابی وقاص نے ''وله اخ او اخت لام'' پڑھا ہے ان دونوں کی قرأت کو نبی کریم ﷺ سے نقل کردہ روایت کی طرح ہی سمجھا جائے گا اور انہیں بطور تفسیر ہی کے لیا جائے گا۔ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے۔

ب: اصحاب فروض جن میں سب سے پہلی عورت میت کی بیٹی ہے اگر میت کی اکیلی بیٹی ہو تو اسے نصف ملے گا۔ اگر میت کی بیٹیاں یا دو سے زیادہ ہوں لیکن بیٹا نہ ہو تو بیٹیوں کو دو ثلث ملیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ'' [النساء: ۱۱] ''تو ان کیلئے دو تہائی اس مال میں سے جو چھوڑا اور اگر ایک ہی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے۔''

اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ''فَوْقَ اثْنَتَيْنِ'' سے مراد دو یا دو سے

زیادہ بیٹیاں ہیں اور اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اس کی تقدیری عبارت یہ ہے "وَإِنْ كُنَّ نِسَاءً اثْنَتَيْنِ فَمَا فَوْقَهَا" اس کی مثال ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ" [الانفال: ۱۲] "سو مارو گردنوں پر"

یعنی اضربوا الاعناق فما فوقہا ان کی گردنوں اور گردنوں کے اوپر کے حصے پر مارو اور فوق دونوں میں آیتوں میں زیادہ ہے یہی اکثر علماء کا مذہب ہے لیکن حضرت ابن عباس ظاہر الفاظ پر عمل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ایک بیٹی کیلئے نصف ہے اور دو کیلئے بھی نصف ہے اور دو سے زائد کیلئے ثلثان ہے۔

اور بیٹی جب بیٹے کی موجودگی میں جو اس سے حالاً قوی ہے ثلث کی مستحق ہوتی ہے تو بیٹی جو قوۃ اور استحقاق میں اس کے برابر ہے اس کی موجودگی میں تو وہ بدرجہ اولیٰ ثلث کی مستحق ہوگی اور جب دو بہنیں ثلثین کی مستحق ہوتی ہیں تو بیٹیاں جو ان سے زیادہ میت کے قریب ہیں بدرجہ اولیٰ ثلثین کی مستحق ہونگی۔

عورتوں میں دوسری متوفی کی پوتی ہے وہ اگر اکیلی ہو تو اس کے لئے نصف ہے اور اگر وہ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو ان کیلئے ثلثین ہے۔ اور وہ حقیقی بیٹے کی عدم موجودگی میں حقیقی بیٹیوں کی طرح ہوں گی۔ کیونکہ ولد کا اطلاق ان پر بھی حقیقتاً اور شرعاً ہوتا ہے مگر پوتے پوتیوں کی میت سے رشتہ داری بیٹے کی وجہ سے قائم ہوتی ہے اور اسی کے سبب وہ وارث بنتی ہیں اور اس کی موجودگی میں وراثت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جیسے باپ کی موجودگی میں دادا اور ماں کی موجودگی میں جدات محروم ہو جاتی ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ماں کی موجودگی میں متوفی کے بھائی محروم ہو جائیں اگرچہ ان کی میت سے رشتہ داری ماں کی وجہ سے قائم ہوتی ہے لیکن یہاں وارث بننے کا سبب مختلف ہے۔ ماں امومت کی وجہ سے وارث بن رہی ہے اور بھائی اخوت کی وجہ سے وارث بن رہے ہیں۔ متوفی کی پوتی کیلئے بیٹی کی موجودگی میں سدس ہے اور متوفی کی بیٹی کیلئے نصف ہے اور باقی متوفی کی بہن کا ہوگا۔ پوتی کیلئے یہ حصہ ثلثین کی تکمیل کیلئے ہوگا اگر متوفی کی دو حقیقی بیٹیاں ہوں تو ان کی موجودگی میں میت کی پوتیاں اور بہنیں محروم ہو جائیں گی کیونکہ متوفی کی بیٹیوں کا ثلثین میں حق نص کتاب سے ثابت ہے اور پوتیاں بیٹیوں کی غیر موجودگی میں وارث ہوتی ہیں۔ جب بیٹیوں نے ہی پورے دو ثلث لے لیے تو اب تبعیت کی وجہ سے کوئی باقی نہ رہا اس وجہ سے پوتیاں محروم ہو جائیں گی مگر ان کے برابر درجہ میں یا ان سے نیچے کوئی لڑکا ہو تو وہ ان کو عصبہ بنا دے گا اور باقی مال ان کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار

سے تقسیم ہوگا۔

مثال: میت نے دو بیٹیاں اور ایک پوتی چھوڑی تو بیٹیوں کیلئے دو ثلث ہوں گے اور پوتی کیلئے کچھ نہیں ہوگا۔

مثال: میت نے دو بیٹیاں ایک پوتی اور ایک اس کا چچا زاد بھائی چھوڑا تو بیٹیوں کیلئے دو ثلث ہوں گے اور باقی مال ان دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔

مثال: میت نے دو بیٹیاں ایک پوتی اور ایک پڑپوتی اور ایک پڑپوتا چھوڑا تو بیٹیوں کیلئے دو ثلث ہوں گے اور باقی مال پوتی اور اس سے نیچے والوں کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔

تیسری عورت متوفی کی والدہ ہے اور اس کے تین احوال ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے کہ متوفی اگر ماں، بیٹا، پوتا، یا دو اخیافی، علاتی یا حقیقی بھائی یا بہنیں چھوڑیں تو متوفی کی والدہ کو سدس ملے گا۔ "وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ" [النساء: ۱۱] ''اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت سے اولاد ہے۔''

والدہ کی دوسری حالت یہ ہے کہ متوفی اگر صرف والدہ چھوڑے تو اسے ثلث ملے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ" [النساء: ۱۱] ''اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ۔''

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں والدہ ثلث سے سدس کی طرف اس وقت جائے گی جب متوفی کے بھائی تین یا تین سے زیادہ ہوں۔ کیونکہ قرآن پاک نے ''اخوۃ'' لفظ جمع ذکر کیا ہے ان کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ جمع تثنیہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور جمع اجتماع سے ماخوذ ہے اور وہ دو بھائیوں کے اجتماع سے بھی متحقق ہو جاتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے اخوۃ (جمع) کے ساتھ ماں کو محجوب کیا ہے اور دو کیلئے عربی لغت میں اخوۃ نہیں ہیں۔ تو حضرت عثمان نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ بات مجھ سے پہلے سے چلی آرہی ہے اور میں اس کو ختم نہیں کرسکتا۔ حضرت عثمان کا یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس بات پر تمام حضرات کا اجماع تھا۔

الثالث: متوفی کی بیوی اور والدین وارث ہیں تو بیوی کو ربع ملے گا اور والدہ کو ثلث باقی ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ'' [النساء:۱۱] ''اور وارث ہیں اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی۔'' بیوی کو مقرر حصہ ملنے کے بعد باقی تمام کے والدین وارث تھے لہٰذا والدہ کو باقی کا ثلث دیا جائے گا۔

ب: بیوی فوت ہوگئی اور اس نے ورثاء میں خاوند اور والدین ہیں تو اس کے خاوند کو نصف ملے گا اور والدہ کو خاوند کا حصہ نکالنے کے بعد باقی کا ثلث ملے گا اور والدہ کو ثلث کل نہیں دیا جائے گا کیونکہ اگر اسے ثلث کل دیا جائے تو اس کے اور خاوند کے سبب استحقاق اور ضرب میں برابر ہونے کے باوجود یہ لازم آئے گا کہ اسے افضل قرار دیا جارہا ہے جو کہ خلاف اصول ہے اگر دونوں صورتوں میں باپ کی جگہ دادا ہو تو والدہ کو کامل ثلث ملے گا۔

متوفی کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے کیونکہ والدہ کی میت سے رشتہ داری بغیر واسطہ کے اور دادا کی باپ کے واسطہ سے ہے اور اختلاف قرب کے وقت کمی زیادتی جائز ہے جیسے متوفی نے بیوی، سگی بہن اور علاتی بھائی وارث چھوڑے تو زوجہ کو ربع، بہن کو نصف اور بھائی کو باقی ملے گا۔

چوتھی جدہ صحیحہ ہے جسے سدس ملے گا۔ جدہ صحیحہ اسے کہتے ہیں کہ متوفی کے ساتھ اس کے رشتے میں دو ماؤں کے درمیان باپ کا رشتہ نہ ہو۔ اگر باپ کا رشتہ شامل ہو تو وہ جدہ فاسدہ ہے اگر متوفی نے ورثاء میں نانی کو چھوڑا جیسے اس کو ماں کی ماں اگرچہ وہ اوپر تک ہو یا دادی کو چھوڑا والد کی ماں اگرچہ وہ اوپر تک ہو تو جدہ کیلئے سدس ہوگا۔

حضرت قبیصہ بن ذویب سے روایت ہے ایک جدہ حضرت ابوبکر کے پاس آئی اور ان سے اپنے میراث کے بارے میں سوال کیا۔ آپؓ نے فرمایا میں تیرے لیے کتاب وسنت میں کوئی حصہ نہیں پاتا تو لوٹ جا میں لوگوں سے پوچھ کر تجھے اس بارے میں بتاؤں گا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا میں نبی کریم ﷺ کے پاس موجود تھا آپ نے جدہ کو سدس دیا تھا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا تیرے ساتھ کوئی بھی تھا تو محمد بن سلمہ کھڑے ہوئے اور کہا واقعہ ایسے ہی ہے جیسے حضرت مغیرہ نے بیان کیا ہے۔

حضرت ابوبکر نے اس عورت کیلئے سدس مقرر فرما دیا پھر ایک اور جدہ حضرت عمر کے پاس آئی اور اپنی میراث مانگی آپ نے فرمایا تیرے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ نہیں اور جو میراث کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ دوسری کیلئے تھا جس فرائض میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کرسکتا۔

ہاں اس سدس میں اگر تم دونوں اکٹھی ہو جائیں تو تم اسے آپس میں تقسیم کر لیتیں اور تم دونوں میں اگر کسی ایک ایک نے اسے لے لیا ہے تو وہ اسی کا ہے۔

پانچویں: ماں باپ شریک (سگی) بہن ہے۔ سگی بہن اگر اکیلی ہو تو اسے نصف ملے گا اگر دو یا زیادہ ہوں تو انہیں ثلثان ملیں گے۔ چھٹی علاتی بہنیں ہیں اور وہ سگی بہن کی عدم موجودگی میں ان کی طرح ہیں کیونکہ آیت میں لفظ اخت تمام بہنوں کو شامل ہے مگر سگے بہن بھائیوں کو قوۃ قرابت کی وجہ سے مقدم کیا جائے گا کیونکہ وہ دو جہتوں سے میت کے قریب ہیں۔

سگے بہن بھائیوں کی عدم موجودگی میں علاتی بہنوں کیلئے خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ سدس ہوگا اور ایک سگی بہن ہو تو اس کیلئے نصف ہوگا اور علاتی بہنیں تکملۃ للثلثین کیلئے اس کے ساتھ شریک ہوں گی۔ سگی بہنیں اگر دو یا زیادہ ہوں تو ان کیلئے دو ثلث ہوں گے اور علاتی بہنیں اس وقت محروم ہوں گی۔ ہاں اگر ان کے ساتھ کوئی علاتی بھائی ہو تو وہ ان کو عصبہ بنا دے گا اور باقی مال ان کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔

ساتویں اخیافی بہنیں ہیں: اخیافی بہن اگر اکیلی ہو تو اس کیلئے سدس ہے اور اگر دو یا زیادہ ہوں تو ان کیلئے ثلثان ہیں ان کے پورے اخیافی بھائی کے تحت گزر چکے ہیں یہ کل دس اصحاب ہوئے جن میں تین مرد اور سات عورتیں ہیں۔ مرد باپ اور اور اخیافی بھائی ہیں۔ باپ کیلئے کبھی سدس ہوتا ہے اور کبھی باپ عصبہ ہوتا ہے اور کبھی اس کیلئے فرض اور تعصب دونوں ہوتے ہیں اور جد صحیح باپ کی غیر موجودگی میں بمنزلہ باپ کے ہے۔ اخیافی بھائی اگر اکیلا ہو تو اس کیلئے سدس ہے اور دو یا زیادہ ہوں تو ان کیلئے ثلث ہے اور بھائی اور بہنیں اس میں برابر شریک ہوں گی۔

سات عورتیں یہ ہیں۔

(۱) بیٹی اس کیلئے نصف ہے۔ اگر اکیلی ہو اور اگر دو یا زائد ہوں تو ان کیلئے دو ثلث ہیں۔

(۲) پوتی اگر اکیلی ہو تو اس کیلئے نصف ہے اگر دو یا دو سے زائد ہوں تو ان کیلئے دو ثلث ہیں۔ حقیقی بیٹی کی موجودگی میں اس کیلئے سدس ہوگا۔

(۳) ماں: بیٹے کی موجودگی میں ماں کیلئے سدس ہوگا بیٹے کی غیر موجودگی میں اس کیلئے ثلث ہوگا دونوں مسئلوں میں میاں اور بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی کا ثلث ماں کا ہوگا۔

(۴) جدہ نانی دادی انہیں سدس ملے گا۔

(۵) سگی بہنیں اگر اکیلی ہیں تو اس کیلئے نصف ہے اور اگر دو یا زیادہ ہوں تو ان کیلئے دو ثلث

ہیں۔

(۶) علاتی بہنیں، سگی بہنوں کی غیر موجودگی میں سگی بہنوں کی طرح ہیں۔ سگی بہن کی موجودگی میں ایک یا زیادہ علاتی بہنوں کیلئے دو ثلث پورے کرتے ہوئے ایک سدس ہوگا۔ اگر سگی بہنیں دو یا زیادہ ہوں تو علاتی بہنیں محروم ہو جائیں گی۔ ہاں اگر ان کے ساتھ کوئی علاتی بھائی ہو تو وہ انہیں عصبہ بنا دے گا۔

(۷) اخیافی بہنیں: اگر اکیلی ہو تو اس کیلئے سدس ہوگا اور اگر دو یا دو سے زائد ہوں تو ان کیلئے ثلث ہوگا۔

بقیہ اصحاب اسہام میں سے دو بوجہ سبب وراثت میں حصہ دار بنتے ہیں اور وہ میاں بیوی ہیں۔ متوفاۃ کے بیٹے اور پوتے کی غیر موجودگی میں خاوند کیلئے نصف ہے۔ متوفاۃ کے بیٹے اور پوتے کی موجودگی میں خاوند کیلئے ربع ہے۔ متوفی کے بیٹے اور پوتے کی غیر موجودگی میں بیوی کیلئے ربع ہوگا بیٹے اور پوتے کی موجودگی میں ثمن ہوگا۔

بیوی خواہ اکیلی ہو یا زیادہ ہوں وہ ربع اور ثمن میں مشترک ہوں گی ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَلَهُنَّ" یہ اسم جمع ہے اور اس پر اجماع ہے۔

چند ضروری مسائل

جس شخص میں ایسی دو قرابتیں جمع ہو جائیں کہ اگر وہ دو الگ الگ شخصوں میں ہوں تو وہ دونوں وارث ہوتے تو یہ شخص ان دونوں قرابتوں کی وجہ سے وارث ہوگا اور اس کے ساتھ دو شخصوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا۔

مثال بیوی نے صرف خاوند کو وارث چھوڑا اور وہ اس کا چچا زاد بھائی بھی ہے تو اس کیلئے نصف خاوند ہونے کی وجہ سے ہوگا اور باقی نصف چچا زاد بھائی ہونے کی وجہ سے ہوگا۔

مثال: عورت نے اپنے دو چچا زاد بھائیوں کو وارث چھوڑا ان میں ایک اس کا اخیافی بھائی بھی ہے تو جو اخیافی بھائی بھی ہے اسے سدس ملے گا اور باقی ان دونوں کے درمیان چچا زاد ہونے کی وجہ سے برابر تقسیم ہوگا۔

مثال: بیوی نے دو چچا زاد بھائیوں کو وارث چھوڑا ان میں ایک اس کا خاوند بھی ہے تو خاوند کو زوجیت کی وجہ سے نصف ملے گا اور باقی ان دونوں کے درمیان چچا زاد ہونے کی وجہ سے برابر تقسیم ہوگا۔

مقرر شدہ حصص

کتاب اللہ میں مقرر کردہ حصے ثمن، سدس، ربع، ثلث، نصف اور ثلثان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ثمن کو زوجہ کے فرض میں ذکر کیا ہے۔ ربعہ کو زوجہ کیلئے اور اولاد کی عدم موجودگی میں زوج کیلئے بھی ربع ہی مقرر کیا ہے۔

نصف کو خاوند، بیٹی اور بہن کیلئے مقرر کیا ہے۔

سدس کو ماں، باپ، اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کیلئے مقرر کیا ہے۔

ثلث کو ماں اور اخیافی بھائیوں کیلئے مقرر کیا ہے۔

ثلثان کو بیٹیوں اور بہنوں کیلئے مقرر کیا ہے۔

کل مال کو اللہ تعالیٰ نے دو جگہ ذکر فرمایا ہے کہ ایک جگہ واضح نص ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: **وَلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ** "اور اس کی ایک بہن ہے تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑا ہوا اور وہ بھائی وارث ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کے بیٹا۔"

دوسری جگہ اقتضاء ذکر کیا ہے: "**وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ**" [النساء:۱۱] "اگر ایک ہی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے۔"

بیٹے کیلئے اقتضاء اور ضرورتاً کل مال ہوگا اور جو چیز اقتضاء ثابت ہوتی گویا وہ نصاً ثابت ہوتی ہے ان مقرر کردہ حصوں میں کمی بیشی نہیں ہوگی مگر عول اور رد کے وقت جن کا بیان آگے آتا ہے۔

عصبات

ہر وہ شخص جس کا حصہ مقرر نہ ہو اور ذوی الفروض کے حصوں کے بعد باقی اسے ملے اور اکیلے ہونے کی صورت میں جمیع مال اسے ملے اسے عصبہ کہتے ہیں۔ عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عصبہ نسبی (۲) عصبہ سببی۔

عصبہ نسبی

عصبہ نسبی تین قسم پر ہے۔ (۱) عصبہ بنفسہ (۲) عصبہ بغیرہ (۳) عصبہ مع غیرہ۔

(۱) عصبہ بنفسہ اس مرد کو کہتے ہیں جس کی میت کی طرف نسبت کوئی عورت واسطہ نہ ہو اور عصبہ میں سب سے قریبی میت کے بیٹے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ'' [النساء ۱۱] ''اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے۔''

عصبہ بنانے میں بیٹے کو باپ پہ مقدم کیا جائے گا۔ میت کا بیٹا عصبہ ہوگا اور پھر اس کا پوتا عصبہ ہوگا۔ باپ اگرچہ پوتے سے میت کے زیادہ قریب ہے مگر وصیت کے بیٹے اور پوتوں کی موجودگی میں بھی صاحب فرض ہے اور ترجیح میں استحقاق بجہۃ الفرض معتبر نہیں۔ بلکہ بجہۃ التعصیب معتبر ہے جیسے متوفی کے علاتی بھائی کا بیٹا سگی بہن کی موجودگی میں بھی وارث ہوتا ہے اگرچہ بہن اس سے قرابت کی جہت سے اقوی اور اقرب ہے۔

متوفی یا متوفاۃ کا سب سے قریبی عصبہ بیٹا ہے پھر پوتے نیچے تک اگر متوفی کے بیٹے پوتے یا آگے ان کی اولاد نہ ہو تو پھر متوفی کا باپ عصبہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ'' [النساء: ۱۱] ''اور وارث ہیں اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی۔''

یعنی باقی ماں باپ کا ہوگا پس اس سے ثابت ہوا کہ باپ دادا اور بھائیوں سے عصبہ بننے کا زیادہ حق دار ہے اور اس کے بعد رشتہ داروں کی میت کی طرف سے نسبت اس کی وجہ سے ہوتی ہے اگر متوفی کے بیٹے پوتے اور باپ موجود نہ ہو تو اس کا عصبہ دادا ہوگا اس صورت میں دادا کے عصبہ ہونے میں اختلاف ہے جس کا بیان انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اگر متوفی کے بیٹے پوتے باپ اور دادا موجود نہ ہوں تو پھر اس کے بھائی عصبہ ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ'' [النساء: ۱۷۶] ''اور وہ بھائی وارث ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کے بیٹا۔''

(جس کی اولاد اور باپ نہ ہو) کے جمیع مال کا اسی کو حقدار بنایا گیا ہے۔ اگر متوفی کے بیٹے، پوتے، باپ، دادا اور بھائی نہ ہوں تو عصبہ اس کے بھتیجے ہوں گے۔

اگر متوفی کا کوئی بیٹا، پوتا یا باپ، دادا اور بھائی موجود نہ ہو اور نہ اس کی اولاد موجود ہو البتہ چچا موجود ہو تو وہ بطور عصبہ کے سارا مال لے گا اور چچا بھی موجود نہ ہو تو چچا کی اولاد وارث ہوگی۔ اگر چچا زاد بھی نہ ہو تو باپ کے اعمال (چچا) عصبہ ہوں گے اگر وہ بھی نہ ہوں تو ان کی اولاد عصبہ ہوگی اگر وہ بھی نہ ہو تو دادے کے اعمال وارث ہوں گے۔ قرابت اور درجہ کے اعتبار

سے مذکورہ ترتیب ہوگی یعنی حصول میراث کی ترتیب بھی یہی ہے اور نکاح کرانے کی سرپرستی کی ترتیب بھی یہی رہے گی۔ اگر تمام عصبات موجود ہوں تو الاقرب فالاقرب (قریب ترین رشتہ دار) کا اعتبار ہوگا۔ کیونکہ ارشاد نبوی ہے: "فلا ولی رجل ذکر"۔ حضرت زید بن ثابت سے اس کی تفسیر یوں ذکر کی گئی ہے کہ حقیقی بھائی میراث میں علاتی (باپ شریک) سے مقدم ہوگا۔ اور علاتی بھائی حقیقی بھائی کے بیٹے سے مقدم ہوگا اور حقیقی بھائی کا بیٹا علاتی بھائی کے بیٹے سے مقدم ہوگا۔ علاتی بھائی کا بیٹا حقیقی بھائی کے پوتے سے مقدم ہے۔ علاتی بھائی کا بیٹا، حقیقی چچا (باپ کے حقیقی بھائی) سے مقدم ہے، حقیقی چچا، علاتی چچا سے مقدم ہے۔ باپ کا علاتی بھائی باپ کے حقیقی بھائی کے بیٹے سے مقدم ہے اور باپ کے باپ شریک بھائی کا بیٹا باپ کے چچا سے میراث میں مقدم ہے۔ بس عصبات میں حق میراث کی ترتیب اسی طرح ہوگی قریب تر وارث بعید کیلئے مانع ہوگا اور اگر میت کی نسبت میں سب برابر ہوں تو آپس میں برابر تقسیم کریں گے حقیقی علاتیوں سے مقدم ہوں گے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وصیت پر عمل کرنے سے قبل ادائیگی دین کا فیصلہ فرمایا حالانکہ قرآن کریم میں یوں تم پڑھتے ہو۔ "مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ" "وصیت کہ وصیت کی جاتی ہے یا قرض کے ساتھ ان کے۔"

اور حقیقی بہن بھائیوں کو علاتیوں سے مقدم کردیا ہے۔ یعنی حقیقی اور علاتی بہن بھائی موجود ہوں تو حقیقی وارث ہوں گے اور علاتیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔[1]

حضرت امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں عبداللہ بن عتبہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ قاضی تھے۔ اتنے میں کچھ لوگ ملکیہ بنت سمعان" نامی ایک عورت کی میراث کے متعلق ایک مقدمہ لے کر ان کے پاس آگئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں فلاں بن فلاں بن سمعان ہوں۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میں فلاں بن فلاں بن فلاں بن سمعان ہوں۔ عبداللہ بن عتبہ کو ان کی گفتگو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ فرمایا یہ ساری باتیں ایک کاغذ میں لکھ کر پیش کرو، چنانچہ ایک شخص نے لکھ کر ان کے سامنے پڑھ دیا آپ نے فرمایا ہاں اب میں سمجھ گیا پھر فرمایا کہ ضحاک نے مجھ سے فرمایا حضرت عمر بن الخطابؓ نے عمواس کے طاعون کے سال جب ان کے پاس میراث کا مسئلہ پیش ہوتا اور بہن بھائی حقیقی وعلاتی ہوتے تو علاتیوں کے مقابلے میں حقیقیوں کو مقدم رکھتے اور علاتیوں کو کچھ نہ دیتے تھے۔

---

[1] [بیہقی: ۲۳۹/۶]

(ب) عصبہ بغیرہ:

یہ وہ چار عورتیں ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہیں۔

(۱) بیٹیاں بیٹوں کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہیں۔

(۲) پوتیاں پوتوں کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہیں۔ ارشاد باری ہے: "یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" [النساء:۱۱] "وصیت کرتا ہے تم کو اللہ تعالیٰ اولاد تمہاری کے واسطے مرد کیلئے مانند حصہ دو عورتوں کے۔"

(۳) حقیقی بہن، بھائی کے ساتھ عصبہ بنتی ہے۔

(۴) علاتی بہن علاتی بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: "اِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" [النساء:۱۷۶] "اور اگر ہو وہ وارث جماعت مرد اور عورتیں پس واسطے مرد کے برابر حصے دو عورتوں کے۔"

ج: عصبہ مع غیرہ:

میت کی حقیقی یا علاتی بہنیں میت کی بیٹیوں کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہیں۔

حجب کا بیان:

حجب کا معنی مانع کے ہیں۔ یہاں حجب سے مراد ایک وارث کی موجودگی میں دوسرے کے حصے میں کمی آجانا یا میراث سے محروم ہو جانا ہے۔

حجب کی قسمیں: حجب کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) حجب نقصان (۲) حجب حرمان۔ حجب نقصان کا مطلب ہے کہ ایک وارث کی موجودگی میں دوسرے کے حصے میں کمی واقع ہو۔ بالکل محروم نہ ہو جیسا کہ اصحاب الفروض کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں مثلاً ایک آدمی کا انتقال ہو گیا۔ ورثاء میں ماں باپ چھوڑے، اس صورت میں ایک تہائی ۱/۳ کل مال کا ماں کو ملے گا۔ باقی دو تہائی باپ کو ملے گا اور اگر ان کے ساتھ میت کی بہن بھائی دو یا اس سے زیادہ موجود ہوں یا میت کا کوئی بیٹا یا بیٹی موجود ہو تو ماں کا حصہ ایک تہائی سے کم ہو کر چھٹا حصہ ہوگا۔ یعنی اسے ۱/۳ کے بجائے ۱/۶ ملے گا۔

حجب حرمان: اس میں ورثاء دو فریق ہیں۔ ایک فریق بالکل کبھی محروم نہیں ہوگا وہ چھ

افراد ہیں۔ (۲) باپ، (۲) بیٹا (۳) شوہر (۴) ماں (۵) بیٹی (۲) بیوی۔ کیونکہ ان کا حصہ بہر صورت ثابت ہے۔ ان کے علاوہ ورثاء کبھی محجوب (محروم) ہوں گے اور کبھی حصہ دار وراثت ہوں گے۔ یعنی قریب وارث کی موجودگی میں بعید محروم ہوگا۔

مثلاً: بیٹے کی موجودگی میں پوتے محروم ہوں گے۔

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی میراث نہیں پائیں گے۔

یعنی جو شخص کسی وارث کے واسطے سے میت سے رشتہ رکھتا ہو اس وارث کی موجودگی میں وہ محجوب ہو جائے گا۔ مگر ماں شریک بہن بھائی ماں کی موجودگی میں محجوب نہیں ہوں گے۔

مثلاً: میت کا دادا میت کے باپ کا باپ ہونے کی وجہ سے وارث ہے میت کا باپ موجود نہ ہو تو دادا وارث ہوگا۔ مگر باپ موجود ہو تو وہ دادا کیلئے حاجب بنے گا۔

کوئی وارث کسی قریب وارث کی وجہ سے محجوب ہو رہا ہو تو وہ کسی اور کیلئے حاجب بھی بن سکتا ہے۔ مثلاً میت کے بھائی اور بہنیں۔ میت کے باپ کی موجودگی میں محجوب ہوں گے لیکن وہ ماں کیلئے بھی حاجب بنیں گے۔ یعنی ان کی عدم موجودگی میں یا صرف ایک بھائی یا ایک بہن کی موجودگی میں ماں کا حصہ ایک ثلث ہوتا ہے لیکن بہن بھائی دو یا زیادہ ہوں تو ماں کا حصہ ثلث سے کم ہو کر سدس ۱/۶ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میت کے حقیقی بہن بھائی میت کے بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں میراث نہیں پائیں گے۔

اسی طرح میت کے والد کی موجودگی میں بھی محجوب ہوں گے۔ البتہ دادے کی وجہ سے بھائی محجوب ہوں گے یا نہیں اس میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے اور میت کے اخیافی (ماں شریک) بھائی میت کے بیٹے، پوتے اور دادے وغیرہ میں سے کسی ایک کی موجودگی میں محجوب ہوں گے اس میں تمام فقہاء متفق ہیں کیونکہ ان کے وارث ہونے کیلئے میت کا کلالہ ہونا شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً'' [النساء: ۱۲] ''اور اگر ایسا مرد ہو جو کلالہ کے طور پر وارث ہوتا ہو۔''

اس سے مراد ماں شریک بھائی ہیں اور کلالہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا بیٹا موجود ہو نہ باپ۔

اسی طرح نانیاں ماں کی موجودگی میں محروم ہوتی ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور ﷺ نے نانی کو اس وقت وارث بنایا جب ماں موجود نہ ہو جیسا کہ اوپر یہ اصول مذکور ہوا ہے۔ جو شخص کسی کے واسطے سے میت سے رشتہ رکھتا ہے تو اس واسطہ کی موجودگی میں وہ

محجوب ہوگا۔ نانی کا میت کے ساتھ رشتہ ماں کے واسطہ سے ہے لہٰذا ماں کی موجودگی میں نانی محروم ہوگی۔ اسی طرح باپ کی موجودگی میں دادیاں محجوب ہوں گی دادے کی موجودگی میں محجوب نہیں ہوں گی اگر میت ایک نانی، ایک دادی اور والد چھوڑ کر مر گیا۔ دادی تو باپ کی موجودگی کی وجہ سے محجوب ہوگی لیکن نانی محجوب ہوگی یا نہیں اس میں راجح قول یہ ہے کہ نانی محجوب نہیں ہوگی۔ اس کو کل مال کا سدس ۱/۶ ملے گا۔

اسی طرح قریب کی دادیاں اور نانیاں میت کی دور کی دادیوں اور نانیوں کیلئے حاجب بنیں گی یعنی قریب والوں کی وجہ سے دور والے میراث سے محروم ہوں گے۔ قریب والے چاہے خود میراث سے حصہ پا رہے ہوں یا حصہ نہ پا رہے ہوں دور والوں کیلئے حاجب بنے گی۔ حصہ پانے کی صورت میں حاجب بننا تو واضح ہے کہ ماں ہونے کے طور پر جو حصہ بنتا تھا وہ جب قریب والی خود محجوب ہونے کی صورت میں بعید والی کیلئے حاجب کس طرح بنے گی؟ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک شخص والد، پڑدادی، اور سگڑ نانی، (ماں کی دادی کی ماں) چھوڑ کر مرا۔ تو اس صورت میں سارا مال باپ کو ملے گا۔ پڑدادی تو باپ کی وجہ سے محجوب ہے اور سگڑ نانی پڑدادی کی وجہ سے محجوب ہوگی۔

عول:

عول کا لغوی معنی کمی ہے اور علم فرائض کے اصطلاح میں فرائض کے اصولوں کے مطابق تقسیم کرنے کی صورت میں مخرج (جس عدد سے حصص نکلتے ہیں) کم پڑ جائیں اور سہام بڑھ جائیں تو اس کو عول کہا جاتا ہے۔

یعنی اہل فرائض کے حصص میں کمی واقع ہو چنانچہ ہر ایک کے حصے سے کچھ کچھ کم کر کے تمام اہل فرائض کو حصے دیئے جائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے ان سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص کا انتقال ہوا۔ ورثاء میں دو بیٹے، ماں، باپ اور بیوی چھوڑے ہوں تو ان کی میراث کیسے تقسیم ہوگی؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: بیوی کا ثمن ۱/۸، تسع ۱/۹ ہو جائے گا۔ یعنی حصہ میں کمی آنے گی حتیٰ کہ عورت کو آٹھواں حصہ ملنے کے بجائے نواں حصہ ملے گا کیونکہ اگر کمی واقع ہوتی یعنی عول نہ ہوتا تو مسئلہ کی تخریج وتصحیح چوبیس سے ہوتی، عول کی وجہ سے مسئلہ ستائیس سے حل ہوگا وہ اس طرح کے مسئلہ

مسئلہ ۲۴ مجموعہ ۲۷ (عول)

۲ بیٹیاں	ماں	باپ	بیوی
ثلثان	سدس	سدس	ثمن
۲/۳	۱/۶	۱/۶	۱/۸
۱۶	۴	۴	۳

تو عول کے بعد کے مسئلہ کو ستائیس پر تقسیم کریں گے۔ تو دو بیٹیوں کو اس میں سے سولہ، ماں کو چار، باپ کو چار اور بیوی کو تین حصے دیئے جائیں گے۔ اس مسئلہ کو مسئلہ منبریہ کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت علیؓ نے اس مسئلہ کی اس طرح تشریح خطبہ دیتے وقت منبر ہی بتائی تھی۔

تو اس میں ۲۴ میں سے سولہ، چار، چار اور تین ملنے سے ستائیس بنتے اس کو عول کہتے ہیں۔

تنبیہ:

وہ اعداد جن سے اصحاب الفرائض کے حصص نکالے جاتے ہیں سات ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۲۴ یعنی (چھ، دو، تین، چار، چھ، آٹھ، بارہ اور چوبیس) ان میں چار اعداد ایسے ہیں کے جن سے مسئلہ کی تخریج ہو ان میں عول نہیں ہوتا یعنی ان میں عول کی صورت پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور وہ ہیں دو، تین، چار اور آٹھ اور باقی تین اعداد (چھ، بارہ اور چوبیس) میں کبھی عول ہوگا اور کبھی نہیں۔ چنانچہ چھ میں دس تک عول ہوگا یعنی سات، آٹھ، نو اور دس تک جفت اور طاق دونوں اعداد تک عول ہوگا۔ ان اعداد کی مثالیں جن میں عول بالکل ہوتا ہی نہیں۔ درج ذیل ہیں۔

(۱) مسئلہ ۲ متوفی زینب

شوہر	حقیقی بہن
نصف	نصف
۱	۱

(۲) مسئلہ ۲ راشدہ

شوہر	علاتی بہن
نصف	نصف
۱	۱

(۳) مسئلہ ۲ متوفی احمد

بیٹی	والد
نصف	ع
۱/۲	۱/۲

تین سے حل ہونے والے مسائل کی صورتیں۔

(۱) زید کا انتقال ہو گیا۔ ورثاء میں دو اخیافی (ماں شریک) بھائی اور ایک حقیقی بھائی چھوڑا تو مسئلہ تین سے حل ہو گا ان میں سے ایک تہائی اخیافیوں کو اور دو تہائی حقیقی بھائی کو ملے گا۔

حقیقی بھائی	اخیافی
۲	۱

(۲) دو حقیقی بہنیں، ایک علاتی بھائی چھوڑ کر مرا تو مسئلہ تین سے حل ہو گا۔ دو حقیقی بہنوں کو دو تہائی ۲/۳ اور علاتی کو ایک تہائی ۱/۳ ملے گا۔

(۳) دو حقیقی اور دو اخیافی بہنیں چھوڑ کر انتقال کر گیا تو دو حقیقی بہنوں کو دو تہائی ۲/۳ اور دو اخیافیوں کو ایک تہائی ۱/۳ حصہ ملے گا اور مسئلہ تین سے حل ہو گا۔

چار سے مسئلہ حل ہونے کی مثال: ایک عورت، ایک بیٹی، شوہر اور عصبات میں سے کوئی عصبہ چھوڑ کر مر گئی تو مسئلہ چار سے حل ہو گا۔ ایک چوتھائی شوہر کو نصف بیٹی کو اور باقی عصبہ کو ملے گا۔

مسئلہ ۴ متوفی رشیدہ

شوہر	بیٹی	بھائی
ربع	نصف	ع
۱	۲	۱

اور آٹھ سے مسئلہ حل ہونے کی مثال ایک شخص کا انتقال ہوا ورثاء میں بیوی، ایک بیٹی، اور کوئی عصبہ چھوڑا تو مسئلہ آٹھ سے حل ہو گا ان میں سے ایک یعنی آٹھواں حصہ بیوی کو نصف بیٹی کو اور باقی عصبہ کو ملے گا۔ مسئلہ کی صورت اس طرح ہوگی۔

مسئلہ ۸

بیوی	بیٹی	پوتا
۱	۴	۳

دوسری مثال:

مسئلہ ۸

بیوی	بیٹا
۱	۷

ان اعداد کی مثالیں جن سے مسئلہ حل ہونے کی صورت میں کبھی عول ہوتا ہے۔

(۱) چھ کے عدد کی چند مثالیں:

مسئلہ ۶ متوفی (اس میں عول نہیں ہے)

دادی	اخیافی بہن	حقیقی بہن	علاتی بہن
سدس	سدس	نصف	سدس
۱	۱	۳	۱

سات تک عول ہونے کی مثال:

مسئلہ ۶ عول ۷

دادی	دو اخیافی	ا حقیقی	ا علاتی
سدس	ثلث	نصف	سدس
۱	۲	۳	۱

چھ کے آٹھ تک عول ہونے کی مثال:

مسئلہ ۶ مجموعہ ۸ عول

شوہر	ماں	حقیقی بہن
نصف	نصف	ثلث

شوہر کو ۳/۸، والدہ کو ۲/۸، بہن کو ۳/۸ ملے گا۔

یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے ابتدائی زمانے میں پیش آیا تھا۔ حضرت عمرؓ حضرات صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ تو حضرت عباسؓ نے مشورہ دیا کہ ان کے سہام حصص کے بقدر تقسیم کر دیا جائے ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی

تصریح میرے سامنے نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ ان میں سے کس کو مقدم اور کس کو مؤخر کیا جائے کیونکہ قرآن میں سب کیلئے نئے حصص مقرر ہیں۔ البتہ میں ایک رائے پیش کرتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر وہ غلط ہے تو میری طرف سے منسوب ہوگی۔ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے ہے کہ سب کے حصوں میں کچھ کچھ کمی کر کے سب کو حصہ دیا جائے چنانچہ اسی طرح تقسیم کیا گیا۔ کسی نے اس رائے کے ساتھ اختلاف بھی نہیں کیا حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کا دور آ گیا۔ تو ان کے بیٹے حضرت ابن عباسؓ نے اس رائے سے اختلاف ظاہر کیا اور فرمایا کہ اگر اس میں ان ورثاء کو مقدم کرتے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدم رکھا ہے اور ان کو مؤخر کرتے جن کو اللہ تعالیٰ نے مؤخر فرمایا ہے تو بہتر ہوتا! ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سے ورثاء ہیں جن کو مقدم کیا گیا اور مؤخر کیے جانے والے ورثاء کون سے ہیں؟ فرمایا: شوہر، بیوی، ماں، دادی کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں سے مقدم رکھا ہے اور بیٹیوں، پوتیوں، حقیقی اور علاتی بہنوں کو مؤخر فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ کبھی ذوالفروض اور کبھی عصبات میں سے ہوتے ہیں جبکہ پہلے والے ہمیشہ اور ہر حالت میں ذوی الفروض رہتے ہیں ان کے سہام میں کمی نہیں آتی۔ ان سے عرض کیا گیا یہ اختلاف آپ نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ظاہر کیوں نہیں کیا؟ تو فرمایا: حضرت عمرؓ بارعب تھے ان کے رعب کی وجہ سے نہیں بولا۔

حضرت ابن عباسؓ کا وہاں نہ بولنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ اور اگر صریح مسئلہ ہوتا تو ضرور بولتے۔

چھ کے آٹھ تک عول کی ایک اور مثال ہے کہ ایک عورت کا انتقال ہوا ورثاء میں شوہر ماں، دو حقیقی بہنیں چھوڑیں تو اس صورت میں شوہر کو نصف، ماں کو سدس اور بہنوں کو دو تہائی ۲/۳ ملے گا۔ مسئلہ کی تخریج چھ سے ہوگی مگر ان سہام کا مجموعہ آٹھ ہے تو شوہر کو چھ کے ۱/۲ ملنے کے بجائے آٹھ کا ۱/۲ اور ماں کو ۱/۶ کے بجائے ۱/۸ اور بہنوں کو چھ ۲/۳ ملنے کے بجائے آٹھ کے ۲/۳ ملے گا۔

چھ کے نو تک عول کی مثال: ایک عورت کا انتقال ہوا اور اس نے ورثاء میں مندرجہ افراد چھوڑے، شوہر، ماں، حقیقی، علاتی، اخیافی بہن، تو شوہر کو نصف، ماں کو چھٹا، حقیقی کو نصف، علاتی کو سدس اور اخیافی کو پھر سدس (چھٹا) ملے گا۔ مسئلہ کی تخریج چھ سے ہوگی۔ نو تک عول ہوگا۔ صورت اس طرح ہوگی۔

۱ الاختیار ۴/۱۹۷

مسئلہ ۶ مجموعہ سہام ۹ عول ۹

اخیافی	علاتی بہن	حقیقی بہن	ماں	شوہر
سدس	سدس	نصف	سدس	نصف
۲	۲	۳	۲	۳

چھ کے دس تک عول ہونے کی مثال شوہر، ماں دو اخیافی بہنیں، دو حقیقی بہنیں تو شوہر کو نصف، ماں کو سدس (چھٹا) اخیافیوں کو ثلث ۱/۳ ملے گا۔ مسئلہ کی تخریج چھ سے ہوگی اور دس تک عول ہوگا، صورت یہ ہے۔

مسئلہ ۶ عول ۱۰

۲ ماں شریک بہنیں	۲ حقیقی بہنیں	والدہ	شوہر
ثلث	ثلثان	سدس	نصف
۲/۱۰	۴/۱۰	۱/۱۰	۳/۱۰

بارہ سے مسئلہ کی مثال: مندرجہ ذیل ورثاء چھوڑ کر مرا۔

علاتی بھائی	دو حقیقی بہنیں	بیوی
ع	ثلثان	ربع
۱/۱۲	۸/۱۲	۳/۲

بیوی کو ۱/۴، دو حقیقی بہنوں کو ۲/۳، باقی علاتی بھائی کو بطور عصبہ کے اور ربع آنے کی وجہ سے مسئلہ ۱۲ سے ہے۔

تنبیہ:

یاد رہے کہ بارہ سترہ تک عول ہوگا مگر صرف طاق عدد میں یعنی تیرہ، پندرہ اور سترہ تک۔ چودہ اور سولہ تک عول نہیں ہوگا۔

تیرہ تک عول ہونے کی مثال:

مسئلہ ۱۲ عول ۱۳

دو حقیقی بہنیں	دادی	بیوی
ثلثان	سدس	ربع
۸	۲	۳

چنانچہ بیوی کو ۱۲ کے بجائے تیرہ میں سے ۳ دادی کو دو، حقیقی بہنوں کو ۸ ملے گا۔

۱۲ کے ۱۵ تک عول ہونے کی صورت

مسئلہ ۱۲ عول ۱۵ متوفی

بیوی	دو اخیافی	دو حقیقی بہنیں
ربع	ثلث	ثلثان
۳	۴	۸

بیوی کو ۱۲ میں سے ۳ پہنچنے کے بجائے ۱۵ سے ۳، اخیافیوں کو ۴ اور حقیقی کو ۷ ملا اور ۱۲ کے بجائے مسئلہ ۱۵ سے حل ہوگا۔

تیرہ ۱۳ سے سترہ ۱۷ تک عول ہونے کی مثال:

مسئلہ ۱۲ عول ۱۷

بیوی	والدہ	دو اخیافی	دو حقیقی بہنیں
ربع	سدس	ثلث	ثلثان
۳	۲	۴	۸

بیوی کو بارہ سے تین ملنے کے بجائے سترہ سے تین اور والدہ کو ۱۲ سے ۲ ملنے کے بجائے کمی ہو کر ۱۷ سے ۲ اور دو اخیافیوں کو ۱۲ سے ۴ اور حقیقیوں کو ۸ ملنے کے بجائے کمی ہو کر سترہ سے ملے۔

ایک اور مثال:

ایک شخص کا انتقال ہوا، ورثاء میں تین بیویاں ایک دادی، ایک نانی، چار اخیافی بہنیں اور آٹھ حقیقی بہنیں چھوڑیں اس مسئلے کو ام الارامل کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک بھی مذکر نہیں ہے۔ ایک شخص نے سترہ دینار اور سترہ عورتیں چھوڑیں ان میں سے ہر ایک عورت کو ایک دینار ملا۔ اصل مسئلہ ۱۲ سے ہوگا اور سترہ تک عول ہوگا چوبیس سے مسئلہ کی تخریج کی جائیگی۔ مثال:

مسئلہ ۲۴:

بیوی	والد	والدہ	بیٹا
ثمن	سدس	سدس	ع
۳	۴	۴	۱۳

چوبیس کے ستائیس تک عول ہونے کی مثال:

مسئلہ ۲۴ عول ۲۷

۲ بیٹیاں	والدہ	والد	بیوی
ثلثان	سدس	سدس	ثمن
۲/۳	۱/۶	۱/۶	۱/۸
۱۶	۴	۴	۳

یہ وہی مسئلہ منبریہ ہے جس کو حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اور فرمایا تھا بیوی کا ثمن ۱/۸، ۱/۹ ہو جائیگا۔

تنبیہ:

یہ بات ملحوظ رہے کہ ۲۴ کا عدد سے مسئلہ کی تخریج ہونے کی صورت میں اگر عول ہوا تو وہ صرف ستائیس تک ہی عول ہوگا پچیس، چھبیس تک کبھی عول نہیں ہوگا۔

کسی شخص کا انتقال ہوا ورثاء میں بیوی، والدہ دو حقیقی بہنیں ایک بیٹا کافر، یا قاتل چھوڑا تو یہ کافر یا قاتل قتل کی وجہ سے میراث سے محروم ہوگا۔ دوسرے کیلئے حاجب (مانع) بھی نہیں بنے گا لہٰذا اس بیٹے (قاتل) کی موجودگی میں بیوی کا ۱/۸، ماں ۱/۶ نہیں ہوگا بلکہ بیوی کو ۱/۴، ۱/۳ اور حقیقی بہنوں ۲/۳ ہی ملے گا۔ مسئلہ کی تخریج ۱۲ سے ہوگی سترہ تک عول ہو کر تصحیح ہو جائے گی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک محروم المیراث دوسرے کیلئے حاجب (مانع) بن سکتا ہے۔ یعنی مذکورہ صورت میں بیٹے کو قتل یا کفر کی وجہ سے تو کچھ نہیں ملے گا مگر ان کے بقول دوسروں کے حصص میں کمی آئے گی چنانچہ بیوی کا حصہ ۱/۴ سے کم ہو کر ۱/۸ ماں کا ۱/۳ سے کم ہو کر ۱/۶ ہوگا۔ ان کے نزدیک مسئلہ کی تخریج ۲۴ سے ہوگی اور اکتیس تک عول ہوگا۔

اہم فائدہ:

چھ کا اگر دس یا نو یا آٹھ تک عول ہو تو متوفی یقینی طور پر مذکر ہوگا اور اگر سات تک عول ہو تو دونوں کا احتمال ہے۔ یعنی مذکر بھی ہو سکتا ہے اور مؤنث بھی اور بارہ کا اگر سترہ تک عول ہو جائے تو متوفی مذکر ہی ہوگا اور اگر سترہ یا پندرہ کی طرف عول ہو تو دونوں کا احتمال ہے۔ اور چوبیس کا عدد ستائیس تک عول ہو جائے تو میت مذکر ہی ہو سکتی ہے۔

باب الرد

یہ عول کی ضد ہے، رد کا لغوی معنی لوٹانا اور علم الفرائض کی اصطلاح میں حصص کے بچ جانے کو رد کہتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تقسیم فرائض کے اصول کے مطابق مسئلہ کی تقسیم نہیں ہونے کی صورت میں اصحاب فروض کو ان کے مقرر کردہ حصص دینے کے بعد کچھ حصص بچ جائیں اور عصبات میں سے کوئی ایک عصبہ بھی موجود نہ ہو تو ان زائد حصص کو ذوی الفروض ان کے حصص کے تناسب سے دوبارہ تقسیم کرنے کو رد کہا جاتا ہے۔

تنبیہ:

باقی حصص کو ذوی الفروض میں دوبارہ تقسیم کرنے میں زوجین (میاں بیوی) کو نہیں دیئے جائیں گے کیونکہ یہ ذوالفروض سببی ہیں رد صرف ذوی الفروض نسبیوں پر ہوتا ہے ان کو صرف وہی حصہ دیا جائے گا جو قرآن کریم میں ان کیلئے مقرر ہے ان کے علاوہ باقی ذوالفروض نسبی رشتوں کی وجہ سے رد کے مستحق ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ''وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ'' [الانفال: ۷۵] ''اور قرابت والے بعضے ان کے نزدیک تر ہیں ساتھ بعض کے۔''

جن ذوالفروض پر رد ہوگا وہ یہ ہیں: (۱) ماں (۲) جدہ (دادی، نانی) (۳) بیٹی (۴) پوتی (۵) حقیقی بہن (۶) علاتی بہن (۷) اخیافی بھائی (۷) اخیافی بہن۔

رد کے مسائل حل کرنے کا طریقہ:

مسئلہ میں صرف ایک جنس کے افراد ہوں گے یا ایک سے زیادہ یعنی صرف بیٹیاں یا پوتیاں یا بہنیں ہوں گی یا بہنوں کے ساتھ ماں، اخیافی بھائی وغیرہ بھی ہوں گے تین جنسوں سے زائد نہیں ہو سکتے کیونکہ زیادہ ہونے کی صورت میں رد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسئلہ میں صرف ایک جنس ذوالفروض نسبی میں سے ہو اور زوجین میں سے کوئی نہ ہو تو حصص کو ذوی الفروض کے عدد افراد پر تقسیم کیا جائے گا۔ اور اگر ذوالفروض نسبی کے دو یا تین اجناس موجود ہوں تو مسئلہ کی تخریج ان کے سہام کے مجموعہ سے ہوگی۔

مثال (۱): ایک شخص متوفی نے ورثاء میں ایک دادی، ایک اخیافی بہن چھوڑی تو دادی کا حصہ مقرر سدس 1/6 ہے اور ایک اخیافی بہن کو بھی چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ دو چھٹے حصے ان کا حصہ

مقررہ ہے اور باقی کو دوبارہ رد کے طور پر دیا جائے گا۔ اس اعتبار سے مجموعہ سہام ۲ ہیں تو مسئلہ کی تخریج دو سے ہوگی۔

مسئلہ ۲:

جدہ	اخیافی
۱	۱

مثال (۲): دادی اور دو اخیافی بہنیں ہو تو دادی کا حصہ چھٹا ۱/۶ اور دو اخیافیوں کو ۱/۳ ایک تہائی۔ اصل مسئلہ چھ سے ہونا چاہیے، چھ کا ۱/۶ ۔ ۱ اور چھ کا ۱/۳ ۔ ۲ تو مجموعہ سہام ہوں گے تو مسئلہ تین سے حل ہوگا۔ اس طرح:

مسئلہ ۳:

جدہ	دو اخیافی بہنیں
۱	۲

مثال (۳): متوفی کی دو بیٹیاں اور والدہ ہیں۔ دو بیٹیوں کا حصہ مقررہ دو تہائی ۲/۳، اور ماں کا حصہ ۱/۶ ہے تخریج مسائل کے اصول کے مطابق یہ مسئلہ چھ سے حل ہونا چاہیے تو چھ کا ۲/۳ چار ہے، اور ۱/۶ ایک ہے چنانچہ مجموعہ پانچ ہو گئے۔ ایک حصہ بچ گیا اس ایک حصے کو رد کے طور پر ان کے حصص کے تناسب سے ان پر تقسیم کیا جائے گا۔ تو یہاں ذوی الفروض نسبی کے دو جنس موجود ہیں تو رد کے اصول کے مطابق مجموعہ سہام (حصص) کو تخریج مسئلہ بنائیں۔ اس طرح:

مجموعہ سہام ۵

۲ بیٹیاں	ماں
۲/۳	۱/۶
۴	۱

اور ذوی الفروض نسبی کے ایک طبقہ کے ساتھ ذوالفروض سببی (میاں بیوی میں سے کوئی ایک) بھی موجود ہو تو طریقہ تخریج مسئلہ اس طرح ہوگا کہ سببی کو اس کا حصہ اس کے کم عدد سے دینے کے بعد دیکھا جائے گا کہ باقی ذوالفروض نسبی کے افراد پر برابر بلا کسر تقسیم ہو گیا تو کوئی ضروب تقسیم کی ضرورت نہیں ہوگی جیسے

مسئلہ ۴-۱=۳

۳ حقیقی بہنیں	بیوی
۲/۳	۱/۴
۳	۱

اور اگر باقی، ذوی الفروض نسبی کے افراد پر بلا کسر تقسیم نہیں ہو رہا ہے تو ان کے عدد کو مخرج کے ساتھ ضرب دیں گے، حاصل ضرب سے دونوں فریقوں (نسبی، سببی) کو حصہ دے گا جیسے

مسئلہ ۴-۱=۳×۵=۱۵

۵ بہنیں	بیوی
۱۰	۱/۵

اگر ذوی الفروض نسبی کے دو یا تین طبقات کے ساتھ ذوی الفروض سببی بھی موجود ہو تو ذوی الفروض سببی کو اس کے اقل مخرج سے حصہ دینے کے بعد دیکھیں گے کہ اگر باقی ذوی الفروض نسبی کے مسئلہ پر بلا کسر تقسیم ہوتا ہے تو کوئی ضرب تقسیم کی ضرورت نہیں اور اگر باقی بلا کسر تقسیم نہیں ہو رہا ہے تو ان کے مجموعہ اسہام کو سببی کے مخرج کے ساتھ ضرب دیا جائے گا اور حاصل ضرب دونوں مسئلوں کی تصحیح ہوگی۔

البتہ سببی کو اس سے حصہ دینے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس کے حصے کو ذوی الفروض نسبی کے مجموعہ سہام کے ساتھ ضرب دیا جائے گا اور نسبیوں کے سہام کو باقی کے ساتھ ضرب دیا جائے گا۔ جیسے

مسئلہ ۸×۳=۲۴

۶ جدات	۹ بیٹیاں	بیوی
۱/۶	۲/۳	۱/۸
۷	۷/۱۴	۱/۳

ایک مثال: ایک شخص کا انتقال ہوا ورثاء میں بیوی، ۳ جدات اور چھ اخیافی بہن بھائی چھوڑے تو بیوی کا کا حصہ ایک چوتھائی ہے اور جدات کو چھٹا اور اخیافیوں کو ایک ملے گا۔ مگر یہ مسئلہ رد یہ ہے تو رد کے اصول کے مطابق چار کے عدد سے بیوی کو ایک چوتھائی دے دیا باقی رہ گیا ۳ چوتھائی اور ان پر بلا کسر تقسیم نہیں ہوتا تو ہم نے ترکہ کو دو اتھائی حصوں پر تقسیم کیا۔ وہ اس

طرح ایک فریق کو دوسرے فریق سے دیا۔ یعنی ۴ کو ۶ کے ساتھ ضرب دیا ۶×۴ = ۲۴، پھر ۲۴ کو اصل مسئلہ اول کے ساتھ ضرب دیا۔ ۲۴×۴ = ۹۶ پھر حاصل ضرب کو باقی جو تین کیساتھ ضرب دیا ۹۶×۳ = ۲۸۸ حصے ہوگئے اب اس میں سے بیوی کو ۲۸۸ کا ۱/۴ جو ۷۲ بنتا ہے دے دیا اور چار جدات کو اتالیس جو ۲۸۸ کا ۱/۶ ہے بطور فرض ۴۴ بطور رد کے دے دیا تو ان کا حصہ بھی ۲ کے ہوگیا اور اخیافیوں کو ۲۸۸ کا ۲/۳ جو ۹۶ بنتا ہے بطور ان کا حصہ مقررہ اور ۴۸ بطور رد کے دے دیا تو ان کا کل حصہ ۱۴۴ ہوگیا۔

ایک اور مثال: ایک شخص نے مندرجہ ذیل ورثاء چھوڑے، بیوی، ایک بیٹی ایک پوتی اور دادی، تو بیوی کا حصہ آٹھواں ہے اصل مسئلہ تخریج مسائل کے اصول کے لحاظ سے حل کیا جائے تو چوبیس سے حل ہوگا چوبیس کا آٹھواں تین ہے بیٹی کا نصف ہے چوبیس کا نصف ۱۲ ہے اور پوتی کو چھٹا ملے گا۔ چوبیس کا چھٹا چار ہے اور دادی کا حصہ بھی چھٹا ہے جو چار ہے یہ تیئس ہوگئے اور ایک حصہ بچ گیا اس ایک حصہ کو بیوی کے سوا باقی ذوی الفروض (بیٹی، پوتی، دادی) کو بطور رد کے ان کے حصص کے تناسب سے دیئے جائیں گے چنانچہ اس کو رد کے اصول کے مطابق حل کیا جائے تو بیوی کو اقل تخرج جس سے ثمن ۱/۸ نکلتا ہے آٹھ سے ایک حصہ دیں گے۔ باقی رہ گئے سات حصے اور بیٹی، پوتی اور جدہ کے حصوں کا مجموعہ پانچ ہے اس کو آٹھ سے ضرب دی جائے گی۔ حاصل ضرب، چالیس آئے گا۔ اور اس عدد سے دونوں فریقوں (سببی، نسبی) کے حصص بلا کسر نکل آئیں گے۔ تو چالیس کا آٹھواں حصہ پانچ ہے وہ بیوی کو ملے گا باقی پینتیس میں سے گیارہ حصے بیٹی کو اور سات سات پوتی اور دادی کو ملیں گے۔ واللہ اعلم

دادے کے بارے تفصیل:

جد صحیح تو وارث ہوگا وہ ایک ہی ہوگا کیونکہ اقرب ابعد کیلئے حاجب بنتا ہے۔ چنانچہ اگر پردادا موجود بھی ہو تو دادے کی موجودگی میں حصہ نہیں پائے گا۔ اکثر صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ باپ کی عدم موجودگی میں دادا اس کا قائم مقام ہوگا۔ دادے کی موجودگی وہ تمام حضرات میراث میں حصہ پائیں گے جو باپ کی موجودگی میں حاصل کرتے ہیں اور وہ تمام حضرات محجوب ہوں گے جو باپ کی موجودگی میں محجوب ہوتے ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ نے اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔ امام بخاریؒ نے ایک روایت نقل کی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ابن الزبیرؓ نے فرمایا ہے "الجد اب" دادا باپ کی طرح ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ" [الاعراف. ۲۶] "اے ابن آدم"۔ دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے: "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ"۔ [یوسف ۳۸] "اور پیروی کی میں نے دین باپوں اپنے کی ابراہیم اور اسحق اور یعقوب کی"۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے کی ان کے زمانے میں کسی نے بھی مخالفت نہیں کی جبکہ حضرات صحابہ کرام کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میرے پوتے میرے وارث بنیں گے۔ ان کی موجودگی میں بھائی محجوب ہوں گے اور میں اپنے پوتے کا وارث نہیں ہوں گا۔ (یعنی اپنے بیٹے کی موجودگی میں)۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مختلف اقوال مروی ہیں۔[1]

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر دادا اور بھائی موجود ہوں تو دادے کو بھائیوں کے برابر حصہ ملے گا جبکہ اس صورت میں تہائی سے اس کا حصہ کم نہ ہوتو ہو اور اگر بھائیوں کے ساتھ ملا کر تقسیم کرنے میں ایک تہائی سے کم بے مل رہا ہوتو دادے کو ایک تہائی دے کر باقی کو بھائیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بھی یہی قول ہے۔ اور حضرت سعید بن المسیبؒ، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہؒ اور قبیصہ بن ذویبؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اس طرح فیصلہ کیا کہ حقیقی اور علاتی بھائیوں کے ساتھ اگر دادے کو ملا کر تقسیم کرنے میں ثلث مال (تہائی مال) سے زیادہ مل رہا ہے تو ملا کر تقسیم کیا جائے گا۔ اور اگر بھائی زیادہ ہوں اور تقسیم میں دادے کو ایک تہائی سے کم مل رہا ہوتو دادے کو ایک تہائی دینے کے بعد باقی کو بھائیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور حقیقی بھائی علاتیوں کیلئے حاجب بنیں گے اور اگر حقیقی بھائیوں کی جگہ بہنیں ہوں تو ان کو ان کے حصے دینے کے بعد جو بچ جائے گا وہ علاتی بہن بھائی آپس میں "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" کے طور پر تقسیم کریں گے۔[2]

حضرت عبدالرحمن بن ابی الزناد نے اپنے والد ابو الزناد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے دادے کے متعلق فیصلے فرمایا ہے کہ اگر دادے کے ساتھ صرف ایک بھائی موجود ہوتو ترکہ ان کے درمیان برابر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اگر دادے کے ساتھ صرف ایک بہن موجود ہوتو بہن کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی دادے کو دے دیا جائے گا اور اگر دو بہنیں ہوں تو ایک حصہ دو

---

[1] بخاری: [۱۳۱۶] [2] [سنن بیہقی: ۶/۲۴۸]

بہنوں اور ایک حصہ دادے کو دے دیا جائے گا اور اگر دادے کے ساتھ دو بھائی موجود ہوں تو دادے کو ثلث دے دیا جائے گا اور اگر دادے کے ساتھ دو بھائی موجود ہوں تو دادے کو ثلث دے دیا جائے گا۔ دادے کو حصہ دینے کے بعد باقی بھائیوں کا ہے البتہ تقسیم میں حقیقی بھائی، علاتیوں (باپ شریک) سے مقدم ہوں گے یعنی باقی مال ان کو ملے گا اور علاتی محجوب ہوں گے اور حضرت عمرؓ اخیافیوں کو دادے کی موجودگی میں وارث نہیں سمجھتے تھے اور حضرت عثمانؓ نے بھی دادے کے متعلق وہی فیصلے فرمایا جو حضرت عمر نے فرمایا تھا۔[1]

حضرت امام شعبیؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کو بصرہ سے خط لکھا کہ چھ بھائی اور ایک دادے کے درمیان تقسیم میراث کی صورت کیا ہوگی؟ حضرت علیؓ نے جواب میں لکھا دادے کو ترکہ کا ساتواں ۱/۷ دے دو۔[2]

ملاحظہ:

ذیل میں چند مثالیں حضرات صاحبین کے قول کے مطابق لکھی جاتی ہیں کہ جن میں دادے کی بھائیوں کے ساتھ مقاسمت ہوگی۔

مثال نمبر ۱۔ ورثاء! دادا، بھائی، اس صورت میں مال دونوں میں برابر تقسیم ہوگا۔ اس صورت میں ثلث کے مقابلے میں تقسیم میں دادے کو فائدہ ہے۔

مثال نمبر ۲: دادا، دو بھائی، اس صورت میں بھی تقسیم ہوتی، ہر ایک کو ایک ایک تہائی ملے گی۔

مثال نمبر ۳: دادا، تین بھائی اس صورت میں دادے کو بھائی بنا کر تقسیم کرنے میں دادے کو ثلث سے کم مل رہا ہے۔ لہٰذا ثلث دادے کو پہلے دینے کے بعد باقی کو بھائیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

دادا کے احوال:

دادا کی تین حالتیں ہیں: (۱) مقاسمت (بھائیوں کے ساتھ ملا کر تقسیم) (۲) اصحاب الفرائض کو حصہ دینے کے بعد باقی کا ۱/۳۔ (۳) جمیع مال کا سدس ۱/۶۔ ان تینوں میں سے جو بھی دادے کیلئے بہتر ہوگا وہی طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

---

[1] سنن بیہقی: ۲۴۸/۶ [2] بیہقی ۲۴۹/۶

مثلاً ایک عورت کا انتقال ہوا، ورثاء میں شوہر، دادا اور بھائی موجود ہیں نصف شوہر کو دینے کے بعد باقی کو دادا اور بھائی کے درمیان برابر تقسیم کردیا جائے گا کیونکہ اس طرح کرنے میں دادے کو فائدہ ہے۔

مثال (۲): کوئی شخص بیوی، دادا اور بھائی چھوڑ کر مرا تو بیوی کو ایک ربع ۱/۴ حصہ دینے کے بعد باقی کو دادے اور بھائی میں تقسیم کردیا جائے گا۔ اس میں بھی دادے کو ثلث کے مقابلے میں فائدہ ہے۔

مثال (۳): کسی نے دادی، دادا، دو بھائی اور ایک بہن ورثاء چھوڑے تو اس صورت دادی کو حصہ مقررہ ۱/۶ دینے کے بعد باقی کا ایک تہائی ۱/۳ دادے کو دیا جاتا تھا اور باقی کو بہن بھائی آپس میں تقسیم کریں گے مذکر و مؤنث کو ایک کے حساب سے۔

مثال (۴): ایک عورت کا انتقال ہوا ورثاء میں دادی، ایک بیٹی، دادا اور دو بھائی ہیں تو چھٹا حصہ مقررہ دادی کو اور نصف بیٹی کو دینے کے بعد جو باقی ہے اس کو برابر تقسیم کریں گے یا اس کا ایک تہائی دادے کو دینے میں فائدہ ہے البتہ کل مال کا ۱/۶ دینے میں دادے کو فائدہ تو کل مال کا چھٹا حصہ اس کو دے دیا جائے گا۔

مثال نمبر (۵): ایک عورت نے یہ ورثاء چھوڑے شوہر، والدہ، دادا، بھائی، شوہر کو نصف اور والدہ کو ثلث ۱/۳ دینے کے بعد باقی صرف ۱/۶ بچا وہ دادے کو ملے گا بھائی محروم ہوگا۔

ملاحظہ:

میت کے علاتی بھائی دادے کی موجودگی میں محجوب نہیں ہوں گی۔ جیسے حقیقی بھائی محجوب نہیں ہوتے۔ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا میت کے علاتی بھائیوں کو بھی کیا جائے گا۔ جب دادا اپنا حصہ لے چکا ہو تو باقی کی تقسیم میں حقیقی بھائی کی موجودگی میں محجوب ہوں گے۔ یعنی دادے کے ساتھ مقاسمت میں شامل ہوں گے مگر حقیقی بھائیوں کی وجہ سے وہ میراث سے ساقط ہوں گے۔ البتہ حقیقی بھائی موجود نہ ہو صرف ایک حقیقی بہن ہو تو دادے کو حصہ دینے اور نصف بہن کو دینے کے بعد کچھ بچ جائے تو علاتیوں کو ملے گا۔

مثال (۱): ایک شخص نے ورثاء میں دادا ایک حقیقی اور ایک علاتی (باپ شریک) بھائی چھوڑا تو ابتداء میں مال کو تین حصوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔ ایک ثلث ۱/۳ جو دادے کو دے دیا جائے گا باقی دو ثلث حقیقی کو ملے گا۔ علاتی محجوب ہوگا گویا دادے کے ساتھ تقسیم میں شامل ہوگا مگر

حقیقی کے مقابلے میں میراث نہیں لے گا۔

مثال (۲): اگر یہ ورثاء ہوں دادا حقیقی بہن اور علاتی بہن اس صورت میں آدھا دادے کو باقی آدھے کو حقیقی بہن لے گی علاتی محجوب ہو گی۔

مثال (۳): اگر یہ ورثاء ہو دادا، ایک حقیقی بہن دو علاتی بہنیں تو ترکہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جن میں ۲/۵ دادے کو، بہن حقیقی کو ۱/۵ اور دو علاتیوں کو ۲/۵ ملے گا۔ پھر نصف کو پورا کرنے کیلئے اس کو حقیقی بہن کے حصے کے ساتھ ملایا جائے گا۔ نصف حقیقی کو دینے کے بعد علاتیوں کے پانچویں حصہ کا نصف ملے گا۔ اصل مسئلہ ۵ سے حل ہوگا کسر کو ختم کرنے کیلئے ۵ کو ۲ میں ضرب دیں گے حاصل ضرب دس آئے گا دس میں سے ۴ دادے کو ۵/۱۰ حقیقی کو اور ۱/۲۰ علاتیوں کو ملے گا۔

مثال (۴): اگر یہ ورثاء ہیں دادا، حقیقی بہن، علاتی بھائی یہاں بھی مال ان کے درمیان پانچ حصوں میں منقسم ہوگا دادے کو ۲/۵، حقیقی بہن کو ۱/۵ اور علاتی بھائی کو ۲/۵ پھر علاتی کے حصے سے نصف ۸ حقیقی بہن کے حصے کے ساتھ ملایا جائے گا اور علاتی کے پاس صرف ۱/۵ کا نصف یعنی ۱/۱۰ باقی رہے گا۔

مثال (۵): اگر ورثاء میں یہ ہوں دادا، حقیقی بہنیں، دو علاتی بہنیں اس صورت میں تین حصوں سے ترکہ کو تقسیم کیا جائے گا ایک حصہ دادے کو ایک ایک تہائی حقیقی اور علاتی بہنوں کا ہوگا پھر علاتیوں کا حصہ حقیقیوں کو دلایا جائے گا علاتی محجوب ہوں گے۔

مثال: اگر ورثاء یہ ہوں والدہ، حقیقی بہن، دو علاتی بھائی ایک بہن تو ماں کو اس کا حصہ ۱/۶ ادے دیا جائے گا۔ اور دادے کو باقی کا ۱/۳ ملے گا مگر باقی ۵/۶ ہے جس کا ۱/۳ بلا کسر (صحیح) نہیں نکلتا تو تصحیح کیلئے ثلث ۱/۳ کا مخرج ۳ کو ۶ کے ساتھ ضرب دیں گے۔ حاصل ضرب ۱۸ آئے گا تو اٹھارہ سے سب کے سہام بلا کسر نکل آئیں گے تو ماں کو ۳/۱۸ اور دادے کو باقی کا ۱/۳ جو ۵/۱۸ ہے دیا جائے گا۔ حقیقی بہن کو نصف ۹/۱۸ ملے گا۔ باقی رہ گیا ۱/۱۸ اس کو یہ علاتی بہن بھائی پانچ حصوں میں منقسم کر کے تقسیم کریں گے ۱/۱۸ کو پانچ حصے کرنے کیلئے تصحیح کی جائے گی جو نوے سے تصحیح ہوں گی جس میں بہن کو ۱/۹۰ اور ہر بھائی کو ۲/۹۰ ملے گا۔

مثال (۶): اگر ورثاء یہ ہوں: ماں، دادا، حقیقی بہن، ایک علاتی بہن ایک بھائی تو ماں کا حصہ ۱/۶ ہے باقی دادے اور بہنوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ لہذا باقی کا ۱/۳ دادے کو اور اس کا نصف حقیقی اور ایک حصہ علاتیوں کیلئے باقی بچا مسئلہ کی صورت اس طرح ہو گی۔

۱/۶ یا ۳/۱۸ + ۵/۱۸ + ۹/۱۸ = ۱۷/۱۸ تو باقی بچا ۱/۱۸ = ۳/۵۴ : ۳ اس مسئلے کو مختصر زیر کہتے ہیں۔

نوٹ: مذکورہ تمام مسائل حضرات صاحبین کے مسالک کے مطابق ہیں۔

جدات (دادیاں، نانیاں):

جدہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) صحیحہ (۲) فاسدہ جدہ صحیحہ: ماں کی ماں اور باپ کی ماں یعنی نانی اور دادی اسی طرح پڑنانی اور پڑدادی وغیرہ جدہ صحیحہ کے تحت آئے گا۔

جدہ فاسدہ: ہر وہ جدہ دادی و نانی جس کا میت کے ساتھ رشتہ مرد کے واسطے ہو۔

جدہ صحیحہ کی میراث: ایک ہو یا ایک سے زیادہ بہر صورت والدہ کی عدم موجودگی میں ان کا حصہ ۱/۶ ہے۔

جدات (نانیوں اور دادیوں) کے مراتب:

پہلا درجہ نانی اور دادی سب پر مقدم ہیں یہ دونوں وارث ہیں۔

دوسرا درجہ: اس میں چار جدات آتی ہیں باپ کی نانی و دادی اور ماں کی نانی اور اس کی دادی اس درجہ میں ماں کی نانی کے علاوہ باقی تین جدات (باپ کی دادی و نانی، ماں کی دادی) وارث ہوسکتی ہیں اور ماں کی نانی جدہ فاسدہ میں داخل ہے کیونکہ اس کی نسبت میں دو ماؤں کے درمیان باپ کا واسطہ آگیا ہے۔

تیسرا درجہ: اس درجے میں آٹھ جدات آتی ہیں۔ دادے کی نانی اور دادی اور دادی کی نانی اور دادی نانے کی نانی اور دادی، نانی کی نانی اور دادی، دادے کی نانی و دادی جدات صحیحہ اور وارث ہیں۔ باقی باپ کی پڑنانی وہ بھی وارث ہے باقی نانی کی نانی اور دادی اور ماں کی پڑدادی یہ دونوں جدات فاسدہ میں داخل ہیں۔

ماں کی طرف سے جدہ میں صرف ایک وارث ہے اور ایک ہی ممکن ہے کیونکہ جدہ صحیحہ وہ کہلاتی ہے کہ دو ماؤں کے درمیان باپ کا واسطہ نہ ہو پس صرف ماں کی ماں ہی اس قاعدے کے تحت وارث ہوسکتی ہے قریبی دادی دور کی دادی اور نانی کیلئے حاجب بنتی ہے۔

البتہ باپ کی جانب سے جدات (دادیاں) ایک سے زیادہ ہوسکتی ہیں۔ مگر باپ کی موجودگی میں تمام دادیاں میراث سے محجوب ہوں گی مگر باپ کی موجودگی میں نانی محروم نہیں ہوگی

اور دادے کی موجودگی میں دو جدات ایک ماں کی طرف سے اور دوسری باپ کی ماں وارث ہوں گی۔

ذوی الارحام کا بیان:

ارحام، رحم کی جمع ہے میت کے عصبات اور ذوی الفروض کے علاوہ رشتے دار ذوی الارحام کہلاتے ہیں۔ چنانچہ عصبات اور ذوالفروض کی عدم موجودگی میں یہی ذوی الارحام وارث ہوں گے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے۔ "واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض" [الانفال:۷۵] "ان کے نزدیک تر ہیں ساتھ بعض کے اور قرابت والے بعضے" ذوی الارحام کی دس اقسام ہیں۔

(۱) بیٹیوں کی اولاد (۲) پوتیوں کی اولاد (۳) جدہ فاسدہ (۴) جدات فاسدہ (۵) حقیقی وعلاتی (باپ شریک) بہنوں کی اولاد (۶) حقیقی اور علاتی بھائیوں کی بیٹیاں (۷) اخیافی بہنوں کی اولاد (بیٹے اور بیٹیاں)۔ (۸) باپ کے اخیافی بھائی (۹) پھوپھیاں، خالائیں اور ماموں (۱۰) چچازاد بہنیں۔

ذوی الارحام میں بھی وراثت کے مستحق ہونے کا مدار میت کے زیادہ قریب ہونے کے اصول پر ہے۔ یعنی الاقرب فالاقرب یعنی قریبی رشتہ دار دور کے رشتہ دار کیلئے حاجب بنے گا۔

اقرب کی معرفت کی بحث:

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ذوی الارحام میں میت کے زیادہ قریب اس کا نانا ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر بیٹیوں کی اولاد (نواسے، نواسیاں) ہیں۔ اس کے بعد بھانجے اس کے بعد بھتیجیاں اس کے بعد پھوپھیاں پھر خالائیں اور پھر ان کی اولاد ہے۔ امام صاحبؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ میت کے سب سے زیادہ قریب نواسے اور نواسیاں ہیں۔ نواسوں کے بعد نانا ہے اس کے بعد پھر باقی ترتیب وہی ہے۔ امام صاحبؒ کے اس قول کو حضرات صاحبینؒ نے اختیار کیا ہے۔

بیٹیوں کی اولاد کے وارث بننے کی مثالیں:

مثلاً کسی کے ورثاء میں صرف ایک نواسی اور نواسی کی بیٹی موجود ہو تو سارا مال نواسی کو

ملے گا۔ کیونکہ میت کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار یہی ہے اگر سب کے سب قرابت میں برابر جمع ہو جائیں تو وہ ذی الرحم مقدم ہوگا جس کا بیٹا وارث ہو کیونکہ اصل کے اعتبار سے میت کے ساتھ اس کا رشتہ زیادہ قریب ہے۔ اگر نواسی کی بیٹی اور پوتی کی بیٹی وارث چھوڑے تو مال دوسری کیلئے ہوگا کیونکہ وہ حصے والی اولاد ہے۔

اسی طرح اگر ایک بھتیجی اور ایک بھائی کے بیٹے کی بیٹی وارث چھوڑے تو مال دوسری کیلئے ہوگا کیونکہ وہ عصبہ کی اولاد ہے لیکن اگر کوئی کسی وارث کے واسطہ سے میراث کا حقدار بن رہا ہو بنفسہ نہ بن رہا ہو تو دونوں برابر ہوں گے مثلاً نواسی کی بیٹی کی بیٹی اور پوتی کی بیٹی کی بیٹی چھوڑے تو دونوں برابر ہوں گے اور دونوں میراث کی حقدار ہوں گی۔

اگر ایسے وارث چھوڑے کہ ایک کا رشتہ زیادہ قریب ہے دوسرا وارث ایسا چھوڑا جس کا رشتہ پہلے کی بہ نسبت کچھ دور ہے مگر وہ وارث کے واسطہ سے حقدار ہے تو اس میں قریبی قرابت کا اعتبار ہوگا کیونکہ میراث پانے کی اصل علت رشتہ داری اور قربت ہے تو جو زیادہ قریب ہوگا وہی میراث حاصل کرنے میں راجح ہوگا۔

مثلاً: نواسی کی بیٹی اور ایک پوتی کی بیٹی کی بیٹی چھوڑے تو مال سارا پہلی والی کو ملے گا۔ کیونکہ دوسری کے مقابلے میں اس میت کے ساتھ رشتہ زیادہ قریب ہے اس طرح اگر خالہ اور چچا زاد بہنیں چھوڑے تو میراث کی مستحق خالہ ہوگی کیونکہ چچا زاد کے بہ نسبت میت کے ساتھ اس کا رشتہ قریب تر ہے۔

اگر قرب رشتہ اور واسطہ رشتہ میں سب برابر ہوں تو اگر آباء وامہات میں بھی متفق ہوں تو مال سب میں برابر ہوگا چاہے مذکر ہوں یا مؤنث اور اگر مذکر و مؤنث مختلط ہوں ہو تو مذکر کو دوہرا اور مؤنث کو اکہرا ملے گا۔

مثلاً ایک پوتی کی بیٹی اور دوسری پوتی کی بیٹی ورثاء ہوں تو مال ان کے درمیان برابر ہوگا اس طرح بیٹی کی بیٹی کا بیٹا اور دوسری بیٹی کی بیٹی کا بیٹا وارث ہوں تو پھر دونوں کے درمیان برابر ہوگا اور اگر ایک نواسی کی بیٹی اور دوسری نواسی کا بیٹا وارث چھوڑے تو مال کے تین حصے کریں گے ایک حصہ بیٹی اور دو حصے بیٹے کو ملیں گے۔ اگر قرابت اور واسطے تو برابر ہوں مگر آباء وامہات کے اعتبار سے مختلف ہوں تو امام محمدؒ کے نزدیک ان کے اصل رشتے کا اعتبار ہوگا۔ ترکے ان کے اصول پر تقسیم ہوگا۔ یہ قول امام اعظم کا بھی ہے۔

اولاد کی تعداد کے اعتبار سے اصول میں بھی تعداد کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہر فرع کو

اس کی اصل کی میراث دی جائے گی۔

اس کے بعد ہر فریق کو ان کے سہام تقسیم کیے جائیں گے اگر صفات کے اعتبار سے متفق ہوں تو برابر تقسیم ہوگی اور اگر صفات کے اعتبار سے مختلف ہوں یعنی کچھ مذکر اور کچھ مؤنث ہوں تو "للذکر مثل حظ الانثیین" (عورت کو اکہرا مرد کو دوہرا) کے اعتبار سے تقسیم ہوگی۔

اور حضرات امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اعتبار ابدان کا ہوگا اصول کا نہیں ہوگا۔ امام اعظمؒ کا ایک قول بھی اسی طرح کیونکہ ذوی الارحام قرابت کی وجہ سے میراث کے مستحق ہوتے ہیں جیسے عصبات میں ہر ایک میراث کے استحقاق کے اعتبار سے مستقل ہے لہٰذا عصبات کی طرح یہاں بھی ابدان کا اعتبار ہوگا۔

حضرت امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ فروع میراث کے مستحق اپنے اصول کے واسطہ سے ہوتے ہیں تو اعتبار اصول کا ہی ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک شخص کے ورثاء میں پوتی کی بیٹی اور ایک وارث پوتی تو دونوں کے نزدیک ترکہ دونوں کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار سے تقسیم ہوگا اور اگر ایک نواسی کی بیٹی اور نواسے کی بیٹی ورثاء ہوں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چونکہ دونوں بیٹیاں ہیں اس لیے باعتبار ابدان کے دو حصوں میں ترکہ تقسیم ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک ایک ان سے مذکر کی بیٹی اور دوسری مؤنث کی تو ان کے اصولوں پر تقسیم ہوگا یعنی بیٹے کی بیٹی کو دو تہائی اور بیٹی کی بیٹی کو ایک تہائی ملے گا۔ ان کے نزدیک مسئلہ مذکورہ گویا اس طرح ہوا کہ ایک نواسی اور ایک نواسا چھوڑا پھر بیٹے کی میراث اس کی بیٹی کو اور بیٹی میراث اس کی بیٹی کو ملی۔

دوسری مثال: ایک وارث نواسے کی بیٹی اور دوسرا وارث نواسی کا بیٹا چھوڑا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ترکہ ان کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک بیٹی کو دو حصے اور بیٹے کو ایک حصہ ملے گا۔ (ان کے اصول کے فرق کے اعتبار سے)۔

تیسری مثال: اگر یہ ورثاء ہوں، نواسے کی دو بیٹیاں، اور نواسی کی بیٹی تو امام محمدؒ کے نزدیک بیٹے کیلئے ۱/۵ اور دو بیٹیوں کیلئے ۴/۵ حصہ ہوگا اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دو بیٹیوں کو ۲ اور بیٹے کو پھر دو حصے۔

چوتھی مثال: اگر یہ ورثاء چھوڑے، نواسی کی بیٹی، نواسی کا بیٹا، نواسے کی بیٹی اور نواسے کا بیٹا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسئلہ واضح ہے اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک ان کے آباء کے

اعتبار سے مسئلہ کی تخریج چھ سے ہوگی شروع کے دو کیلئے دو حصے کیونکہ ان کا رشتہ میت کے ساتھ عورت کے واسطے سے ہے اور وہ ان دو حصوں کو للذکر مثل حظ الانثیین کے اعتبار سے آپس میں تقسیم کریں گے آخری دو کیلئے چار سہام (حصص) ہوں گے اور یہ بھی یہ مال آپس میں مرد کو دوہرا عورت کو اکہرا کے اعتبار سے آپس میں تقسیم کریں گے پہلے دو اور آخری کو اس طرح مال ملے گا۔ پہلے فریق میں بیٹی کو ۱/۹ بیٹے ۲/۹ اور دوسرے فریق کی بیٹی کو ۲/۹ اور بیٹے کو ۴/۹ حصص ملیں گے۔

دوسرے ذوی الارحام کے مسائل:

نانا اور اخیافی بھائی کے بیٹے کی موجودگی میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مال نانے کو ملے گا۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک اخیافی بھائی کے بیٹے کو ملے گا۔ اسی طرح نانے کے ساتھ حقیقی یا علاتی بہن کا بیٹا موجود ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک نانے کو ترجیح ہوگی میراث کا صرف وہی مستحق ہوگا۔

تنبیہ:

میت کے قریب ترین جد دوسروں کے مقابلے میں مقدم ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی نے نانا، پڑنانا اور اب کا نانا وارث چھوڑا تو مال سارا نانے کو ملے گا۔ اور اگر رشتے کے قرب کے اعتبار سے سارے مساوی ہوں تو مال کو برابر تقسیم کریں گے ایسا نہیں ہوگا کہ جو جد کسی وارث کے واسطے سے میت سے رشتہ رکھتا ہو وہ مقدم ہو کیوں کہ استحقاق میراث کا سبب قرابت ہے نہ کہ واسطہ مثلاً اگر یہ ورثاء ہوں۔ ماں کا نانا اور ماں کا دادا تو مال دونوں میں برابر تقسیم ہوگا اگر کسی میت کے باپ کے دو جد دو جہت میں موجود ہوں اسی طرح ملاں کے دو جد دونوں طرف (ماں باپ) سے موجود ہوں تو باپ کے جہت کے دادوں کو ۲/۳ اور ماں کی جہت کے دادوں کو ۱/۳ حصہ ملے گا پھر باپ کی جہت کے جدوں میں تقسیم اس طرح ہوگی جو کچھ ان کو ملا ہے اس کا ۲/۳ باپ کی جہت کے جدوں اور ۱/۳ ماں کی جہت کے دادوں کو ملے گا اس طرح ماں کی جہت کے اجداد بھی اسی طرح آپس میں تقسیم کریں گے۔

حضرت حسن زیادؒ نے امام صاحبؒ کی ایک روایت اس طرح بھی نقل کی ہے کہ جو باپ کے جہت کے اجداد کو ملا ہے وہ صرف اس کے باپ کی جہت کے جد کو ملے گا اسی طرح ماں

کی جہت کے جدات کو جو ملا ہے وہ اس کے باپ کی جہت کے جد کو ملے گا۔

بھتیجیوں کے مسائل:

اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) حقیقی بھائیوں کے بیٹیاں، اور علاتی بہنوں کی اولاد اور ان کی اولاد۔

(۲) علاتی بھائیوں کی بیٹیاں اور علاتی بہنوں کی بیٹی اور بیٹے۔

(۳) اخیافی (ماں شریک) بہن بھائیوں کی اولاد۔

اگر سب کے سب پہلی قسم کے موجود ہوں یا سارے دوسری قسم کے موجود ہوں تو ان کا حکم بیٹیوں کی اولاد (نواسوں اور نواسیوں) کی طرح ہے قرب درجہ اور نسبت کے اعتبار سے اور اگر مختلف ہوں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ابدان (افراد) کا اعتبار ہوگا جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک ابدان اور اصول کے وصف (تذکیر و تانیث) کا اعتبار ہوگا اور اگر سارے تیسری قسم کے ذوی الارحام ہوں تو مال ان کے درمیان برابر تقسیم ہوں گے۔ مذکر و مؤنث کے اعتبار سے کمی زیادتی نہیں ہوگی کیونکہ ان کے اصول (اخیافی بہن بھائی) میں بھی تقسیم کے اعتبار سے کمی بیشی نہیں ہوتی یہ مال آپس میں برابر تقسیم کریں گے۔

اگر مختلف جمع ہو جائیں یعنی ایک حقیقی بہن کی بیٹی ایک علاتی بہن کی بیٹی ایک علاتی بہن کی بیٹی اور ایک اخیافی بہن کی بیٹی وارث چھوڑے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حقیقی کی بیٹی مقدم پھر علاتی پھر اخیافی کا درجہ ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک مال ان کے اصول پر تقسیم ہوگا پھر اصول سے ان کے فروع کی طرف منتقل ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے ایک حقیقی بہن کی بیٹی، ایک علاتی کی بیٹی اور ایک اخیافی کی بیٹی چھوڑی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سارا مال حقیقی بہن کی بیٹی کو ملے گا اور امام محمدؒ کے نزدیک ۳/۵ پہلی کو ۱/۵ دوسری اور ۱/۵ تیسری کو ملے گا ان کے اصول کے حصص کے اعتبار سے۔

مثال نمبر ۲: ایک حقیقی بھائی کی بیٹی، ایک علاتی کی اور ایک اخیافی کی بیٹی چھوڑی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سارا مال حقیقی بھائی کی بیٹی کو ملے گا جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک اخیافی بھائی کی بیٹی کو ۱/۶ اور باقی حقیقی بھائی کی بیٹی کو ملے گا علاتی کی بیٹی کو کچھ نہیں ملے گا۔

مثال نمبر ۳: ایک علاتی کی بیٹی، ایک اخیافی بہن کی بیٹی چھوڑی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سارا مال علاتی کی بیٹی کو ملے گا۔ دوسری محجوب ہوگی جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک علاتی کی بیٹی

کو ۳/۲ اور اخیافی کی بیٹی کو ۱/۴ ملے گا ان کے اصول کے اعتبار سے۔

مثال نمبر ۴: حقیقی بہن کے دو بیٹے، اخیافی بہن کی بیٹی چھوڑی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سارا مال دو بیٹیوں کو ملے گا اور امام محمدؒ کے نزدیک مال پانچ پر تقسیم ہوگا حقیقی کے بیٹوں کو دو دو اور اخیافی کی بیٹی کو ایک ملے گا اور اگر سب قرب درجہ میں برابر ہوں تو وارث کی اولاد مقدم ہوگی۔ مثلاً اخیافی بھائی کے بیٹے کا بیٹا، حقیقی بھائی کی بیٹی کا بیٹا، علاتی بھائی کے بیٹے کی بیٹی چھوڑی تو اس صورت میں سارا مال علاتی بھائی کے بیٹے کی بیٹی کو ملے گا کیونکہ اس کی نسبت میت کے ساتھ وارث کے واسطے سے ہے۔

مثال نمبر ۶: ایک بھانجا اور ایک بھتیجی وارث چھوڑے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول پر تقسیم ہوگا اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے اصل کے اعتبار سے تقسیم ہوگا یعنی ۲/۳ بھتیجی کو اور ۱/۳ بھانجے کو ملے گا۔

پھوپھی اور خالہ کی میراث:

اس میں بھی اقرب ابعد کیلئے حاجب بنے گی چنانچہ دادے کی پھوپھی کے مقابلے میں باپ کی پھوپھی مقدم ہوگی اگر سب ایک درجہ کے جمع ہو جائیں تو میت کی حقیقی پھوپھی علاتی واخیافی کے مقابلے میں مقدم ہوگی اور علاتی، اخیافی سے مقدم ہوگی خالاؤں اور ماموؤں کی ترتیب بھی ترتیب مذکور [حقیقی میدم، پھر علاتی پھر اخیافی) کی طرح ہے۔ اگر میت کے ساتھ قرابت داری میں تمام برابر جمع ہو جائیں اور وہ صرف ایک طبقے کے ہوں تو یعنی ماموں، خالہ وغیرہ تو للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول پر تقسیم ترکہ ہوگی اور اگر خالہ ماموں اور پھوپھی وغیرہ جمع ہوں تو پھوپھی کو ۲/۳ اور خالہ وغیرہ کو ۱/۳ حصہ ملے گا۔

مثلاً پھوپھی اور دس ماموں وارث ہوں تو پھوپھی کو ۲/۳ اور ۱۰ ماموؤں کو ۱/۳ حصہ ملے گا اس طرح پھوپھی کے ساتھ صرف ایک ماموں یا صرف خالہ ہو تب بھی تقسیم کا طریقہ کار اس طرح ہوگا یعنی پھوپھی کو ۲/۳ اور خالہ کو ۱/۳ ملے گا قیاس کا تقاضا ہے کہ ماموں یا خالہ کو پھوپھی کی موجودگی میں کچھ نہیں ملنا چاہیے کیونکہ میراث ملنے کا سبب قرابت ہے اور قرابت میں باپ قوی تر ہے قوی تر رشتہ کی موجودگی میں دوسرے محجوب ہو جاتے ہیں جس طرح ماں کی پھوپھی اور باپ کی پھوپھی وارث ہوں تو ماں باپ کی پھوپھی لیتی ہے دوسرے کی محروم ہو جاتی ہے لیکن یہاں قیاس کو حضرات صحابہ کے اجماع کی وجہ سے ترک کیا گیا ہے۔ حضرات صحابہ کا اس

پر اجماع ہے کہ پھوپھی کو ۲/۳ اور خالہ کو ۱/۳ ملے گا۔ اجماع کی وجہ یہ ہے کہ پھوپھی باپ کی جگہ جبکہ خالہ ماں کی طرح ہے گویا اس نے ماں باپ وارث چھوڑے تو اس صورت میں تقسیم میں باپ کو ۲/۳ اور ماں کو ۱/۳ ملتا ہے البتہ باپ کا رشتہ قوی ہے۔ لہٰذا باپ کی پھوپھی ماں کی پھوپھی سے قوی تر رشتہ رکھی ہے لہٰذا اس کی موجودگی میں دوسری محجوب ہوگی۔

دو رشتے والا ایک رشتے والے کیلئے مانع نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ نے مطلقاً پھوپھی کیلئے ۲/۳ اور خالہ کیلئے ۱/۳ مقرر فرماتے ہیں تو اجماع اس اطلاق پر برقرار رہے گا۔

مثلاً اگر باپ کی حقیقی بہن اور ماں کی علاتی بہن (خالہ) وارث چھوڑے تو سارا مال دوہری رشتے کی وجہ سے پھوپھی کو نہیں ملے گا بلکہ اس کو صرف وہی ۲/۳ ہی ملے گا۔ ۱/۳ ماں کی علاتی بہن کو ملے گا۔ البتہ امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت اس طرح موجود ہے کہ اس صورت میں سارا مال پھوپھی کو ملے گا۔

اسی طرح اگر ماں کی حقیقی بہن اور باپ کی علاتی بہن وارث چھوڑے تب بھی علاتی پھوپھی کو ۲/۳ اور حقیقی خالہ کو ۱/۳ ہی ملے گا جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں سارا مال حقیقی خالہ کو ملے گا۔ اور اگر دو مختلف الجنس ماں کی طرف سے یعنی (ماموں، خالہ، پھوپھی) اور دو مختلف الجنس باپ کی طرف سے جمع ہو جائیں تو ۲/۳ باپ کی قرابت والوں کو اور ۱/۳ ماں کی قرابت والوں کو ملے گا۔

مثلاً اگر باپ کی خالہ اور پھوپھی ماں کی خالہ اور پھوپھی وارث چھوڑے تو اس کا ترکہ ۹ حصوں میں تقسیم ہوگا اس کا دو ثلث ۲/۳ یعنی چھ باپ کی قرابت والوں کو اور ۱/۳ ماں کے ماموں خالہ اور پھوپھی کو ملے گا۔ پھر باپ کی خالہ اور پھوپھی ۶/۹ کو آپس میں اس طرح تقسیم کریں گی کہ ۶/۹ کا دو ثلث باپ کی پھوپھی کو ایک ثلث ۱/۳ باپ کی خالہ کو ملے گا۔ اور اس کا ۳/۹ کو ماں کی پھوپھی اور خالہ اس طرح تقسیم کریں گی کہ اس کا ۲/۳ پھوپھی اور ۱/۳ خالہ لے گی۔

اگر تین متفرق خالائیں ایک حقیقی ایک علاتی اور ایک اخیافی چھوڑی تو بالاتفاق سارا مال ماں کی حقیقی بہن کو ملے گا باقیوں کو کچھ نہیں ملے گا بالکل یہی صورت تقسیم متفرق ماموؤں کی ہوگی۔

اگر ایک خالہ اور ایک پھوپھی زاد بھائی وارث چھوڑے تو مال سارا خالہ کو ملے گا کیونکہ وہ پھوپھی زاد کے مقابلے میں میت کی قریب تر رشتہ دار ہے۔

اور اگر ماموں کی بیٹی اور خالہ کا بیٹا وارث چھوڑا تو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق

مال ان کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول کے مطابق تقسیم ہوگا اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق خالہ زاد بھائی کو ۱/۳ اور ماموں زاد بہن کو ۲/۳ حصہ ملے گا کیونکہ ان کے نزدیک ان میں سے ہر ایک اپنے اصل کی میراث لے گا۔

اگر ان میں سے دو وارث ایک ہی درجہ کے جمع ہو جائیں تو جو وارث کے واسطے سے میت کے ساتھ نسبت رکھے وہ مقدم ہوگا۔

مثلاً ایک شخص نے پھوپھی زاد بھائی اور چچا زاد بہن چھوڑے تو سارا مال چچا زاد بہن کو ملے گا۔

حصص نکالنے کا طریقہ:

قرآن کریم میں جو حصص مقرر ہیں وہ کل چھ ہیں: (۱) نصف ۱/۲۔ (۲) ربع ۱/۴۔ (۳) ثمن ۱/۸ ان تین کو نوع اول کہا جاتا ہے۔ (۴) ثلثان ۲/۳۔ (۵) ثلث ۱/۳۔ (۶) سدس ان کو نوع ثانی کا نام دیا گیا ہے۔

چنانچہ اگر مسئلہ میں ان میں سے صرف ایک حصہ مقرر موجود ہو ساتھ مسئلہ کی تخریج اس سہم (حصہ) کے ہم نام عدد سے ہوگی مثلاً صرف نصف آ جائے تو مسئلہ دو سے حل ہوگا ربع ۱/۴ آ جائے تو چار سے ثمن ۱/۸ آٹھ سے۔ ثلث ۱/۳ اور ثلثان ۲/۳ کے عدد سے، اور سدس ۱/۶ چھ سے حل ہوگا۔ اور اگر مختلف آ جائیں اور صرف ایک نوع کے آ جائیں تو اگر نوع اول کے سارے آ جائیں تو آٹھ اور چار سے ہوگا اگر نوع ثانی کے سارے آ جائیں تو تین یا چھ سے ہوگا۔ اور اگر کچھ نوع اول اور کچھ نوع ثانی کے جمع ہو جائیں تو قاعدہ یہ ہے کہ اگر نوع اول کا نصف نوع ثانی کے کل یا بعض کے ساتھ مل جائے تو مسئلہ چھ سے حل ہوگا اور اگر نوع اول کا ربع ۱/۴ نوع ثانی کے کل یا بعض کے ساتھ مل جائے تو سارے حصص بارہ سے نکل آئیں گے اور اگر نوع اول کا ثمن ۱/۸ نوع ثانی کے کل یا بعض کے سب جمع ہو جائیں تو سارے حصص چوبیس کے عدد سے نکلیں گے۔ اور اگر ملنے والا حصہ اس کے مستحق ورثاء پر برابر تقسیم نہ ہو یعنی صحیح نہ ہو بلکہ کسر واقع ہو تو تمام کو بلا کسر صحیح حصہ دینے کیلئے کم سے کم عدد تلاش کریں گے جس سے سب کے حصص ان کو بلا کسر صحیح تقسیم ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ان کو ملے ہوئے حصے کا عدد اور ان کے افراد کے عدد میں تباین ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ عدد سہام کے مطابق اصل مسئلہ یا عول ہوگا اور اگر توافق کی نسبت ہو تو قاعدہ ہے عدد کے مطابق تقسیم ہوگی۔

پہلی کی مثال: بیوی، دو بھائی ورثاء ہوں تو بیوی کا حصہ ربع ۱/۴ ہے اور باقی بھائیوں کا ہے تو حصص مقررہ میں سے صرف ایک حصہ موجود ہے اور وہ ربع ۱/۴ ہے تو ربع نکلتا ہے چار سے تو مسئلہ حل ہوگا چار سے۔ جیسے:

مسئلہ ۴×۲ = ۸

دو بھائی	بیوی
۳	۱۲

دیکھئے دو بھائیوں کو تین حصے ملے جو دو پھر برابر تقسیم نہیں ہوتے تو مذکورہ قاعدے کے مطابق دیکھا تو تین اور دو تین تباین ہے تو عدد ورثاء دو کو اصل مسئلہ ۴ کے ساتھ ضرب دیا تو آٹھ آ گئے تو اب آٹھ سے دونوں فریقوں کو حصص دیں گے آٹھ کا ۱/۴ دو ہے وہ بیوی کو ملا باقی چھ حصے رہ گئے وہ دو بھائی آپس میں تقسیم کریں گے۔

دوسرے (توافق) کی مثال، یہ ورثاء ہوں بیوی، چھ بہنیں، تو بیوی کا ۱/۴ جو چار سے نکلتا ہے۔

مسئلہ ۴×۲ = ۸

چھ بہنیں	بیوی
۳	1

تین چھ پر بلا کسر تقسیم نہیں ہوتا تو تصحیح کی ضرورت ہوگی تو تصحیح کے اصول کے مطابق چھ کے وفق ۲ کو اصل مسئلہ چار کے ساتھ ضرب دینے سے حاصل ضرب آٹھ آیا تو آٹھ کا ۱/۴ دو ہے جو بیوی کا حصہ ہے باقی رہ گئے چھ حصے، جو چھ بہنوں پر بلا کسر تقسیم ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال:

مسئلہ ۴×۵ = ۲۰

تین بہنیں	چھ بھائی	بیوی
۳/۱۵	۳/۱۵	/۵

تفصیل اس کی یہ ہے:

بیوی کا حصہ ۱/۴ ہے مسئلہ چار سے حل ہوگا۔ بیوی کو چار میں سے ایک حصہ ۱/۴ دے دیا، تو باقی رہ گئے تین حصے جو چھ بھائیوں اور تین بہنوں کے ہیں مگر للذکر مثل حظ الانثیین کے تحت ایک بھائی دو بہنوں کے برابر ہے۔ اسی طرح پندرہ بہنوں کے برابر ہوتے۔ ان کا حصہ

ہے تین جو پندرہ پر بلا کسر تقسیم نہیں ہو سکتا۔ تو تصحیح کے اصولوں کے مطابق دیکھا تو تین اور پندرہ کے درمیان توافق بالثلث ہے تو عدد روس پندرہ کا وفق ہے پانچ، تو پانچ کو اصل مسئلہ ۴ کے ساتھ ضرب دینے سے حاصل ضرب بیس آیا۔ تو بیس کا ۱/۴ پانچ ہے تو باقی رہ گئے پندرہ تو پندرہ پر بلا کسر صحیح تقسیم ہوگا۔

سابقہ مثالیں صرف ایک جنس میں کسر واقع ہونے کی تھیں اور اگر ایک سے زیادہ فریقوں میں کسر واقع ہو تو ایک فریق کے عدد کو دوسرے فریق کے عدد کے ساتھ ضرب دیں گے حاصل ضرب کو اگلے عدد کے ساتھ پھر اگلے عدد کے ساتھ پھر اصل مسئلہ کے ساتھ ضرب دینے سے صحیح عدد آئے گا جو تمام پر بلا کسر تقسیم ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک شخص نے تین بیویاں، دو بھائی چھوڑے تو تین بیویوں کا حصہ ہے ۱/۴ باقی تین چوتھائی دو بھائیوں کو ملا مگر دونوں فریقوں کے حصے ان پر بلا کسر تقسیم نہیں ہوتے تو تین کے عدد کو دو کے ساتھ ضرب دینے سے حاصل ضرب چھ آیا۔ اور چھ کو اصل مسئلہ چار کے ساتھ ضرب دی۔ حاصل ضرب چوبیس آیا چوبیس سے دونوں فریقوں کے حصے بلا کسر نکل آئیں گے اس چوبیس کا ۱/۴ چھ ہے جو تین بیویوں کو ملے گا جو بلا کسر دو دو ان کو ملے گا۔ باقی اٹھارہ حصے دو بھائیوں کو ملیں گے اسی طرح حصہ فی بیوی ۲/۲۴ اور فی بھائی ۹/۲۴ ہوگا۔ اگر بعض اعداد روس بعض میں داخل ہوں تو آپس میں ضرب دینے کی ضرورت نہیں ہے مثلاً دو بیویاں اور دو بھائی ہوں تو مسئلہ چار سے ہوگا چار کا ربع ایک ہے جو دو پر بلا کسر تقسیم نہیں ہوسکتا اور باقی تین پھر دو بھائیوں پر بلا کسر نہیں تقسیم ہوسکتا اور باقی تین پھر دو بھائیوں پر بلا کسر نہیں تقسیم ہوتا لیکن عدد روس دونوں جگہ دو ہی ہیں اس لیے ان کو آپس میں ضرب نہیں دیا جائے گا بلکہ کسی بھی دو کو اصل مسئلہ کے ساتھ ضرب دیں گے حاصل ضرب آٹھ آئے گا جس سے حصص دینے سے دونوں فریق پر بلا کسر تقسیم ہوگا اور اگر اعداد روس (افراد ورثاء) کا آپس میں تداخل ہو تو بڑے عدد کو اس مسئلے کے ساتھ ضرب دیں گے یہاں بھی آپس میں اعداد کو ضرب دینے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ ۴

۲ حقیقی بھائی	۴ بیویاں
۳	۱

دیکھئے یہاں بھی کسر واقع ہونے کے اعتبار سے مذکورہ مسئلہ کی طرح ہے مگر چار اور دو میں تداخل ہے (اقل عدد اکثر کو فنا کر دے) تو چار کو اصل مسئلہ چار کے ساتھ ضرب دیں گے تو

سولہ آئے گا تو سولہ کا ربع چار ہے جو چار بیویوں کو ملے گا تو ہر بیوی کو ایک حصہ آئے گا اور بارہ حصے دو بھائیوں کو ملیں گے فی بھائی کے حصے میں چھ آئیں گی۔

اور اگر کسر واقع ہونے والے عددروں کے آپس میں توافق ہو (یعنی کوئی تیسرا عدد دونوں کو فنا کرتا ہو) تو ایک عدد کے وفق کو دوسرے کے کل میں ضرب دیں گے پھر حاصل ضرب کو اصل مسئلہ کے ساتھ ضرب دیں گے۔ جیسے

مسئلہ ۴×۱۲=۴۸

۴ بیویاں	۱ حقیقی بہن	۴ چچے
ربع	نصف	
۱/۱۲	۲/۲۴	۱/۱۲

دیکھئے اس میں چار بیویوں کو ایک حصہ ملا، جو ان پر بلا کسر تقسیم نہیں ہوتا اور چھ بچوں کو بھی ایک حصہ ملا جو تقسیم نہیں لیکن چار اور چھ میں توافق بالنصف ہے ایک وفق کو دوسرے کے کل کے ساتھ ضرب دی چار کے وفق ۲ کو چھ کے ساتھ یا چھ کے وفق تین کو چار کے ضرب دی تو ۱۲ حاصل ضرب آیا تو ۱۲×۴=۴۸ ہو تو بیوی کا حصہ ۴۸/۱۲ بہن کو ۴۸/۲۴ اور اعمام کو ۴۸/۱۲ ملا۔

تقسیم ترکہ:

اب تک جو بحث تھی اس میں صرف حصص کی تقسیم کا طریقہ بیان کیا گیا تھا اگر آپ ترکہ کو ان حصص کے بموجب تقسیم کرنا چاہیں تو قاعدہ یہ ہے کہ حصہ × ترکہ % تصحیح مثلاً چار بیویوں کو ترکہ سے حصہ: ۱۲× ترکہ % ۴۸

بہن کا حصہ: ۲۴×۱۰۰% ۴۸

چچا کا حصہ: ۱۲×۱۰۰% ۴۸

المناسخة:

ترکہ کی تقسیم سے پہلے ایک وارث کا انتقال ہوا اور ابھی اس کی میراث تقسیم نہیں ہوئی تھی کہ کسی دوسرے وارث کا انتقال ہو جائے اس کو مناسخہ کہتے ہیں۔

اگر میت اول سے میت ثانی کو ملنے والا حصہ اس کے ورثاء پر بلا کسر تقسیم ہوتا ہو تو میت ثانی مسئلہ کی تصحیح ہے اور کوئی ضرب و تقسیم کا عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک شخص نے

بیٹا اور یہی بیٹی وارث چھوڑے میراث کی تقسیم سے قبل بیٹے کا بھی انتقال ہوگیا اور اس نے ورثاء میں دو بیٹے چھوڑے تو میت اول کا مسئلہ تین سے حل ہوگا۔ ۲/۳ بیٹے کو ۱/۳ بیٹی کو ملے گا میت ثانی کو جو حصہ ملا وہ اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا جو ۲ میں دو بیٹیوں کو ملے گا۔ گویا دونوں مسئلوں کی تصحیح تین سے ہوگی۔

اور اگر میت ثانی کو پہنچنے والا حصہ اس کے ورثاء میں برابر تقسیم نہیں ہوسکتا تو میت ثانی کے مسئلے کو سابقہ مسئلہ حل کرنے کے اصولوں کے مطابق حل کیا جائے گا۔ پھر میت ثانی کے متعلقہ اور میت اول کے مسئلہ کے ملنے والے اعداد کے درمیان نسبت دیکھی جائے گی اگر دونوں عددوں میں تباین ہو تو عدد مسئلہ ثانی کو اول کے مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا حاصل ضرب دونوں مسئلوں کی تصحیح ہوگی۔ اگر دونوں کے اعداد میں موافقت ہو مسئلہ ثانیہ کے وفق کو میت اول کے مسئلے کے ساتھ ضرب دیا جائے گا حاصل ضرب دونوں مسئلوں کی تصحیح ہوگی۔

مثلاً ایک کا انتقال ہوا ورثاء میں شوہر، بیٹا، ماں، بیٹا چھوڑے اور تقسیم میراث عورت سے قبل بیٹے کا بھی انتقال ہوگیا اس نے ورثاء میں بیٹا، باپ اور نانی چھوڑی تو میت اول کا مسئلہ ۱۲ سے ہوگا۔ ۳/۱۲ شوہر کو ۲/۱۲ ماں باپ کو ۵/۱۲ بیٹے کو ملا اور میت ثانی کا مسئلہ چھ سے حل ہوگا۔ اور میت اول سے ملنے والے حصے ۵/۱۲ ہیں تو یہ چھ پر برابر تقسیم نہیں ہوتا۔ تو ۵ اور ۶ کے درمیان تباین ہے تو ۶ کے ساتھ ضرب دیں گے۔ ۱۲x۶=۷۲ ہے اور ۷۲ سے دونوں مسئلوں کے حصص ان کے افراد پر برابر بلاکسر تقسیم ہوں گے تو میت اول کے ورثاء شوہر کو ۱۸/۷۲، ماں باپ کو ۲۴/۷۲ اور بیٹے کو ۳۰/۸۲ ملے گا اور میت ثانی کے ورثاء کو ۳۰/۷۲ میں سے بیٹے کو ۱۵/۷۲ باپ کو ۱۰/۷۲، نانی کو ۳/۷۲ یہ میت ثانی کے مسئلے اور میت اول سے ملنے والے حصوں کے درمیان تباین کی مثال ہے۔

توافق کی مثال:

ایک شخص کا انتقال ہوا ورثاء میں بیوی، ماں، اخیافی بہن اور چچا چھوڑے، تقسیم میراث سے قبل چچا کا انتقال ہوا اور ورثاء میں ایک بیٹا اور بیٹی چھوڑے میت اول کا مسئلہ ۱۲ سے ہوگا اور میت ثانی کا مسئلہ تین سے حل ہوگا اور میت اول سے اس کو ملنے والے حصے بھی تین ہیں تو دونوں مسئلے ۱۲ سے حل ہوئے۔

ایک اور مثال زوجہ، تین بہنیں، حقیقی، علاتی، اخیافی اور چچا وارث چھوڑے پر حقیقی بہن

تقسیم میراث سے قبل انہی ورثاء کو سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی زوجہ تو زوجہ کو ۱/۴ حقیقی بہن کو ۱/۲ اخیافی کو ۱/۶ ملے گا۔

مسئلہ کی تخریج ۱۲ سے ہوگی جس میں زوجہ کو تین، علاتی کو دو اخیافی کو دو حقیقی کو چھ حصے ملے، پھر حقیقی کے یہ چھ حصے، علاتی، اخیافی اور چچا پر تقسیم ہوں گے تو علاتی کو ۳/۶ اخیافی کو ۱/۶ اور چچا کو ۲/۶ ملے گا۔

دور صحابہ میں پیش آمدہ مسائل' ان کا حل اور ان کے القاب:

(۱) مسئلہ مشترکہ یا مسئلہ حماریہ: ورثاء شوہر، ماں دو اخیافی بھائی اور حقیقی بھائی۔ تو شوہر کو نصف، ماں کو سدس ۱/۶ اخیافیوں کو ۱/۳ اور حقیقی محجوب، یہ قول حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ ابن عباسؓ کا ہے۔ حضرات حنفیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے جبکہ حضرت ابن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ نے فرمایا کہ حقیقی ۱/۳ میں اخیافیوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں اسی قول کو اختیار فرمایا تھا۔ پہلے تو انہوں نے وہی فیصلہ کیا تھا جو پہلے ذکر ہوا بعد میں اسی طرح کا واقعہ پیش ہوا تو اس طرح فیصلے دینے لگے تو حقیقی بھائیوں میں سے کسی ایک نے کہا: امیر المومنین! کیا ہمارے والد گدھے تھے؟ کیا ہم ایک والدہ سے پیدا نہیں ہوئے؟ حضرت عمر نے ایک ثلث میں ان کو بھی شریک کیا اور فرمایا: پہلے ہمارا وہ فیصلہ تھا اب یہ ہے اس مسئلے کو مشترکہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے ایک ثلث میں اخیافیوں کے ساتھ حقیقیوں کو بھی شریک کیا۔ اور اس مسئلے کو مسئلہ حماریہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ کیا ہمارا والد حمار تھا؟ لیکن صحیح ہمارا مذہب ہے کیونکہ وہ موافق حدیث ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، "الحقوا المال بالفرائض فما ابقت الفرائض مخصوصا فلا ولی رجل ذکر"[۱]

یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ اخیافی مقدم ہو اور ان کے ساتھ حقیقیوں کو شریک کرنا نص کی مخالفت ہے۔ کیونکہ کے اخیافی بنص قرآنی اصحاب الفرائض میں سے ہیں اور حقیقی عصبات میں سے ہیں۔

مسئلہ الخرقاء عثمانیہ:

ورثاء، ماں، دادا، بہن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ۱/۳ ماں کو اور باقی دادے کو ملے گا اور

۱۔ (المستدرک: ۳۳۸/۴)

حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا کہ ۱/۳ ماں کو ملے گا۔ باقی دادے اور بہن کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین تقسیم ہوگا۔

اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ۱/۳ ماں کو ۱/۲ بہن کو اور باقی دادے کو ملے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں فرمایا کہ بہن کو ۱/۲ باقی دادے اور ماں کے درمیان تقسیم ہوگا۔ ان سے ایک روایت اس طرح بھی ہے کہ بہن کو ۱/۲ ماں کو باقی کا ۱/۳ اور باقی دادے کو ملے گا اور حضرت عمر کا یہی قول ہے اور حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ماں کیلئے ۱/۳ اور باقی بہن اور دادے کے درمیان نصف نصف تقسیم کریں گے۔ اس مسئلے کو مسئلہ خرقاء کا نام اس لیے دیا گیا کہ حضرت عثمان نے اجماع کے خلاف فیصلہ کیا خرقاء خلاف کو کہتے ہیں۔ اس کو عثمانیہ بھی کہا جاتا ہے۔

مسئلہ مروانیہ:

ایک عورت چھ بہنیں، دو حقیقی، دو علاتی دو اخیافی اور شوہر کو چھوڑ کر مری تو شوہر کو ۱/۲ دو حقیقیوں کو ۲/۳ دو اخیافیوں کو ۱/۳ اور علاتی بہن ساقط ہوں گی۔

اصل مسئلہ چھ سے ہو کر نو تک عول ہوگا۔ اس طرح ۱/۲ + ۲/۳ + ۱/۳ = ۳/۶ + ۴/۶ + ۲/۶ = ۹/۶۔ تو شوہر کا حصہ: ۳/۹، حقیقیوں کا ۴/۹، اخیافیوں کا حصہ ۲/۹ ہے اس مسئلہ کو مروانیہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مروان بن حکم کے زمانے میں پیش آیا تھا اور اس کو مشہور ہونے کی وجہ سے غرا (واضح) کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

مسئلہ دیناریۃ:

ورثاء میں بیوی، دادی، دو بیٹیاں، ۱۲ اور ایک حقیقی بہن ترکہ تھا چھ سو دینار۔ تو بیوی کو ملا ۱/۸، دادی کو ۱/۶، بیٹیوں کو ۲/۳ باقی بہن بھائیوں کو اس طرح: ۱/۸ + ۱/۶ + ۲/۳ = ۳/۲۴ + ۴/۲۴ + ۱۶/۲۴ = ۲۳/۲۴، باقی ۱/۲۴ تو ۳×۶۰۰/۲۴ = ۷۵۔ بیوی کا حصہ، ۴×۶۰۰/۲۴ = ۱۰۰ دینار دادی کا حصہ ۱۶×۶۰۰/۲۴ = ۴۰۰ دینار بیٹیوں کا حصہ، ۱×۶۰۰/۲۴ = ۲۵۔ بہن بھائیوں کا حصہ نکلا تو بہن کو ایک دینار اور فی دو بھائی دو دینار ملے۔ ترکہ میں دینار چھوڑنے کی بناء پر اس مسئلہ کو دیناریہ کہا جاتا ہے اس کو مسئلہ داؤدیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ داؤد طائی سے پوچھا گیا اور انہوں نے اس طرح حل کر کے دیا تھا لیکن تقسیم کے بعد بہن نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ چھ سو دینار انہوں نے ترکہ چھوڑا مگر مجھے اس میں

سے صرف ایک دینار بطور میراث دیا گیا۔ امام صاحبؒ نے پوچھا ترکہ تقسیم کس نے کیا؟ اس نے کہا آپ کے شاگرد داؤد طائی نے، امام صاحب نے فرمایا وہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا کرتے پھر عورت سے پوچھا کیا تمہارے بھائی نے ورثاء میں بیوی چھوڑی ہے؟ کہنے لگی، ہاں فرمایا دو بیٹیاں بھی؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا فرمایا: کیا اس نے دادی بھی وارث میں چھوڑی؟ کہنے لگی کہ جی ہاں فرمایا کہ تمہارے ساتھ بارہ بھائی بھی وارث موجود ہیں؟ کہنے لگی کہ اں موجود ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا: جب تو واقعۃً تمہارا حصہ اس میں سے ایک دینار ہی ہے۔

المامونیہ:

ورثاء یہ ہیں: ماں، باپ، دو بیٹیاں اور تقسیم میراث سے قبل ایک بیٹی کا انتقال ہوا ورثاء میں اوپر مذکور افراد ہی چھوڑے۔

خلیفہ مامون الرشید نے ایک مرتبہ بصرہ کے عہدہ قضاء کیلئے اہلیت کا حامل شخص مقرر کرنا چاہا۔ مشیروں نے یحییٰ بن اکثم کا نام پیش کیا۔ مامون نے انہیں دیکھا اور ان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ان کو اس عہدہ کیلئے کمزور خیال کیا امتحان کے طور پر ان سے مذکورہ مسئلہ دریافت کیا۔ یحییٰ بن اکثمؒ نے کہا: امیر المومنین یہ تو بتا دیجئے کہ میت اول مرد ہے یا عورت؟ یہ سن کر مامون کو یقین ہو گیا کہ یہ مسائل سے واقف ہے تو ان کو عہدہ قضاء پر فائز کیا اس لیے اس مسئلے کو مسئلہ مامونیہ کہا جاتا ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں میت اول کے مرد اور عورت ہونے کے اعتبار سے تقسیم میراث مختلف ہوگی، اگر میت اول مرد ہو تو مسئلہ اولی (میت اول کے ورثاء پر تقسیم میراث) چھ سے ہوگا جس میں سے بیٹیوں کو ۲/۳ ماں، کو ۱/۶ اور باپ کو ۱/۶ ملے گا۔

ایک بچی انتقال کر جائے اور ورثاء میں ایک بہن جد اور جدہ چھوڑ جائے یعنی دادا اور دادی چھوڑے تو اس کے مال کا ۱/۶ دادی کو اور باقی سب دادے کو ملے گا اور بہن محروم ہوگی یہ حضرت ابوبکر کے قول کے مطابق ہے اور حضرت زید بن ثابت کے قول کے بموجب دادی کو ۱/۶ اور باقی ۵/۶ دادے اور بہن آپس میں سابقہ اصولوں کے مطابق تقسیم کریں گے۔ لیکن اگر میت اول عورت ہو اور اس کے ورثہ میں سے ایک بیٹی کا قبل تقسیم میراث انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء ہوں گے ایک بہن نانا، اور نانی، تو بہن کو ۱/۲ اور نانی کو ذوی الفروض ہونے کی وجہ سے ۱/۶ چھ ملے گا اور نانا ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے ذوی الفروض کی وجہ سے

محروم ہوگا۔ اور باقی ذوی الفروض کو ان کے حصص کے تناسب سے دوبارہ لوٹا دیا جائے گا۔ میت اول کے مذکر ہونے کی صورت میں حضرت ابوبکر کے قول کے مطابق مسئلہ اس طرح ہوگا۔ ۲/۳ + ۱/۶ ۱۲/۲ اصل مسئلہ چھ سے ہوگا اور میت ثانی کو اگر ۱/۳ مل گیا اس کو ہم اس کے دادے اور دادی پر تقسیم کریں تو چھ کو چھ کے ساتھ ضرب دیں گے حاصل ضرب چھتیں آئے گا اور یہ چھتیں دونوں مسئلوں کی تصحیح ہوگی جس میں میت اول کی دو بیٹیوں کو ۲۴/۳۶ ماں باپ کو ۱۲/۳۶ ملے گا۔

اور متوفاۃ بیٹی کا حصہ ۱۲/۳۶ ہے اس میں اس کی دادی کو ۱۲ کا ۱/۶ جو ہے ملے گا اور باقی دادا لے گا۔ بہن محروم ہوگی اور دادی کو ۲/۳۶، ۱۰/۳۶ تو دادے کو کل ۲۲/۳۶ اور میت اول کے عورت ہونے کی صورت میں تقسیم کا طریقہ کار اس طرح ہوگا۔ ۲/۳ + ۱/۶۔ یہ مسئلہ اول چھ سے ہوگا اور متوفاۃ بیٹی کا حصہ ۱/۳ موجود ہے تو اس میں سے اس کی نانی کو ۱/۶ اور بہن کو ۱/۲ یعنی ۱۲/۳۶ اور باقی ۴/۳۶ جو ان کو دوبارہ بطور رد کے دیے جائیں گے۔ اور نانا محروم ہوگا تو اس طرح بطور رد کے نانی کو ۱/۳۶ اور بہن کو ۲/۳۶ ملے گا۔ تو جدہ نانی کو کل حاصل شدہ حصے ۶/۳۶ + ۲/۳۶ + ۱/۳۶ = ۹/۳۶ ہوں گے۔

اور بہن کو کل ترکہ سے ملنے والے حصوں کا مجموعہ اس طرح ہوگا۔

۱۲/۳۶ + ۶/۳۶ + ۲/۳۶ = ۲۰/۳۶۔

الحمد للہ "الفقہ الحنفي والدلۃ" کا پہلا سلیس ترجمہ مع تحقیق

۲۳، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ / ۹ جون ۲۰۰۷ء بروز ہفتہ کو مکمل ہوا۔

از ارکان لجنۃ المصنفین لاہور